سنگِ زیست
(افسانے)
سائرہ ہاشمی

سائرہ ہاشمی

زیر ملکیت
انیس الحسن شاہ

دستاویز مطبوعات، لاہور

دستاویز کی دستاویز کتابیں

اهتمام و اشاعت

اشرف سلیم

قانونی مشیر

سلمان حنیف راجپوت

(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

نام کتاب: سنگِ زیست

مصنفہ: سائرہ ہاشمی

اشاعت: ۲۰۱۹ء

مشینی کتابت: عدنان اشرف

سرورق: حمدان

مطبع: حاجی مُنیر پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت: -/550روپے

دستاویز مطبوعات

بلاک نمبر#7، آفس نمبر#6، سیکنڈ فلور، میاں چیمبر، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

فون: 00 92 3334344716 - 00 92 423 6280034

ای میل:saleemashraf86@yahoo.com

زیر ملکیت
انیس الحسن شاہ

محمد یعقوب خاں
کے
نام
جو صحیح معنوں میں میرے رفیق زندگی ہیں

سنگِ زیست

اس کی تقدیر کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ اور ان بند آنکھوں کے پیچھے اُس نے اُن رنگوں اور بے چارگیوں کو بھی بند کر لیا تھا جن سے باہر اُسے بہت کم معلوم تھا۔ چیتھڑوں اور بوسیدہ چٹائیوں سے بنے ہوئے اُن جھونپڑوں کے درمیان بیٹھی وہ اُداس ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اچانک دُکھنے لگی تھیں اور پھر یہ دکھن دِنوں ہی اُس کو بے چین کئے رہی تھی اور اب وہ اپنے گرد پھیلی اور بکھری آوازوں سے اپنا ناطہ جوڑنے کی کوشش میں نڈھال ہو ۔ باقی تھی۔ پُل کے اُوپر گزرتی موٹر گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہارن اُس کو بھلے لگتے کیونکہ ماں اور اُس کے بہن بھائی جب ہاتھوں میں کٹورے پکڑے بھیک مانگنے یا گندگی کے ڈھیروں پر سے چیتھڑے اکٹھے کرنے چلے جاتے، تو وہ یکدم اپنے آپ کو اکیلا پا کر خوفزدہ ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے پیچھے سُورج کی روشنی کا آخری سایہ بھی ہٹ جاتا۔ تب وہ آہستہ سے اُٹھتی اور سہج قدموں سے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتی۔ وہ چند دن پیشتر ہی تو ان سب کے ساتھ بھاگتی پھر رہی تھی......

ریلوے پھاٹک پر رُکی موٹر گاڑیوں کے پاس جا کر وہ بھیک مانگنے میں سب سے تیز تھی۔ اور جب وہ اُن گاڑیوں میں بیٹھی خوب صُورت عورتوں کو دیکھتی تو اُس کی آنکھیں حیرانی سے پھیل جاتیں۔ وہ بھیک مانگنا بھُول جاتی اور اُس کے چہرے کو تکے جاتی۔ اُس کا دل چاہتا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے ملائم بالوں کو چھُوئے۔ اُس کے رنگین کپڑوں کی ملائمت پر ہاتھ پھیرے۔ کئی بار وہ تیز جاتی گاڑیوں

کے ساتھ دُور تک چلی جاتی تھی۔ اُسے بھیک مانگنے کے سب طریقے ہی تو آتے تھے۔ اُسے رنگین چیزیں اچھی لگتی تھیں.....

اُس نے اپنی جھونپڑی کے سامنے پھُولوں کے چند پودے بھی رکھے تھے۔ اُسے ٹھنڈی ہوا میں بڑا مزہ آتا تھا..... اُس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے بازو پھیلاتے کھلے میدان میں بھاگتی چلی جائے.....وہ اپنی بستی میں سب سے تیز اور لڑاکا تھی لیکن یہ اندھیرا..... اور یہ اکیلا پن..... وہ سڑک کے کنارے کھڑی آوازوں کے شور میں بھی اکیلی رہ گئی تھی.....

اُس کی آنکھیں ابھی تک درد کر رہی تھیں۔ درد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ بے بس سی ہو رہی تھی۔ وہ واپس آگئی..... اُس نے اپنے گرد پھیلے چیتھڑوں سے اُٹھتی مانوس بُو کو سُونگھا.... اور گھبرا کر موتی کو پکارنے لگی..... موتی.... موتی.... لیکن موتی بھی کہیں چلا گیا تھا..... دوپہر میں لُو کے تیز بدبو سے بھرے ہوئے جھونکے اُس کے گرد چکر لگا رہے تھے.... جھونپڑیوں کے گرد چکر لگا رہے تھے ـــ وہ خوش نہیں تھی..... لیکن وہ خوش رہنا چاہتی تھی..... ساتھ کی جھونپڑی میں چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ ماسی کی مدھم مدھم ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔

ماسی کیا تم آگئی ہو..... وہ اُس سے پوچھنے لگی..... اُسے ماسی کی چوڑیوں کی جھنکار بڑی اچھی لگی..... اُسے رنگین چوڑیوں سے ہمیشہ سے پیار تھا..... اُس نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑیوں کو ہولے سے چھیڑا ـــ آگے بڑھ کر اور ٹٹول کر ماسی کی کلائی پکڑی..... اُسے اندھوں کی طرح ٹٹولنا بُرا لگ رہا تھا۔ لیکن یہ اندھیرا تو عارضی تھا..... وہ بھی سب لوگوں کی طرح پھر سب کچھ دیکھنے لگی.......... گاڑیوں میں بیٹھی عورتوں کو دیکھے گی..... ان کے ساتھ ساتھ بھاگے گی۔

"ماسی کیا رنگ ہے تمہاری چوڑیوں کا بھلا.....،" وہ ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"لال ہیں بالکل لال۔ پورے پانچ روپے کی چڑھواتی ہیں میں نے..... ماسی نے فخر سے جواب دیا۔

"کیا یہ گاڑی والی عورتوں جیسی ہیں"..... وہ پھر بولی

"ہاں بالکل ویسی ہیں.....،"

"میں بھی ماں سے کہوں گی مجھے بھی نئی چوڑیاں چڑھوا دے،" وہ اپنی بند آنکھوں کا سوچ کر رنجیدہ

ہوگئی۔

"ماسی کیا اب بھی پھاٹک پر گاڑیوں کی اتنی ہی بھیڑ ہوتی ہے۔" وہ بات کرنے کی کوشش میں بولی۔

"تو کیا تم سوچتی ہو تمہاری آنکھوں کے ساتھ گاڑیاں بھی غائب ہو جائیں . . ."، ماسی نے بیرحمی سے اپنا ہاتھ پرے کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ایکدم کھڑی ہوگئی . . . . . "میری آنکھیں ہمیشہ تو خراب نہیں رہینگی" وہ تیزی سے بولی اور ماسی کے پاس سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی . . . . . "ماں کہتی تھی میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گی . . . ماں میری آنکھیں بڑے ڈاکٹر کو دکھائے گی" . . . . . وہ واپس آتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی . . . . . اُسے ماسی بڑی بُری لگی . . .

. . . اور ماسی نے زور سے کہا تھا . . . .

"اندھی ہوگئی ہے، لیکن مزاج ویسا ہی گرم ہے۔"

"تو میں اندھی ہوگئی ہوں" . . . . . اُسے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھیک کا کٹورا چھن سے گر پڑا ہو۔ جیسے وہ کسی تیز جاتی گاڑی تلے آکر کچلی گئی ہو . . . . . جیسے اُس کا گلا کسی نے زور سے دبا دیا ہو . . . . . اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے تنے اندھیرے سے وحشت ہونے لگی . . . . اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا نچلا دھڑ پتھر کا ہو کر اُس کو زمین کے اندر گھسیٹ رہا ہو۔ اُس کے دل میں چبھ رہا ہو۔ اس کے گلے میں چبھ رہا ہو۔ اُس نے اپنی انگلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو کھولنا چاہا، لیکن درد کی تیز لہر نے اُس کے ذہن کو سُن کر دیا۔ اُس نے سہارے کے لیے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا . . . . .

"میں ماں سے کہوں گی . . . . . میں کیوں اندھی ہونے لگی . . . . . اندھی ہوگی ماسی . . . . خدا کرے اس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ جائیں۔"

وہ نڈھال ہو کر چیتھڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ گئی . . . . . اُس کا سارا وجود بھی خوف سے سُن ہو گیا تھا . . .

. . . . سورج کی تمازت دھول میں گھل کر اور بھی دہک رہی تھی۔ اُس نے اپنی پھٹی چُنری کے پلو سے آنکھوں کو مل مل کر پونچھا . . . لیکن اندھیرا کسی طور ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"ماں . . . ." وہ پوری قوت سے چلائی . . . . . پھر اُس نے اپنا پسینے سے تربتر چہرہ چیتھڑوں کے ڈھیر میں چھپا لیا۔

دُھول۔ جھینگروں کی بدبُو ۔۔۔۔ ہڈیوں کا ڈھیر۔ بکریوں کی مینگنیاں۔ رکھوالے کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ رحموں کے ٹرانزسٹر سے گائے جانے والے فلمی گیت ۔۔۔۔ ماں کی جھڑکیاں اور تیز جاتی موٹر گاڑیوں کی پُوں پُوں۔ سب اُس کی بند آنکھوں کے سامنے بڑی ترتیب سے ایستادہ ہوگئے تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ سب یادیں اندھیری رات میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ ۔۔۔۔ وہ سالوں سے ماں کا ہاتھ پکڑے اپنے قدموں کی گنتی پوری کرتی مارکیٹ میں مخصوص جگہ جا بیٹھتی ۔۔۔۔ اور کوشش کرتی کہ زمانوں پہلے دیکھی ہوئی چیزوں کے رنگ اُسے بھُولنے نہ پائیں ۔۔۔۔ لیکن سب کچھ دھندلا جا رہا تھا ۔۔۔۔ وہ سارا دن ہاتھ پھیلائے صدا لگاتے ہوئے اپنے آپ کو اجنبی اجنبی لگتی ۔۔۔۔ جب سب طرف خاموشی ہوتی، تو کئی بار چپ بیٹھی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگتی ۔۔۔۔ اب ساری دُنیا صِرف آوازوں میں ڈھل رہی تھی۔ اُس کا ناطہ جسموں سے کٹ رہا تھا آوازیں ۔۔۔۔ صرف آوازیں ۔۔۔۔

جب شام کو اُس کی ماں اُس کی پیسوں سے بوجھل جیب کو دیکھتی تو خوش ہو کر اُسے کون آئس کریم لے دیتی اور وہ کون کو چاٹتے ہوئے دل ہی دل میں کہتی ۔۔۔۔ اندھا ہونا کوئی خاص گھاٹے کی بات تو نہیں۔ بابو لوگ۔ خود ڈرائیو کرتی ہوئی بیگمیں۔ جینز پہنے ہوئے جوان لڑکیاں۔ ماں باپ سے بے قابو ہوتے ہوئے چھوٹے بچے۔ سب سہج قدموں سے چلتے ہوئے اس کے تصور کی۔

سکرین پر اُبھرتے ڈوبتے رہتے۔ اُسے نہ جانے کیسے عادت پڑ گئی تھی کہ اس کی جاگتی زندگی کے دس سال جو بے خبری ہی میں گزر گئے تھے پچھلے چار سالوں میں ذہن کی خوابیدہ تہوں سے اُبھر کر آس پاس ہی منڈلاتے رہتے ۔۔۔۔ سایوں کی مانند۔

مخصوص ہاروں کے ذریعے وہ اُن لوگوں کو پہچانتی تھی، جو اُسے خیرات دیتے تھے۔ سارے دن کے بعد جب وہ بستی میں جاتی، تو وہ اپنے آپ کو اُس سے مانوس نہ کر پاتی۔ آوازیں بدل جاتیں اور مختلف بُوئیں اُسے گھیر لیتیں۔ تب اُسے دن میں دیکھے گئے خوابوں سے ایک الگ ہی دُنیا کا احساس ہوتا۔ ہنڈیا سے اٹھتی خوشبو، بکریوں کے جسموں سے اُٹھتی بُو ۔۔۔۔ فلمی گیتوں کی تیز آواز، جو اُس کے ذہن کی سوچوں کو گڑبڑا دیتیں۔ وہ خاموش بیٹھی گیتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگتی اور پھر اُس ہوا کا احساس کرنے لگتی جو اُس کے بالوں کو اُڑا رہی ہوتی یا اُس کے بوسیدہ دوپٹے کو اُتارنے کی کوشش کرتی۔ تب اُسے ایک خواب سا یاد آ جاتا ۔۔۔۔ ایسا خواب جس میں رنگ ہوتے۔ گاڑیوں کے رنگ، چوڑیوں کے رنگ۔

خوب صورت چہروں کے رنگ .... خوبصورت یادوں کے رنگ۔ رنگین کپڑوں کے رنگ ...... اور جھونپڑیوں کے گرد پھیلی دھول کا رنگ وہ ہمیشہ کی طرح گھبرا کر اپنی آنکھیں ملنے لگتی۔

"ماں کیا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں"؟ اُس کو نہ جانے آسمان اور اس پر بکھرے ستارے آج پہلی بار کیوں یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل اُس کے پہلو میں دُکھ سا رہا تھا۔ اُس روز فضلاں۔ شیداں۔ ننھی اور پھیپا اس کے پاس ہی بیٹھی آپس میں باتیں کر کے ہولے ہولے ہنس رہی تھیں۔ باتیں جن میں مختلف گاڑیوں اور سکوٹر والے بابوؤں کے نام تھے، جوان کی طرف دیکھ کر ہنستے تھے اور بہت ساری خیرات دیتے تھے۔ وہ سب اس کی موجودگی سے لاپرواباتیں کیے جا رہی تھیں .... اور اُسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ زمین اتنی ہموار نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی رہی ہے۔ دُنیا اس روشنی کی جھلملاہٹ سے زیادہ روشن ہے۔ دُنیا میں صرف آوازیں نہیں جسم بھی شامل ہیں۔ ایسے جسم جو اس بستی سے تعلق نہیں رکھتے۔ دُنیا صرف چلتے قدموں کی دھمک۔ آوازوں اور تیز جاتی گاڑیوں سے پیدا زمین کے ارتعاش اور ہاتھ میں پکڑے کٹورے ہی کا نام نہیں اس میں ہونٹوں پر آتی ذومعنی ہنسی بھی ہے جو صرف سہیلیوں کے ساتھ ہی اُبھرتی ہے۔ ایسی باس جو فضلاں۔ رشیداں ننھی اور پھیپا کی باتوں سے نکل کر سب طرف پھیل رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دے .... لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اُن جیسی باتیں نہیں کر سکتی۔

" وہ دِن کدھر چلے گئے ..... روشنی کیوں نظر نہیں آتی۔ اُسے لگا جیسے اُس کی ٹانگیں بھی اُس کے دھڑ سے علیٰحدہ ہو کر گر پڑی ہوں اور وہ ایک بے جان لوتھڑہ ہو جو ہڈیوں کی طرح۔ مُردہ اور چیتھڑوں کی طرح گندہ اور بدبودار ہو۔"

تب اُس نے ماں سے ستاروں کے بارے میں پُوچھا تھا اور ماں نے کہا تھا۔

"تیرے لیے سب برابر ہیں۔ ستارے ہوں یا نہ ہوں۔"

" فرق پڑتا ہے ماں۔ فرق پڑتا ہے" وہ زور سے چلاّئی۔

" بتاؤ کیا ستارے ہیں ؟ کیا ہمارے گھر میں دیا جلتا ہے"؟ اور پھر وہ چارپائی پر اُوندھی ہو کر زور زور سے رونے لگی۔

"بے چاری ناصراں" ...... اس کی چاچی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" ساری جوانی کیسے گزارے گی" چاچی کا ہاتھ بدستور اس کے سر پر رکھا تھا۔

"ماں لوگ بخشش میں پیسے ہی کیوں دیتے ہیں؟ اللہ کرے کوئی باؤ ایسا بھی ہو جو بخشش میں مجھے دو آنکھیں دیدے، تاکہ میں پھر دیکھنے لگوں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور اُٹھ کھڑی ہوئی "ماں کیا دیا جلتا ہے؟" اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ "کیا کرے گی دیئے کو؟" ماں کی آواز میں تعجب تھا۔

"تُو بتا تو سہی۔" وہ ہاتھ آگے پھیلا کر اندازے سے جھونپڑی کی طرف چل پڑی۔ اب اس کے اندر بڑھنے کی ساری حسیتیں مر چکی تھیں......

اس کی چھوٹی بہن نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جھونپڑی میں پڑے ہوئے دیئے کو جلا دیا۔

"نذیراں کیا میں بھی ماں کی طرح لمبی ہوں۔" اس نے نذیراں کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تیری آنکھیں خراب نہ ہوتیں تو تُو سب سے اچھی لگتی۔ سب کہتے ہیں تو پھر بھی اچھی لگتی ہے۔" نذیراں پیار سے بولی۔

"کیا تُو سچ کہتی ہے؟" وہ شرما گئی تھی۔

"اللہ کی قسم" نذیراں کا دل اُس کے لیے دُکھ رہا تھا۔ وہ کھڑی اُسے دیکھنے لگی "یہ تیرے سامنے ہی دیا رکھا ہے۔ کیا کرے گی تُو دیئے کو؟"...... نذیراں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"تُو جا، جا کر روٹی کھالے۔" وہ زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی..... اور اپنی آنکھوں کو دیئے کی سیدھ میں لے گئی..... اُس کی بند آنکھوں کے پپوٹوں میں اندھیرے اور روشنی کی جھلملاہٹ اُتر آئی......

ہاں..... دُنیا میں ابھی بھی روشنی ہے۔ اُجالا ہے..... اور وہ چُپ چاپ دیئے کے سامنے جھکی آنکھوں آنسو بہاتی رہی — سب گھر والے اُس کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بے چاری کے دماغ پر اثر ہونے لگا ہے۔"...... چاچی کی آواز میں بدستور پرانا درد تھا....

اب وہ اپنی بستی کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے اپنی جھونپڑی

"ماں لوگ بخشیش میں پیسے ہی کیوں دیتے ہیں؟ اللہ کرے کوئی باؤ ایسا بھی ہو جو بخشیش میں مجھے دو آنکھیں دیدے، تاکہ میں پھر دیکھنے لگوں"،

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور اُٹھ کھڑی ہوئی "ماں کیا دیا جلتا ہے"؟ اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ "کیا کرے گی دیئے کو"؟ ماں کی آواز میں تعجب تھا۔

"تو بتا تو سہی" وہ ہاتھ آگے پھیلا کر اندازے سے جھونپڑی کی طرف چل پڑی۔ اب اس کے اندر بڑھنے کی ساری حِسّیں مر چکی تھیں......

اُس کی چھوٹی بہن نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جھونپڑی میں پڑے ہوئے دیئے کو جلا دیا۔

"نذیراں کیا میں بھی ماں کی طرح لمبی ہوں" اس نے نذیراں کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوتے پوچھا۔

"اگر تیری آنکھیں خراب نہ ہوتیں تو تُو سب سے اچھی لگتی۔ سب کہتے ہیں تو پھر بھی اچھی لگتی ہے"، نذیراں پیار سے بولی۔

"کیا تُو سچ کہتی ہے"؟ وہ شرما گئی تھی۔

"اللہ کی قسم"! نذیراں کا دل اُس کے لیے دُکھ رہا تھا۔ وہ کھڑی اُسے دیکھنے لگی "یہ تیرے سامنے ہی دیا رکھا ہے۔ کیا کرے گی تُو دیئے کو"...... نذیراں نے ہمدردی سے پُوچھا۔

"تُو جا، جا کر روٹی کھالے" وہ زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی .... اور اپنی آنکھوں کو دیئے کی سیدھ میں لے گئی .... اُس کی بند آنکھوں کے پپوٹوں میں اندھیرے اور روشنی کی جھلملاہٹ اُتر آئی......

ہاں .... دُنیا میں ابھی بھی روشنی ہے۔ اُجالا ہے..... اور وہ چُپ چاپ دیئے کے سامنے جُھکی آنکھوں آنسو بہاتی رہی — سب گھر والے اُس کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بے چاری کے دماغ پر اثر ہونے لگا ہے"...... چاچی کی آواز میں بدستور پرانا دَرد تھا....

اب وہ اپنی بستی کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے اپنی جھونپڑی

نئی سرکیوں کی چھت ڈالی تھی، دودُودھ دینے والی بکریاں خرید لی تھیں۔ اب اُس کے باپ کا ریڈیو سب سے اونچی آواز سے بجتا رہتا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھا بڑی معتبر آواز میں باتیں کرتا۔ اُن کی ہنڈیا میں پکتے گوشت کی خوشبو دُور تک پھیل جاتی لیکن وہ اِن ساری خوشیوں کا باعث ہونے کا سبب بنکر بھی خوش نہیں تھی۔ اُس کے اندر سے اکیلے پن کی دھول کا مزہ اس کے مُنہ میں بھر جاتا اوراس کا دل درد کرنے لگتا۔ ہولے ہولے جیسے کوئی اسے دَبا رہا ہو۔ وہ گھبرا کر لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور چاہتی کہ اپنے سامنے تنی سیاہی کی چادر کو دُور پھینک دے۔ اور سڑکوں پر بھاگتی جائے۔ کِسی کا ہاتھ پکڑے جو مضبوط اور طاقتور ہو۔ اپنی بستی کی دُوسری لڑکیوں کی مانند۔ زندہ اور جاندار۔

لیکن کوئی ہاتھ اُس کی طرف نہ بڑھتا۔ شیراں، فضلاں، پھپا اور نتھی سب کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کے کرتوں اور پُچلوں کے ساتھ بندھی ہوئی چاندی کی ننّھی ننّھی سی گھنٹیاں انوکھے سے راگ اُلاپتی ہوئی لگتیں۔ اُن کی باتیں اور قہقہے ..... وہ اپنی بند آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی۔ لیکن کوئی وجود بن نہیں پا رہا تھا۔ سب سوچیں آوازوں میں ڈھل جاتیں۔ مختلف آوازیں جو الگ الگ پہچان رکھ کر بھی سیاہی کے ایک بڑے سے الاؤ میں بھسم ہو جاتیں۔ اور وہ حیران بیٹھی رہتی۔ کیونکہ خوشبو۔ قہقہے باتیں ..... گاڑیوں کے ہارن دُوسروں کو دی ہوئی دعائیں۔ یہ سب وہ اجالا نہیں تھا جس کو پانے کی خواہش اُس کے دل میں شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُن پیسوں کو محسوس کر کے اپنے دل کے اندر بڑھتے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی ...... وہ جیب کے اندر ہی پیسوں کو مٹھی میں بھر لیتی، لیکن خوشی کی ہلکی سی رمق بھی اُس کے اندر سے نہ اُبھرتی۔ پھر وہ اپنی مٹھی کو ہولے سے کھول دیتی۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے" وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ..... وہ قدموں کی آہٹ پر چونک اُٹھتی، لیکن اس کا ہاتھ اُس کے پہلو میں لٹکا رہتا۔ وہ صدا دینا بھُول جاتی پھر وہ چُپ چاپ اپنے اندر کی آنکھوں کو بھی بند کر لیتی اور اندھیرے کی گہری کھائی میں ڈوبتی جاتی .....

"جوانیاں مانے ..... سوہنی جوانی کا صدقہ"..... اس کی بستی کی کوئی اور عورت رِقّت بھری آواز میں کسی گاڑی یا سکوٹر والے مرد کو دُعائیں دے رہی ہوتیں۔

جوانی کیسی ہوتی ہے ..... وہ سوچتی ..... ویسے ہی بابو جو اُسے چھ سال پہلے نظر آتے تھے۔ لیکن تب اُسے جوانی کا مطلب ہی معلوم نہ تھا۔ اور آج وہ یاد کرنے پر بھی یاد نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے تو کچھ یاد بھی نہیں آرہا" وہ اپنی آنکھیں زور زور سے کھولنے کی کوشش کرتی۔ اُنھیں بار بار ہتھیلی سے مَلتی ...... لیکن روشنی ...... وہ تو کہیں بھی نہ ہوتی ...... تب اُس کا جی چاہتا کہ وہ زور زور سے روتے ...... اپنی ماں کو پکارے، لیکن وہ جانتی تھی کہ ماں شام سے پہلے کبھی نہیں آتی تھی... وہ دل ہی دل میں ماں کو گالیاں دینے لگتی جس کی لاپرواہی نے اُسے روگی بنا دیا تھا۔

"یہ دُنیا بڑی مطلبی ہے۔ ماں بھی باپ بھی اور سب دُوسرے بھی ...... اُنھیں میرے پیسوں سے مطلب ہے ...... میرا دھیان کوئی بھی نہیں رکھتا۔ مَیں جو اتنا کماتی ہوں۔ ابّا چاہے تو میرا علاج کروا سکتا تھا ...... لیکن پھر اُن کے لیے کماتے گا کون"؟ شک کا سپنولیا اُس کے ذہن میں رینگتا رہتا۔

اُس رات اُس نے اپنی چارپائی پر لیٹے سے اُٹھ کر ماں سے پُوچھا تھا ...... وہ بے چین سی ہو رہی تھی ......

"کیوں ماں بھلا دن میں کتنے روپے کما لیتی ہوں"؟ اُس کو یہ سوال پوچھتے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اور ماں سے پہلے نذیراں نے جلدی سے کہا۔ "ناصراں ماں کہتی ہے اب ہمارے پاس بڑے روپے ہیں"۔

اُس کے دل میں ایک نئی اُمید جاگی تھی ......

"کیوں ماں نذیراں سچ بول رہی ہے"؟ اس کی آواز میں تمنّا کی ہلکی لرزش تھی۔

"بس ٹھیک ہے کُڑیے، لیکن تو کیوں پُوچھ رہی ہے"؟ اُس کا باپ غصّے سے بولا۔ کیونکہ باپ کی جیب بھاری اور دل میلا چکٹ تھا۔

وہ اپنے اندر ڈھتی ہوئی ہمّت کو اکٹھا کرنے کی کوشش میں چُپ ہو گئی ...... کچھ نہیں ابّا ...... بس ایسے ہی پوچھا تھا۔ وہ جلدی سے لیٹ گئی۔ اور اپنوں کی خود غرضی کے تیز نوکیلے کانٹے اُس کے دل کو لہولہان کیے دے رہے تھے۔ زندگی کا پتھر اُس کے وجود سے بندھا اُسے ڈبو رہا تھا۔

"ابّا میں چاہتی ہوں کہ تو میری آنکھوں کا علاج کرا دے"۔

اُس کی زبان سے یہ الفاظ بے اختیار ہی پھسل گئے تھے ...... وہ خوفزدہ ہو کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ شہر میں بڑے بڑے ہسپتال ہیں مجھے ایک بیگم نے بتایا تھا" وہ بولتی رہنا چاہتی تھی مبادا اُس کا باپ اُسے ڈانٹے ...... یا اپنے جواب سے

مایوس کر دے۔
"ہوں..... ہوں..... اُس کا باپ حُقے کا تیز کش لے کر بولا۔ "تُو تو علاج کروانا چاہتی ہے۔؟
"ہاں ابا" اس کے اندر کی ہمت بالکل ڈھے چکی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کی آنکھیں اور اُجالے کی تمنا جو برسوں سے اُس کے دل کے ساتھ ساتھ لگی ہمیشہ اس کی ساتھی رہی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے..... لیکن اس کے لیے بڑا پیسہ چاہیے... جب اتنا پیسہ اکٹھا ہو جائیگا، تو میں تیرا علاج کروا دوں گا" اُس کے باپ نے ٹرانزسٹر کی پوری آواز کھولتے ہوتے جواب دیا۔
فلمی گیت کی تیز آواز اُس کی ہمت کے کمزور سے بند کو اپنے تُند ریلے میں بہالے گئی۔ گیت کا ساز آنسوؤں کے قطروں کی مانند اس کے دل کو بھگوتا جارہا تھا۔ وہ اُس شور کو سُنتی اُن سب کے درمیان بیٹھی بے آواز روتی جارہی تھی۔ لیکن اس کے اندر کا جہاں تہہ وبالا ہو رہا تھا۔
"یہ مرد اور عورت...... یہ کیوں ایک دُوسرے کو پکار رہے ہیں... میرا مرد کون بنے گا... ... کیا میں بھی کسی کے مَن بھاؤں گی..... میرے دل کی پکار کون سُنے گا۔ میرا ہاتھ کون پکڑے گا۔ میرے کرتے کے دامن میں کب موتی لگیں گے؟....." وہ اپنی نئی سوچوں پر حیران ہو رہی تھی۔
"کون اندھی راہ کا ساتھی ہوسکتا ہے؟" اُسے لگا جیسے وہ حیات کی لمبی اندھیری راہ پر نڈھال اکیلی ہی بھٹکتی پھر رہی ہو۔ ماں باپ اور بہن بھائی سے دُور۔
تیز گرد آلود ہوا جھونپڑیوں کی بے بضاعت دیواروں کو ہلا رہی تھی..... اُس کے اندر بھی گرد بھر رہی تھی اور اس کے مُنہ میں بھی.....
"یہ میری پروا کیوں کریں۔ کمائی کا ذریعہ جو ہوں" اس کے دل میں دُبا شک اُبھر رہا تھا۔
"نذیراں کہتی ہے ہمارے پاس بڑے پیسے ہیں..... کہاں جاتے ہیں یہ پیسے... میرا ہاتھ تو آگے پھیلے پھیلے تھک جاتا ہے"
وہ ایک بار پھر رونے لگی..... بے بسی سے.....
اور یہ بے بسی اس کے اندر نہ جانے کیسے کیسے گھاؤ کر دیتی اگر رحموں کا ہاتھ اُسے ایک نئی راہ پر نہ لے جاتا۔ رحموں کا ٹرانزسٹر ہمیشہ کی طرح رات گئے تک بجتا رہتا۔ اُسے لگتا رحموں خود یہ

گیت اس کے لیے گا رہا ہو ..... تب اُس کے اندر کا جانور عجیب انداز سے چوکس اور چوکنا ہو کر ہر آہٹ پر اپنے ساتھی کا منتظر رہتا۔ اُسے لگتا جیسے وہ آج سے آٹھ سال پہلے والی ناصراں ہو۔ لیکن یہ اس کے اندر کا چوکس جانور۔ وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگتی ...... اب خیرات مانگتے اس کی آواز میں لوچ سا آجاتا ..... اپنے گرد پھیلی ہوئی آوازیں اُسے بڑی جاندار اور اچھی لگتیں۔

ایک روز اُس نے رحموں سے پوچھا تھا۔

"رحموں میں تجھے اچھی لگتی ہوں نا۔ ماں کہتی ہے میرا رنگ سب سے گورا ہے اور میرے ہاتھ پاؤں بھی اچھے ہیں۔ اور ماں میری مینڈھیاں بناتے بناتے تھک جاتی ہے" وہ ہولے ہولے ہنس رہی تھی اُس نے پل کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ رحموں کے سامنے پھیلا دیئے تھے ..... دیکھو رحموں ..... میری انگلیاں کتنی لمبی لمبی سی ہیں .... اچھی ہیں نا"

اور رحموں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی اُنگلیوں پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا ....

"میں تیری آنکھیں ٹھیک کراؤں گا ناصراں۔ مجھ پر بھروسہ رکھ۔ تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ بڑی ہی اچھی" ناصراں کے لیے یہ ہی بہت تھا۔ ان چند خوب صورت لفظوں نے اُس کے اندر اجالا کر ڈالا تھا جس کی چکا چوند میں اُسے باہر کا اندھیرا بھی پورا دکھائی نہ دیتا۔ وہ ہر روز کچھ نہ کچھ پیسے اپنے پاس چھپا لیتی۔ اور جب بھی موقع ملتا رحموں کو دے دیتی۔ رحموں کہتا:

"مجھے تیری کمائی نہیں چاہیے ناصراں۔ مجھے تو تو چاہیے" اور ناصراں کو لگتا جیسے اس کے سامنے تنے اندھیرے میں رنگ برنگ کی پھلجھڑیاں چھٹ رہی ہوں اور ٹھنڈک کا ان چھوا ہاتھ اُس کے جسم پر آہستہ آہستہ پھسل رہا ہو۔

"رحموں میں ہنڈیا پکانا جانتی ہوں ...... اور میں ماں سے کہوں گی کہ مجھے کروشیا بھی سکھا دے پھر میں تیرے لیے بنیان بناؤں گی اور ریڈیو کا غلاف بھی بناؤں گی اور میں جھونپڑی کے سامنے بہت سارے پھول لگاؤں گی تو وہاں بیٹھا ہوا کتنا اچھا لگے گا" اُس نے اپنی انگلیوں سے رحموں کے مُنہ کو آہستہ سے ٹٹولا" تُو میرے ساتھ خوش رہے گا نا رحموں .... لیکن میں تو اندھی ہوں ....." وہ ہمیشہ کی طرح خوفزدہ ہو کر بولی ..." پھر کیا ہے میں تو آنکھوں والا ہوں" رحموں ہولے سے ہنسا۔

"ناصراں کیا تو میرے ساتھ چلے گی . . ." رحموں ایکدم بولا۔

"کہاں ؟" ناصراں کا دل زور سے اُچھلا۔

"جہاں مَیں کہوں۔ پھر ہم دونوں نکاح پڑھوالیں گے اور اپنا الگ گھر بسالیں گے۔" رحموں اُس کے ہاتھ کو زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔

"ماں سے پوچھونا " . . . ناصراں کی آواز میں جذبات کی لرزش تھی۔

"تیرے ماں باپ تجھے کبھی نہیں بیاہیں گے۔ اگر تُو چلی گئی تو انھیں چودھری کون کہے گا۔"

رحموں طنز کرتے ہوئے بولا۔

" وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔" اس نے اپنے اندر کے شک کو دباتے ہوئے کہا۔

" اگر وہ پیار کرتے ہیں، تو تیری آنکھوں کا علاج نہ کرواتے۔"

" علاج کے لیے پیسے بھی تو ہوں۔" ناصراں کی آواز مدھم سی تھی۔

" علاج کے لیے پیسے نہیں اور دارو پینے کے لیے پیسے ہیں۔"

جوّا کھیلنے کے لیے پیسے ہیں۔ سیروں گوشت پکانے کے لیے پیسے ہیں اور تو جو مینہ آندھی میں ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہتی ہے، تیرے علاج کے لیے پیسے نہیں . . . . تو کچھ نہیں جانتی ناصراں۔ عقل بھی آنکھوں کے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔"

وہ پُل کے اندھیرے میں کھڑی تھی . . . . اور سردیوں کی تیز ہوا ساں ساں کرتی اُن کے پاس سے گزر رہی تھی . . . . خود رَو پودوں کے بیچ میں سے گزر رہی تھی . . . . اُس کے دل کی اُداس دنیا میں سے گزر رہی تھی۔ اور پھر اُس نے مایوسی کے اندھیرے میں کھڑے کھڑے ایک فیصلہ کرلیا۔ ایسا فیصلہ جس کی ہمت اُس میں اس لمحے سے پہلے اور بعد میں نہیں ہوسکتی تھی۔ کوئی گہری دُکھ کی لہر اس کے دل سے اُٹھ کر اس کی آنتوں میں چل رہی تھی۔ جیسے اُس کے اندر کوئی گہرا سا گڑھا کھُد گیا ہو اور وہ اس میں لڑھک رہی ہو۔

اُس نے ٹٹول کر رحموں کا ہاتھ پکڑلیا۔

"چل رحموں چل۔ مَیں تیرے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

"ناصراں سوچ لے، تیرا باپ بڑا طوفان اُٹھائے گا۔ مُنہ سے چھِنتا نوالہ برداشت سے باہر ہوتا

ہے۔" رحموں خوش تھا۔

" اندھے پن کے اتنے لمبے برس میں نے جب سوچ کر ہی تو گذارے ہیں تیکھی اور نوکیلی سوچیں جنھوں نے میرے دل کے اندر ناسور بنا ڈالے ہیں کسی کو مجھ سے پیار نہیں۔ سب پیسے کے پیارے ہیں۔ بارش، آندھی اور بھری دوپہروں میں بھی ماں نے کبھی نہیں کہا کہ چل ایک دن آرام ہی کرلے۔ پھر میں اپنی راہ کیوں نہ لگوں، کیوں ان کے لیے جان کھپاتی پھروں۔ تو چاہے مجھ سے جیسا سلوک کرے۔ تیرے مُنہ سے پیار کے دو بول تو سُنے۔ دُوسروں کو ہنستے بولتے سُنتی ہوں تو میرا تن اور من مٹی کا ہو جاتا ہے۔ تیری میری کوئی سانجھ نہ ہو، دو بولوں کی سانجھ تو ہو گی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔۔۔۔"

ناصراں کی آواز میں ہمت اور حوصلہ تھا۔

اور پھر ناصراں نے رحموں کا ہاتھ پکڑا اور پُل کے اندھیرے سے نکل کر اُمید کی روشنی کے تعاقب میں چل پڑی۔ ایسی روشنی جو اس کی آنکھوں سے نکل کر سارے جہان کو روشن بنا دے گی۔

"کیوں رحموں اُوپر ستارے تو ہوں گے نا۔۔۔"

اُس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف پٹپٹائیں۔۔۔۔ لیکن وہاں بدستور اندھیرا تھا، لیکن اس کے اندر اُمیدوں اور آرزوؤں کی دیپ مالا جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے لائنوں کو پار کرتے ہوتے ایک نئی بستی کو چل پڑے۔

ناصراں نے ماں باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔ اور ان کی گالیاں اور دھمکیاں سُننے کے باوجود وہ گھبرائی نہیں تھی، وہ کیوں گھبراتی۔۔۔۔ رحموں جو اُس کے ساتھ تھا۔۔۔۔ دوسرے ناصراں صرف آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ارادے کی آنکھوں میں تو بڑا تیقن تھا۔

وہ رات کو ٹٹول کر رحموں کا ہاتھ پکڑ لیتی اور پھر اُس کے لبوں تک ایک سوال آتے آتے رہ جاتا۔ وہ رحموں سے اپنے علاج کا پوچھنا چاہتی، لیکن ایک انجانا سا خوف اُس کو گھیر لیتا۔۔۔۔

۔۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ اب صرف رحموں ہی اُس کا سہارا ہے اور وہ روشنی جو محبت کے رُوپ میں اُس کے دل کے اندر پھوٹتی رہتی ہے۔۔۔۔ لیکن وہ اِن خوشیوں کو پورا برتنا چاہتی تھی۔۔۔۔ اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ۔۔۔۔ لیکن بات کرنے پر رحموں نے بھی پیسوں کی کمی کا رونا رو دیا تھا۔۔۔۔ پیسے اور روشنی۔۔۔

.... کہاں سے آئیں گے یہ پیسے ..... وہ دِنوں اِسی ادھیڑ بن میں اُلجھی رہتی ...... اور پھر ایک دن اُس نے کہا تھا .....

"رحموں تو مجھے مارکیٹ والی جگہ پر چھوڑ آیا کر اُس کے دل کے اندر آج بہت دنوں بعد پھر وہی درد اُٹھا تھا جس کا رشتہ اُس کی آنکھوں کی روشنی سے تھا۔ اُس کی آواز میں پہلے جیسی امید نہیں تھی۔ آج پھر وہ آنکھوں کے کھو جانے کے ماتم میں مُبتلا تھی۔

"رحموں آنکھوں کے علاج کے لیے کتنے پیسے چاہییں؟"

"یہی کوئی تین چار ہزار ....." رحموں کی آواز کی بے تعلقی اس کو بُری لگی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"یوں تو میری عمر ہی گذر جائے گی" وہ غمزدہ ہو کر بولی۔

"مجبوری ہے ناصراں۔ میں اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں" رحموں نے کڑوا سا دُھواں اس کے مُنہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"حیات اتنی لمبی کیوں ہے" وہ اُس رات بہت دنوں بعد پھر رو رہی تھی اکیلی اور دُکھی۔

اگلے روز رحموں اُسے مارکیٹ والی جگہ پر چھوڑ آیا تھا .....

"اللہ کی راہ پر بابا۔ اندھی پر رحم کرو" اُس کی آواز میں دَرد تھا اور آنسوؤں کی دُھندھن بھی۔ وہ کئی مہینوں بعد اپنے اندر کی رنگین رُت سے باہر آئی تھی۔ ایسی رُت جہاں رحموں کی باتیں، اپنے خواب ——ہونٹوں پر گنگناتے ہوئے گیت اور ایسی خوشی تھی جو اُسے سرتاپا بھگوئے رکھتی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی یہ رُت بیت چکی تھی۔

"میں کئی جنموں بھی مانگتی رہوں، تو وہ پیسہ میری ہتھیلی پر کبھی نہ رکھا جائے گا جو میری آنکھوں میں روشنی لا سکے" اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ اُس کی آواز اس کے اندر ہی گھٹ گئی ....

.... اُس کا ہاتھ سامنے پھیلا ہوا تھا، خوشیوں کی بھیک مانگتا۔ روشنی کی بھیک مانگتا۔ لیکن وہ پھر بھی نا امید نہیں تھی۔

اب رحموں چرس کے سگریٹ پی کر سارا دن جھونپڑی میں بیٹھا تاش کھیلتا یا پوری آواز میں فلمی گیت سُنتا رہتا۔ وہ جب رات کو ہاتھ تھامے اُسے واپس لاتا، تو ایک بات بھی نہ کرتا۔ اُس کے

ہاتھوں میں پہلے جیسی چاہت کی گرمی اور نرمی نہ ہوتی ..... اور وہ بھی اُس سے کوئی سوال نہ کرتی؛ حالانکہ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس سے پہلے کی طرح باتیں کرے ..... اُس کی باتیں جن میں اُس کی آنکھوں کے علاج کا بھی ذکر ہو..... اُس کے جسم کی خوب صورتی کے لفظ بھی ہوں.... اور اُس کے لبوں پر وہ ہنسی بھی جو سچی اور اپنی اپنی سی لگتی تھی۔ لیکن اب تو صرف فلمی گیتوں کی آواز اور گھرا گھرا سا کڑوا دھواں ..... بچا کھچا سالن اور ٹھنڈی روٹی تھی........

وہ راتوں کو اُٹھ کر بیٹھ جاتی ..... کہاں چلی گئی وہ روشنی ..... اُسے لگتا جیسے یہ اندھیرا اُسے نگل رہا ہو۔ پنجے نکالے اُس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ کسی بڑے سے بھوت کی مانند اُس کو نوچ رہا ہو.....

یہ اندھیرے کی کاٹ اس کے زندہ وجود کو کاٹتی رہتی..... اور وہ چُپ چاپ جاگتی اپنی جھونپڑی کے گرد پھیلی آوازوں کو سنتے ہوئے اپنے درد کو بانٹنے کی کوشش کرتی ..... لیکن بے جان آوازیں اس کا درد بانٹ نہ سکیں۔

لیکن یہ دَرد اس ننھے سے وجود نے بانٹ لیا تھا جس کو اُس نے جنم دیا تھا۔ اس نے اُس وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا..... اور اس کے چہرے پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگی۔

وہ اُسے چھوتی تو اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا اور پھر ایک سسکاری بھر کر چپ ہو جاتی۔ وہ چہروں کی پہچان بھول چکی تھی..... دُوسرے چہرے تو دُوسرے تھے، لیکن یہ ننھا سا چہرہ تو اس کے وجود سے متعلق تھا۔

"اگر مَیں دیکھ سکتی ..... اگر مَیں دیکھ سکتی۔

"کون ہوگا جو روشنی کے جہان کا راستہ دکھائے گا۔ ایسا راستہ جس پر مَیں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر چل سکوں"..... یہ سارا دکھ وہ اکیلی ہی برداشت کر رہی تھی..... رحموں نے بھی اُس کو کمائی کا ذریعہ ہی سمجھا تھا۔

"مجھے بہت سارے پیسے اکٹھے کرنے چاہئیں تاکہ مَیں اپنی اندھی آنکھوں کی جوت واپس لا سکوں" کوئی اپنا نہیں ..... کوئی بھی نہیں" اس نے بہت دُکھ سے صدا لگائی۔ اکھیاں والیو۔ اکھیاں بڑی نیامت ....."

"اکھیاں بڑی نیامت۔ اس کی آواز میں بڑی پُر درد تھی وہ اپنے بیٹے کو اُٹھائے۔ اب

آوازوں کے تعاقب میں چل پڑتی۔ کون آئس کریم کھاتے ہوتے لوگ۔ انگریزی بولتی ہوئی بیگمیں۔ دبی دبی ہنستی ہنستی ہوئی جوان لڑکیاں۔ تب اُسے لگتا جیسے وہ کوئی بھوت ہو جو روشنی اور اُجالے کے تعاقب میں سرپٹ بھاگ رہی ہو۔ ایسا اُجالا جو اس کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہو۔

"مجھے اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا ہے...... یہ خواہش ایک چیخ بنکر اُس کے اندر چکر کاٹتی رہتی.... .... بھیک مانگتے..... خاموش بیٹھے۔ رات کو سوتے وہ اس چیخ کو بڑھتا محسوس کرتی۔

"مجھے اِس جاگتی دُنیا سے اپنا ناطہ دوبارہ جوڑنا ہے۔" اُس نے دن بھر کی کمائی کو کس کر ایک پوٹلی میں باندھا اور اپنے نیفے میں اُڑس لیا اور اُس رات اس نے رحموں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

"نہیں رحموں۔ اب مَیں کہیں نہیں جاؤں گی..... میرا کوئی گھر نہیں۔ مَیں یہیں رہوں گی۔" جب رحموں نے اس کے کمزور جسم کو گھسیٹ کر لے جانا چاہا، تو وہ زمین سے چمٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی..... لوگوں کے اکٹھا ہونے پر رحموں کو ناکام واپس جانا پڑا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔

"رحموں مَیں نے تجھ سے کچھ لیا نہیں۔ دیا ہی ہے اور جو کچھ دے چکی ہوں وہی غنیمت جان۔ اپنی راہ لے مَیں تیری باتوں اور تیرے بغیر بھی جی لوں گی۔ مَیں اندھی ہوں، لیکن آنکھوں والوں کا سہارا ہوں۔ پھر مَیں کیوں ان کی آنکھوں کی لاٹھی پکڑوں..... مَیں اپنی راہ کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی جاؤں گی۔ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے۔ تم واپس چلے جاؤ، تیری میری کوئی سانجھ نہیں۔" اُسے وہاں بیٹھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اپنی جھونپڑی..... رحموں کے ریڈیو سے گائے جانے فلمی گیت..... چولھے کی گرمی۔ اور بھی بہت سی باتیں جن میں اس کا حصّہ تھا۔

بازار لوگوں کی آوازوں سے بھرا پڑا تھا۔ گاڑیوں کی آوازیں۔ بچوں کی آوازیں..... شور جن میں انوکھی سی خوشی کی جھنکار تھی، لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ وہ رحموں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنوں کی خود غرضیوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ آنسوؤں کے گرتے قطرے اس کی بند آنکھوں سے بہہ کر اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے..... آنسو جیسے اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو کر باہر نکل رہا ہو۔

وہ بڑبڑا رہی تھی۔ "یہ دُنیا بڑی مطلبی ہے۔ سارے رشتے مطلبی!" اب اس کا کوئی بھی اپنا نہ تھا سوائے اپنے بچے کے..... اس رات وہ بہت مطمئن ہو کر ننگی زمین پر سوگئی۔

لمحے کی صلیب

یہ پچھتاووں کے اس لامتناہی جہنم زار کو میرے چند آنسو ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔ اور میں اکیلا کھڑا سوچ رہا ہوں۔ کیا خوشیوں کے وہ خنک سائے جن کی تلاش میں میں چلا تھا۔ شاید ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔ کیا سفر کا وہ لمحۂ آغاز پھر واپس نہیں آ سکتا۔ جس کو عبور کر کے میں اس جہنم زار میں داخل ہوا تھا۔ اور پھر طمانیت اور سچی خوشی کی جوت میرے پیچھے بجھ گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک میں اس اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر اس دروازے تک پہنچنا چاہا ہے۔ جو واپس روشنی اور اُجالے کو جاتا ہے، لیکن میرے سب طرف ایک مہیب سناٹا ہے..... کوئی دروازہ نہیں۔ کوئی روزن نہیں۔ میرے ہاتھ تو کسی دیوار کو بھی نہیں چھو رہے۔ میرا سارا کرب ایک چیخ بن جاتا ہے اور یہ تیز چیخ میرے اندر گونجتی رہتی ہے۔ کوئی راہ نہیں..... کوئی راہ نہیں..... راہیں کدھر گئیں..... روشنی کدھر گئی..... ..... کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں۔

میں نے بارہا خدا کو پکارنا چاہا ہے، لیکن مجھے لگتا ہے جیسے سیاہی اور سناٹے کے اُس پار بھی دہکتی آگ ہے۔ میرا سر بھاری ہو کر میرے کندھوں سے جھک کر میرے سینے پر ٹک جاتا ہے جھک کر اپنے خدا کو منانا چاہتا ہوں، لیکن میری ٹانگیں لوہے کی سلاخیں بن جاتی ہیں..... اور میری جبیں اس سجدے کی تڑپ سے دہکنے لگتی ہے جو میں کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔

میرے گھر کے باہر سناٹا ہے۔ اور کھیتوں کے اُوپر سرسراتی ہوا کی مدھم آواز ہے۔ گندم کے خوشوں کی غیر محسوس باس ہے اور مٹی کے ٹیلے سے بہت پرے جنگلی کتے بھونک رہے ہیں۔

میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور اس کا پردہ کھیتوں سے آتی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے۔ کالونی کے سارے گھروں میں خاموشی ہے۔ خاموشی کا طلسم انہیں اپنے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میری بیوی ابھی ابھی کسی معمولی سی بات پر چیخ چیخ کر مجھ سے لڑی تھی۔ اور جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے زور سے دروازہ کھولا اور پھر ہمیشہ کی طرح باہر چلی گئی۔ تیز تیز قدموں سے، بڑبڑاتی ہوئی ...... مجھے بھی ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے بھاگنا تھا۔ دبے قدموں بھاگتے ہوئے منتیں کرتے ہوئے ...... اور یہ یقین دلاتے ہوئے کہ میں آئندہ اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گا ......

میں نے اپنے بستر پر لیٹے اپنے بیٹے پر اچھی طرح چادر اڑھائی تھی اور گیلری کی بتی جلادی تھی کہ کہیں یہ اپنے آپ کو اکیلا پاکر ڈر نہ جائے۔ وہ کتنی پرسکون نیند سویا ہوا ہے۔ میں اس کی خوشی کے لیے دُعا مانگنا چاہتا ہوں ..... لیکن میرا اور خدا کا رشتہ تو نہ جانے کب سے ٹوٹ گیا ہے۔ میں کس سے دُعا کروں۔ اور پھر میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا تو نہ جانے کس طرح پچھتاووں کا ہجوم میری راہ میں حائل ہوگیا اور میں پتھر کی مانند اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا تھا۔

میں اُلٹے قدموں آکر اپنے بیٹے کے بستر پر بیٹھ گیا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔

میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرا بیٹا جاگ جائے تاکہ میرے اندر بڑھتی ویرانی اور سناٹے میں کوئی تو زندگی کی رمق پیدا ہو۔ کوئی تو میرا اپنا ہو۔ میں ڈر سے آہستہ آہستہ کانپ رہا ہوں سب کچھ کھو دینے کا ڈر۔

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا ہے اور میرا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہتا ہے۔ لیکن میں نے سسکیوں کو اپنے اندر دبا لیا ہے۔ میں کن کن محرومیوں پر آنسو بہاؤں۔ واپس جانے کی کوئی راہ نہیں۔

مَیں کس قدر تھک گیا ہوں۔ گذرے وقت کی ساری یادیں پتھر کی مانند میرے دل کو اپنے گھیرے میں لیے اسے بہیستی جا رہی ہیں۔

میرا بیٹا سو رہا ہے۔ اور دروازے کے باہر کُتّے بھونک رہے ہیں۔ میری بیوی اِس اندھیرے میں مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھ رہی ہو گی اور وہ بہت متعجّب ہو گی، لیکن وہ نہیں جانتی کہ مَیں نے آگے بڑھنے کی بجائے اپنے پیچھے آتی آوازوں سے ڈر کر مڑ کر دیکھا ہے اور مَیں پتھر کا بن گیا ہوں۔ کتّے بھونکتے ہی جا رہے ہیں۔ میرا اپنا وجود میرے دل میں پتھّر بن کر لٹک رہا ہے۔

دروازہ کھُلا ہے۔ لیکن سفر کا وہ لمحہ واپس نہیں آسکتا..... سفر کا وہ لمحہ جب مَیں نے بانو کو دیکھا تھا۔

مَیں ہوسٹل کے کمرے میں بیمار پڑا تھا، اور گھر سے دُور تھا۔ تیز بخار سے میرا جسم دہک رہا تھا۔ میرے رُوم میٹ محمود نے کہا تھا "سلمان کہو تو مَیں تمہارے گھر خط لکھ دُوں"؟ مَیں نے جلتی ہوئی بھاری آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اُسے منع کر دیا تھا۔ مَیں جانتا تھا کوئی بھی میرے پاس نہیں آسکتا.....

بھلا اِس سے کیا فائدہ۔ ابّا ہمیشہ کی طرح سرکاری دَورے پر ہوں گے۔ بڑے بھیّا نوکری پر اور چھوٹی بہنوں کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....

اور پھر جب مَیں نے دوبارہ آنکھیں کھولی تھیں، تو میرے نتھنوں میں عجیب سی بُو گھس گئی تھی..... میرے سامنے لمبی شیشوں والی کھڑکیاں تھیں۔ اور میرے اُوپر لال کمبل پڑا ہوا تھا محمود میرے بستر کے نزدیک پڑی کرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اس بُو نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا ...... اور مَیں گھر سے دُوری پر رونے لگا تھا۔ مجھے اُمّی اور بے بی یاد آ رہی تھیں..... میرا دل عجیب طرح سے دُکھ رہا تھا۔ جیسے مَیں ایک یتیم بچّہ تھا۔ لاوارث اور تنہا۔ اور ہسپتال کی خاموشی میرے دل میں اُتر آئی تھی۔ میرا سر دُکھ رہا تھا اور مجھے اپنی چھوٹی بہن بے بی کے نرم ہاتھ یاد آ رہے تھے جو گھر میں ہمیشہ میری تکلیف کا مداوا بن جاتے تھے۔ میں اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اتنی شِدّت سے بیمار پڑا تھا اور گھر سے میلوں دُور تھا۔ مَیں نے اپنا

جسم اُٹھایا اور پُشت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور میرے ہونٹوں پر آنسوؤں کی نمکینی پھیل رہی تھی۔

محمود نے جاگ کر کہا "بھئی تمہیں اس شدت کا بخار تھا کہ سوائے یہاں لانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ اتفاقاً یہ کمرہ آج ہی خالی ہوا ہے؛ ورنہ بڑی دشواری اُٹھانی پڑتی.... ارے تم روکیوں رہے ہو۔ بڑی پیاری پیاری نرسیں ہیں یار طبیعت بہل جائے گی" اور اُس نے مجھے مُسکرا کر آنکھ ماری تھی۔ میں نے رُومال سے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے..... اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اُڑ کر گھر چلا جاؤں اور پھر آنکھیں موندھ کر بستر پر لیٹ جاؤں اور بے بی دھیرے دھیرے میرا سر دبائے اور امّی قرآنی آیتیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکیں مارتی رہیں۔ پھر میں لیٹ گیا..... میرا سارا وجود ایک جلن کے ساتھ دُکھ رہا تھا۔

"اُٹھیے، دوائی پی لیجیے" نئی سی آواز سے چونک کر میں نے آنکھیں کھولیں تو نرس کا سانولا چہرہ سارے جذبات سے عاری میرے بستر کے نزدیک کھڑا تھا......

ارے یہ چہرہ کسقدر جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔ میں نے اسے پہلے بھی تو کہیں دیکھا ہے۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میں اس سے پہلے تو کبھی بھی ہسپتال نہیں آیا تھا..... لیکن میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ نرس نے میرا سر اوپر اُٹھایا اور کڑوی دوائی میرے حلق میں انڈیل دی اور پھر میرا درجہ حرارت نوٹ کر کے چلی گئی..... محمود نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ بچّہ تو نہ بنو۔ مت آنسو بہاؤ تم مرد ہو اور مرد کے لیے یہ بخار تو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

لیکن میں تو بچّہ تھا جو ماں کی گود کے لیے دل ہی دل میں مچل رہا تھا۔ میں نے آنسو رومال میں سمیٹ لیے لیکن نئے آنسو پھر میرے گالوں پر بہنے لگے...... لیکن میں نے مُسکرا کر محمود کو دیکھا تھا۔

اور پھر محمود بھی...... کچھ وقت کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ صبح سے بھُوکا تھا اور اس نے شیو بھی نہیں بنایا تھا۔ محمود کہنے لگا "یار ذرا ڈھنگ کا بنکر آؤں۔ نرسیں کیا سوچیں گی۔ کالج کے لڑکے اور اس قدر گنوار...." اس نے رومال سے اپنے جوتوں سے گرد جھاڑی اور چلا گیا۔

اس کی سیٹی کی خوشگوار دُھن مجھے کچھ دیر تک سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ شیشے کی بڑی کھڑکیوں کے سامنے لان میں سورج مکھی کے پھول کھلے تھے۔ پیپل کے گھنے درخت کے نیچے بنچ پر ایک بوڑھا مضمحل بیٹھا کوئی چیز کھا رہا تھا اور سرخ دُم والی بُلبل بینیزی کے ننھے خوب صورت پھولوں پر اُڑتے ہوئے چھوٹے پتنگوں کو پھدک پھدک کر پکڑ رہی تھی اور بڑی خوشگوار آواز سے کُٹ کُٹ کر رہی تھی ...... میں نے اپنی آنکھیں موند لیں تھیں۔ اور مجھے اُمّی یاد آ رہی تھی۔ میں نے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے پی لیا .... پھر کیا ہے .... بخار جلدی سے اُتر جائے گا ...... میں اتنا کیوں گھبرا رہا ہوں .... میں نے دل ہی میں یہ الفاظ دُہرائے اور چُپ چاپ لیٹ گیا۔ بوڑھا ابھی بھی اپنے پوپلے مُنہ سے کوئی چیز چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہسپتال سے جاتے وقت میں نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اپنے دل کے اندر ایک خلا سا محسوس کیا۔ میں نے آہستہ سے گلاب کے اس اکلوتے پھول کو اٹھا کر سونگھا تھا جو سسٹر بانو نے ڈولی پر گلاس میں سجایا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس پھول میں گلاب کی باس نہیں بلکہ بانو کے خلوص اور ہمدردی کی باس ہو۔

ایک روز اُس نے مجھے روتا دیکھ لیا تھا اور ہنس کر کہا تھا "واہ سلمان صاحب بھلا اتنا بڑا انسان روتا کبھی اچھا لگتا ہے۔ اگر میں آپ کو آئینہ دکھاؤں تو آپ اپنی رونی صورت دیکھ کر ہنس پڑیں گے۔ اور اس نے بڑی ہمدردی سے مجھے اُٹھا کر بٹھا دیا تھا اور بڑی اپنائیت سے تھرما میٹر میرے مُنہ میں دے کر مسکراتی رہی تھی۔ اس کے بازو کا سہارا لیے ایک دفعہ پھر مجھے احساس ہوا تھا کہ اس بازو کے لمس کو میں پہلے بھی جانتا ہوں اِس چہرے میں مجھے کسی اور چہرے کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور میں نے اس کے بازو کو پکڑ لیا تھا اور ایک معصوم بچے کی طرح اس کے ساتھ لگ گیا تھا۔ مجھے پھر امّی یاد آ رہی تھیں۔ ..... اور میں جو اپنی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو کر گھر میں خوب شور مچا دیا کرتا تھا...... .... اور ہائے ہائے کر کے سب بہن بھائیوں کو پریشان کر دیا تھا۔ کتنی ہی دیر اس کا بازو پکڑے چُپ چاپ بیٹھا کھڑکیوں سے باہر پیپل کے درخت کو دیکھتا رہا تھا.....

سسٹر کا لمس مجھے کیوں اس قدر سکون دے رہا ہے؟" میں نے آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر مجھے یکایک سسٹر کے چہرے میں اپنی بہن بے بی کی مشابہت نظر آئی۔ سسٹر کے ہنسنے کا انداز بالکل بے بی کی طرح تھا۔ اور اس کی آواز کی مٹھاس اور مہربانی بھی.... تو یہ بے بی تھی..... میں ہنس دیا.....

"سسٹر آپ میری بہن بنیں گی"..... میں نے اُس سے الگ ہو کر اس سے پُوچھا تھا۔ اس وقت میں پوری سچائی اور دیانتداری سے اُس سے بہن بننے کی درخواست کر رہا تھا۔ "سلمان صاحب میں آپ کی بہن ہی تو ہوں"..... سسٹر پھر مُسکرا دی اور مجھے بستر پر لٹا دیا۔ مجھے بے بی کا پیار یاد آ رہا تھا.....

"نہیں سسٹر میں آپ سے بہن بننے کا کہہ رہا ہوں۔ ویسی بہن جیسی بے بی ہے۔ ویسی بہن جیسی گُل ہے...... وہ دونوں مجھ سے لڑتی بھی ہیں اور مجھ سے پیار بھی کرتی ہیں۔ وہ میری چیزیں چُرا بھی لیتی ہیں، لیکن مانگنے پر اپنا حِصّہ مجھے دے بھی دیتی ہیں..... بالکل ویسی ہی بہن" مجھے یکایک لگا تھا جیسے میں بہت ہی تنہا ہوں۔ اپنے گھر سے دُور..... اپنی بہنوں سے ابّا سے اور بھائیوں کی شفقتوں سے محروم سا اور اس تمام تلخیوں سے مجھے سسٹر بانو بچا سکتی ہے۔ .....اور پھر اس کی ہنسی بے بی سے کس قدر ملتی ہے......اور میرا جسم کس قدر تپ رہا ہے۔
______ "کیوں نہیں سلمان صاحب کیوں نہیں" اور وہ اپنا ٹرے اُٹھا کر جلدی سے چلی گئی..... جیسے میری بات اُسے پسند نہ آئی ہو۔

"سسٹر اس بات کے متعلق سوچئے گا" میں نے اپنے سر کو ذرا سا اُٹھا کر زور سے کہا.... اور پھر تکیے کی نرمی میں میں نے اپنا چہرہ چھُپا دیا اور چپ چاپ لیٹا رہا..... گھر کی مہربان گود کو یاد کرتا ہوا۔

دُوسرے روز سسٹر بانو گلاب کے تازہ پھُول میرے جاگنے سے پہلے ہی شیشے کے گلاس میں سجا گئی تھی اور پاس ہی ایک چِٹ پڑی تھی۔

"بھیّا کے لیے.....اس کی بہن کی طرف سے"...... اتنے دنوں بعد میں پہلی بار مسکرایا تھا۔ ہسپتال کا وارڈ مجھے اتنا سُونا نہیں لگ رہا تھا اور میں لان میں کھِلے سُورج مکھی

کے بڑے بڑے پھول مجھے زندگی اور خوشی کی علامت لگ رہے تھے۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ میں نے چِٹ کو دوبارہ پڑھا اور اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ شاید کل والی بُلبل آج بھی ڈال ڈال پھُدک رہی تھی۔ اور چاندنی کے سفید پھول کیاری کیاری اُگے نئے سویرے کی نوید لگ رہے تھے۔ ایسا سویرا جس میں لاہور جیسے بڑے شہر میں گھر سے اِتنی دُوری کے باوجود میں خوش تھا۔ میں بے بی کو لکھوں گا کہ میں نے تمہارے لیے ایک نئی بہن بنا ڈالی ہے۔ میں نے دل ہی میں مُسکراتے ہوئے خط کی تحریر بنا ڈالی تھی...... حیات کی تمام خوبصورتیاں ایک لفظ میں ہی تو مجسّم ہیں۔

بعد کے دنوں میں سسٹر بانو شاید اپنے اندر چھپی تمام مہربانی اور خلوص کو میرے کام کرنے میں سمو دیتی تھی...... اُس کے ہاتھوں کا لمس مجھے سکون دیتا۔ میں اس کے سانولے چہرے میں بے بی کو مُسکراتے پایا۔ اُس کے ہاتھ جب میرے سر کو دباتے ہوئے میرے بالوں میں اُلجھ جاتے تو میں ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا۔ سسٹر آپ ہسپتال کی سسٹر نہیں ہیں بلکہ سلمان ملک کی بہن ہیں۔ آپ میری بہن ہیں نا" میں دوبارہ یقین دہانی کے لیے اس سے پوچھتا اور وہ خاموشی سے مُسکر میرا بستر ٹھیک کر کے بڑے کو تھامے چل پڑتی۔ دروازے کو بند کرتے ہوئے وہ پھر مڑ کر دیکھتی اور اُس کے سانولے چہرے کی جوت مجھے بہت ہی اچھی لگتی...... بے بی کی طرح...... اپنی سی..... بالکل اپنی ہی..... جس دن مجھے ہسپتال سے جانا تھا سسٹر بانو کی ڈیوٹی رات کی تھی۔ اور میں نے جاتے ہوتے بے چینی سی محسوس کی تھی۔ محمود نے تو ایک روز کہا تھا..... "سلمان یہ سسٹر بانو تم پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتی ہے، کیا بات ہے؟" اور اُس نے حسبِ عادت پھر آنکھ ماری تھی..... شرارت سے۔

میں نے مُسکرانا چاہا تھا، لیکن میرا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ میں اُس کو کس طرح سمجھاتا کہ بہنوں کے بارے میں اس طرح بات نہیں کیا کرتے۔ میں اس کو قائل بھی کیوں کرتا کہیں بہنوں کی پاکیزگی اور ان کے رشتے کی سچائی کے متعلق بھی بحث کی جاتی ہے۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز کو نرم بناتے ہوئے کہا تھا" محمود ایسی کوئی فضول بات نہ کرنا، وہ میری بہن ہے" محمود نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر چُپ ہو گیا....

اور پھر میں کندھے پر اپنا بیگ ۔ ڈالے ہسپتال کے صاف ستھرے برآمدوں سے دبے قدموں گذرتا باہر آگیا تھا۔ میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا...... لان میں کھڑے ہو کر میں نے سب طرف نظریں دوڑائیں ...... سامنے برگد کے بوڑھے درخت پر چڑیوں کی مسلسل چہکار تھی ...... رنگ برنگ کے پھول کیاریوں میں لگے تھے ..... میں سسٹر کے ہوسٹل جاکر اس سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر میں نے کسی مریض کو اُتارتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے گلاب کو ایکبار پھر سونگھا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر بانو یہاں میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ میں نے مڑکر ہسپتال کی عمارت کو دیکھا۔ ٹیکسی موڑ مڑ رہی تھی اور عمارت میری نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی ...... میں نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کے ساتھ سر لگا دیا ..... اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پھول کو چھُو لیا۔ اور مجھے لگا تھا جیسے میں ایک بار پھر اُس کے بازو سے لگا پوچھ رہا ہوں "کیوں سسٹر بانو آپ میری بہن بنیں گی نا"

مجھے سب باتوں سے زیادہ بانو یاد آرہی تھی۔ صرف سسٹر بانو۔

ہوسٹل کے کمرے میں لیٹے جب رات کا سناٹا بڑے سے صحن میں لگی باڑ کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور محمود ٹیبل لیمپ کو بُجھا کر سو جاتا تو میں بستر پر لیٹے اپنے سرہانے کھلی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگتا۔ اور دُور سڑک سے گذرتی کاروں، ٹرکوں اور ٹیکسیوں کا شور سُنتے ہوئے بہت سی باتیں یاد کرنے لگتا بے ربط یادیں جو خواہ مخواہ میرے ذہن میں گھُس آتیں۔ مجھے امّی کی محبت کی کمی محسوس ہوتی اور پھر ان یادوں کے ہجوم سے اُبھرتا سسٹر بانو کا چہرہ جھانکتا ...... اور پھر ہسپتال کا کمرہ۔ اس میں میرے سرہانے لٹکا ہوا چارٹ، بستر کے پاس پڑی ڈولی اور لال کمبل یاد آجاتا اور شیشے کے گلاس میں سجے پھول .... تب میرے ذہن میں بے بی گل اور بانو کے نام ترتیب سے آتے اور میں مُسکرا کر کروٹ بدل لیتا اور پھر کھڑکی سے جھانکتا آسمان میری پُشت پر چھُپ جاتا..... سوتے ہوئے بے بی اور گل کے چہرے مدھم کہیں میرے ذہن میں ٹمٹماتے لیکن بانو کا چہرہ روشن اور بڑا ہو جاتا اور میری آنکھوں میں میں چھا جاتا اور پھر میں نہ جانے کب سوتا۔

میں بانو سے ملنا چاہتا تھا لیکن میرے اندر کی جھجک مجھے ایسا نہ کرنے دیتی۔ اگر اُس

نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا تو ...... میں اس سے پہلے کبھی کسی ہوسٹل نہیں گیا تھا... ..... اور میری یہ ناتجربہ کاری میری راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتی۔

اُس روز میں چند دن کی چھٹیوں کی وجہ سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا، اس لیے انار کلی بازار گیا تھا۔ سب گھر والوں کے لیے ننھے ننھے تحفے خریدنے...... وہاں بانو اپنی سہیلی کے ساتھ ایک دُوکان پر کھڑی کوئی چیز خرید رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی، جیسے اتنے دنوں سے میں اپنی ایک کھوئی چیز کی کھوج میں تھا اور وہ چیز اچانک ہی مل جائے...... بے انداز خوشی لیے۔

"سسٹر بانو۔" میں نے سائیکل سے اُتر کر اُسے پکارا..... اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ میں نے سوچا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنائیت سے مُسکرا دے گی، لیکن وہ اجنبی اجنبی سی وہاں کھڑی میری طرف دیکھتی رہی..... میرے دل سے ساری خوشی جیسے ایکدم ہی کسی نے نکال دی ہو.. میرا چہرہ اُتر گیا تھا۔

"سسٹر بانو کیا آپ مجھے نہیں جانتیں..... میں سلمان ہوں۔" میں نے تذبذب سے اپنا نام دُہرایا......

وہ ہلکا سا مُسکرا دی..... لیکن پھر بھی یہ وہ مُسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ مُسکراہٹ جو میرا سَر دباتے۔ میرا بستر دُرست کرتے اس کے سانولے چہرے پر چھائی رہتی تھی..... مجھے لگا جیسے میں لیٹا ہوں اور وہ شیشے کے گلاس میں اکیلے پھُول کی مانند ڈولی پر دھری ہے اور میں اسے پکڑ کر سونگھ رہا ہوں.... شرم، رنج اور غصّے سے میں نے تیز لہجے میں کہا:

"کمال ہے سسٹر۔ آپ لوگوں کو چند ماہ میں ہی بھُول جاتی ہیں۔ آپ بھائی بناتی ہیں اور بھائی ملے تو آپ اِسے مُسکرا کر خوش آمدید بھی نہیں کہتیں۔"

ہم تینوں ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے..... مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تیزی سے سائیکل چلاتا اس بازار کی گہما گہمی سے غائب ہو جاؤں اور اپنے کمرے میں جا کر خوب روؤں.... کیا کل کو بے بی اور گل بھی مجھے نہیں پہچانیں گی..... میرا جذباتی دل دُکھ اور شرم سے بھاری ہو گیا تھا، لیکن

لیکن پھر بھی میں وہاں کھڑا رہا ..... اور بانو کی کشش کو محسوس کرتے ہوئے میرے قدم بھاری ہو گئے ..... خدا کرے بانو کو میں یاد آ جاؤں۔ میں نے ساکت لبوں سے دُعا مانگی میں اپنے جذباتی پن پر شرمندہ بھی تھا۔

"اچھا سلمان بھائی اب میں چلتی ہوں ..... مجھے دیر ہو رہی ہے" کچھ دیر کھڑی رہ کر وہ دونوں چلی گئیں۔ جاتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"سسٹر بانو کیا میں آپ کے ہوسٹل آپ سے ملنے آ سکتا ہوں ....." میں پھر ایک بچے کی طرح اُمید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں ایک بار پھر سسٹر بانو کی مہربانی کی کھوج میں تھا۔ نہ جانے کیوں ---کیوں نہیں ..... آپ ضرور آیئے" اس کی آواز میں ایک دُکھاپن تھا۔ جس کو میں محسوس کر کے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا ..... میں اتنے بڑے شہر میں اکیلا تھا اور خوش نہیں تھا۔ میں ان دونوں کو بازار کی بھیڑ میں گم ہوتا دیکھتا رہا .... لوگوں کے ہجوم میں چلتا، میں نہ جانے کیوں رنجیدہ تھا ؛ حالانکہ بہنوں کی محبت بھائیوں کی زندگی میں کوئی اہم بات نہیں ہوتی ..... وہ تو کبھی بھی اس محبت کے سحر میں گرفتار نہیں ہوتے اور جب وہ بیاہ کر چلی جاتیں ہیں تو تب بھی بھائی ان کی کمی محسوس نہیں کرتے۔ تو کیا میں نے سسٹر بانو کو بہن نہیں بنایا ..... ؟ میں ایک مجرم کی طرح اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے نہیں دھڑکا تھا۔ میں اس سے کوئی شدید جذباتی لگاؤ استوار ہوتے نہیں پا رہا تھا۔ پھر بھی دل کے اندر کہیں ایک کسک تھی جو مختلف اور الگ تھی۔ جو بے بی گل اور امی کے ناموں سے وابستہ نہیں تھی ....." میں اتنا جذباتی کیوں ہوں۔ یہ کسک کیوں ہے۔ میں اتنے بڑے ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا کیوں پا رہا ہوں" ..... میں واپس ہوسٹل آ گیا۔ بغیر کچھ خریدے، بجھے دل کے ساتھ میں نے بیگ میں چند چیزیں ڈالیں اور اسٹیشن چلا آیا۔ کمال ہے سسٹر بانو مجھے پوری طرح پہچانی نہیں۔ میں بار بار اپنے سے یہ بات دہراتا اور شرم اور غصے سے زرد ہوتا رہا۔ کمال ہے بھئی۔ کمال ہے .....

ہوسٹل کے ویزیٹنگ روم میں آتشدان میں آگ دہک رہی تھی اور سُرخ سُرخ شعلے لپٹوں کی صورت میں اُمڈ رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے اور بڑا سا

کلاک انگیٹھی کے اوپر لگا ٹک ٹک کر رہا تھا۔ میں نے آتشدان کے پاس بیٹھ کر اپنے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو آگ کی گرمی سے تپانے کے لیے کوٹ کی جیبوں سے نکالا اور آگ تاپنے لگا۔ کھلے دروازے کے باہر چھوٹا سا لان تھا۔ اور شام کے سامنے بادلوں کی نمی کے ساتھ مل کر بہت اُداسی پیدا کر رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی سُرخی افق پر لالی پیدا کر رہی تھی۔ اور پیلی دھوپ کی آخری کرنیں لان کے کونے میں پڑ رہی تھیں۔

میں تذبذب سے کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ میں سسٹر بالو سے ملنے کی شدید خواہش کو دبا نہیں سکا تھا۔ پچھلے دو تین مہینوں میں میں نے اَن گنت بار اُسے یاد کیا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ گھر کی یاد کے ساتھ میرے دماغ میں چلا آتا اور پھر میں جذباتی طور پر گھر سے اپنے آپ کو دور پا کر خوش نہیں رہتا تھا۔ اُس اپنائیت کی خواہش میں جو صرف انسان کو گھر کی چار دیواری کے اندر میسّر آتی ہے، اسکو یاد کیے جاتا۔ اور اُن مہربان ہاتھوں کا لمس پھر مجھے یاد آ جاتا جو میرے بالوں سے سرائت کرتا میرے دل میں اُتر آتا تھا اور میں خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔

میں لڑکوں کے رومان بھرے قصّوں میں حصّہ نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ میں تو محبّت جیسے کسی جذبے سے آشنا نہیں تھا۔ میری محبّت کی تکمیل تو میرے بہن بھائیوں کی ذات سے تھی اور میں اپنے دل میں کوئی کمی نہیں پا رہا تھا۔ میں لڑکوں سے مل کر سستی شراب نہیں پی سکتا تھا، کیونکہ امّی کا اعتماد ایک چٹان کی مانند میری سوچوں میں حائل ہو جاتا اور میں ان کو چوری چوری پیتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ جاتا۔ اور دل ہی دل میں ان کی آوارگی پر کُڑھتا۔ ان کے گندے خیالات سے نفرت کرنے لگتا۔ ان کے دل پاکیزہ کیوں نہیں ہیں یہ اتنی گھٹیا باتیں کیوں کرتے ہیں" میں نفرت سے سوچتا اور اپنے کسی کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس لیے ہی تو میرا دل پورا سال گذرنے پر بھی وہاں کے ماحول سے مانوس نہیں تھا۔ میرے دل میں ہر لمحہ شدید خواہش پیدا ہوتی کہ میں گھر چلا جاؤں...... مجھے لاہور کی رنگینی اپنے اندر جذب نہیں کر سکی تھی۔ لاہور جس کو دیکھنے کی خواہش اپنے شہر میں اتنی زیادہ تھی اب اپنی کشش کھو چکی تھی۔ اور میں سارے ہنگاموں کے باوجود خود کو تنہا تنہا اور اُداس

ہی پاتا تھا۔

رات میرے سَر میں پھر شدید درد اُٹھا تھا۔ لگاتار پڑھائی سے تھک کر مَیں نے اپنا سَر تکیہ پر رکھا ہی تھا کہ درد کی تیز ٹیس میری کنپٹیوں سے اُٹھ کر میرے سَر میں بھر گئی اور پھر مجھے سسٹر بانو یاد آ گئی۔ اگلی صبح سے ہی شام کا انتظار کرنے لگا۔ اور مَیں سُرخ شعلوں کو دیکھ سسٹر بانو کا انتظار کر رہا تھا...... کوئی دُوسرا ملاقاتی کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اِس بات سے مَیں خوش تھا۔

اور پھر سسٹر بانو خاموشی سے آ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی...... مَیں اس کے روّیے کو دیکھ کر ایکبار پھر دل میں شرمندہ ہوا تھا...... مَیں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ۔سلمان ملک تم جو دو بہنوں کے بھائی ہو۔ کس چیز کی تلاش میں یہاں آتے ہو۔ تمہیں اگر خلوص اور محبت کی تلاش تھی، تو تمہیں اپنے گھر جانا چاہیئے تھا..... تم ایسی غلطیاں کیوں کر رہے ہو..... لیکن آنیوالے حادثات اس گھڑی سے بندھے میرے مقدّر ہو چکے تھے۔" بیٹھئے سلمان بھائی......" وہ آہستہ سے بولی۔ مَیں چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ مَیں کیا کہنے آیا تھا۔ مَیں کیا کرنے آیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مَیں بات کہاں سے شروع کروں اور کیا کہوں۔

"مجھ سے کیا کام ہے آپ کو....." شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اُسے مجھ سے کِس لہجے میں بات کرنی چاہیئے۔ اُس کے انداز میں ایک جھجک تھی۔

"سسٹر آپ کا یہ اجنبی روّیہ مجھے سخت تکلیف دے رہا ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو جب مَیں یہاں پر تھا، تو مَیں نے آپ کو بہن بنایا تھا اور آپ نے بھی اِس رشتے کو قبول کیا تھا۔ کیا ایک بھائی بہن کو ملنے نہیں آ سکتا" رنج اور غصّے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے لگ رہا تھا۔ جیسے مَیں دُنیا میں تنہا ہوں اور میرا کوئی بھی تو نہیں۔

"سلمان بھائی ہمارا پیشہ ہم سے مریضوں سے ہمدردی اور خلوص کا تقاضا کرتا ہے۔ مَیں نے جو کچھ کیا ہو گا۔ اپنی ذمہ داری کے تحت کیا ہو گا" سسٹر بانو تیزی سے بولی۔ اس کی آواز تلخ تھی۔

"سسٹر بانو میں اکیلا اور اُداس تھا سوچا بہن کو مل آؤں" اس سے زیادہ میں اور کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا۔ مجھے بے بی اور گل یاد آ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے دُور تھیں۔ میں نے سوچا کم از کم ایک بہن تو یہاں پر ہے"۔ میرے گلے میں کوئی چیز اٹک رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ آتشدان میں شعلوں کا رقص جاری تھا۔ کھلے دروازے کے باہر چھوٹا سا لان تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ میرا دل جذبات سے بھاری ہو رہا تھا۔

میں نے باتوں کا رُخ خود نہیں موڑا تھا، لیکن پھر بھی میں وہاں بیٹھا اِسے اپنی بہنوں، بھائیوں اور امّی آبا کی باتیں بنانے لگا۔ اور ہمارے درمیان اپنائیت کا رشتہ استوار ہو گیا۔

جب میں نے ہوسٹل کے گیٹ سے باہر قدم رکھا، تو چپراسی اپنے بنچ پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ اور گیٹ کے باہر کوکا کولا کا اسٹال بالکل اُجاڑ ہو چکا تھا۔ چند آوارہ کتے اسٹال کے تختے کے نیچے ایک دُوسرے سے سکڑ کر لگے سو رہے تھے۔ اور دریا کی طرف سے آتی ہوا خون کو منجمد کر رہی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ گھر کی یاد میں وہ تلخی نہ رہی۔ میں اور سسٹر بانو اکثر سیر کے لیے چلے جاتے..... میں گھر سے آتے پیسوں سے اُس کے لیے تحفے خریدتا..... اُس سے ملے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ میں ہوسٹل میں اس کی دُوسری سہیلیوں کے ساتھ گپیں مارتا۔ ان کو کوکا کولا پلاتا۔ یہ اُن کا حق تھا کیونکہ بانو کا بھائی ہی تو تھا میں۔ اس لیے ہی تو وہ میرے ساتھ ہر جگہ آ جا سکتی تھی۔ اتوار کی صبح وہ میرے ہوسٹل آ جاتی اور پھر ہم دونوں ملکر مزیدار کھانے پکاتے..... دوپہر کو فلم دیکھتے اور معمولی معمولی بات پر مِل کر قہقہے لگاتے۔ اور رات پڑے میں اسے ہوسٹل چھوڑ آتا۔

لاہور کی وسعت میرے لیے اس کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ امّی کا خط آتا کہ میں اتنے اتوار گذرنے کے باوجود بھی نہیں آیا ہوں۔ تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی اجنبی جگہ جانے پر گھبرا رہا ہوں۔ جیسے بانو اور میں اپنائیت کے جذبوں سے بندھے بہت اُونچے اُڑ رہے ہوں۔ اس محبّت میں جلن نہیں تھی۔ اس محبت کی پاکیزگی میں دُوری نہیں تھی۔ میں جب بھی چاہتا اس کے سانولے چہرے کو اپنے نزدیک کر سکتا۔ اُس کو ڈھیروں پیار کر سکتا تھا۔ اُسکو

اپنے دونوں بازوؤں میں تھام کر بیٹھ سکتا تھا۔ اس کو لے کر کہیں بھی جا سکتا تھا۔ اُس کی سہیلیوں کو کیا اعتراض تھا۔ اس کی وارڈن کو کیا شک ہو سکتا تھا۔ میں تو اس کا بھائی تھا۔ سگا تھا........

لیکن اس شک کے ناگ نے میرے اپنے گھر میں سر اُٹھایا تھا۔ میں اُسے لے کر جب گھر پہنچا ہوں، تو اُمی نے عجیب نامہربان نظروں سے اُسے دیکھا اور بے بی جب کالج سے آئی، تو اس نے حیرانی سے اپنی آنکھیں کھول کر بانو کو دیکھا۔ اور گل چپ چاپ ڈرائنگ روم میں صوفے پر اُس کے ساتھ بیٹھی اپنے ناخنوں کو بلاوجہ کریدتی رہی تھی اور ان سب کے درمیان میں پریشان اور حیران کھڑا تھا۔ یہ سب لوگ جو میرے اپنے ہیں کیوں بانو کو اسی طرح نہیں سمجھتے جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ کیوں اُس پاکیزگی کو نہیں دیکھتے جس طرح میں محسوس کرتا ہوں۔ یہ میرے دل میں جھانکنے کی کیوں طاقت نہیں رکھتے تاکہ اس پیار کو دیکھ لیں جسکو سوائے بہن کے پیار کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اور جب دوپہر میں اُمی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو میں ان کے چہرے پر چھائی سنجیدہ سوچوں کو دیکھ کر ڈر گیا۔ "بیٹے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں"..... اُمی کی آواز میں نہ جانے کس بات کی محرومی تھی۔

"پوچھئے اُمی"..... میں نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا اور میرا اس بات پر بھی یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ بھی اُس سچائی کو تسلیم کریں گی۔ بے بی اور گُل دونوں خاموش کھڑی رہیں تھیں۔

"بانو کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے ـــ؟" اُمی مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھیں۔

"بے بی اور گُل کے ساتھ جو تعلق ہے وہی بانو کے ساتھ ہے۔" میں نہ جانے ایک دم کیوں غصے میں آ گیا تھا۔

اُمی کا چہرہ اندرونی غصے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئیں۔ اور غصے سے بولی تھیں۔

"تم اپنی بہنوں کی بے عزتی کر رہے ہو۔ ہوش سے بولو۔" بانو اور تمہاری بہنوں کا کیا مقابلہ

مجھے اِس لڑکی کے طور اطوار اچھے نہیں لگے۔ کوئی کس طرح ایک غیر مرد کے ساتھ اتنی دُور آ سکتا ہے۔ کیا تم بے بی اور گل کو ایسا کرنے کی اجازت دو گے۔"

بے بی جو اس عرصہ میں چپ کھڑی تھی، تیزی سے بولی "کیا تم نے کبھی ہمیں بھی اتنا پیار کیا ہے، جتنا تم اسے کر رہے ہو۔ ابھی کمرے میں بیٹھے ہوتے۔" اس کی آواز میں بے یقینی اور نفرت تھی......

"بکواس بند کرو۔ وہ میری بہن ہے۔ بہن ہے..... بہن ہے" میں اپنے گلے کی پوری قوت سے چلایا۔ "ہاں میں اُسے پیار کر رہا تھا۔ مجھے کوئی شرم نہیں آتی، کیونکہ وہ میری بہن ہے اور میں اسے پیار کر سکتا ہوں...... اکیلے میں۔ تمہارے سامنے۔ سب کے سامنے اور میں اسے پیار کروں گا۔ ہمیشہ کروں گا...."

گل طنز سے ہنسی تھی اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تھی۔ باہر پختہ صحن دُھوپ کی تیزی سے چمک رہا تھا اور روشندان میں ایک چڑیا بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ اس کا منہ کھُلا تھا، تپش اور گرمی کے مارے۔

اُمّی اب بھی کھڑی تھیں...... "اُمّی آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، وہ مجھے بے بی اور گل ہی کی طرح پیاری ہے۔ اُمّی وہ بڑی پیاری بہن ہے۔ اس نے بیماری میں میرا اتنا خیال کیا۔ وہ ہوسٹل آکر میرے کپڑے دُھوتی ہے۔ میرا بستر بچھاتی ہے۔ میرے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتی ہے۔ میں اسے بہن نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔"

"اور اس کے بدلے میں تم اُسے جگہ جگہ لیے پھرتے ہو۔ گھر سے زیادہ پیسوں کا مطالبہ کرتے ہو، تاکہ اسے سیر کرواسکو، تاکہ اسے تحفے خرید کر دے سکو۔" اُمّی جیسے تھک کر پلنگ پر بیٹھ گئیں تھیں۔

میں خاموش تھا، لیکن ایک ننھے مُنے شک کے ناگ نے میرے اندر سر اُٹھایا تھا۔ ..... بانو کے ساتھ میرا شدید لگاؤ ...... کیا یہ بہن ہونے کے ناطے ہے۔ میرا دل اس شک کے باوجود پُرسکون تھا...... "وہ ایک معمولی نرس ہے اور تمہارے پیسوں سے عیش کر رہی ہے اور تمہیں اپنے قبضے میں لے کر شادی کرے گی۔ وہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کرے گی۔"

امّی کی آواز میں زہریلا طنز صاف عیاں تھا۔

مَیں شرم اور طیش سے جل اُٹھا اور دُوسرے لمحے میَں نے الماری میں پڑے قرآن شریف کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا..... مَیں ان کو یقین دلوانا چاہتا تھا۔ پختہ یقین۔ ایسا یقین جو میں اپنے پر کرتا تھا۔ ایسا یقین جو بانو مجھ پر کرتی تھی۔ امّی نے حیران ہوکر مجھے دیکھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی بس مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ اور پھر اُنھوں نے آگے بڑھ کر قرآن شریف کو میرے ہاتھوں سے اُٹھاکر بےبی کو پکڑا دیا اور سَر اپنے ساتھ لگاکر کہا تھا۔

"میرے بچے خدا تمہاری معصُومیت کی حفاظت کرے۔ خدا تمہیں شیطان کے شر سے بچائے۔" اُنھوں نے میرے سر کو چُوم لیا تھا۔

اور میَں ان کے ساتھ لگا روتے ہوئے کہہ رہا تھا "امّی آپ یقین کریں وہ میری بہن ہے، بالکل گُل اور بے بی کی طرح۔" مَیں جو اس خوبصورت راز کو پورا ایک سال اکیلا ہی اُٹھائے اُٹھائے تھک گیا تھا۔ دُوسروں سے بانٹ کر بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مَیں نے بانو کا اس کا مقام دے دیا تھا۔ مَیں نے بانو کو اُن ناموں کی قطار میں سب سے پہلے لکھ لیا تھا جو مجھے ساری دُنیا سے عزیز لگتے تھے۔ جن کو کھونے کا تصوّر ہی میرے جیسے جذباتی آدمی کو موت سے کم نہیں لگتا تھا..... سُورج چمک رہا تھا اور میَں نے چمک سے گھبراکر اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور امّی کے سینے سے لگا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ بانو میری سوچوں اور زندگی پر قابض ہوگئی، اور میَں اُس ننھّے سے خیال کو اپنے اندر ہی دبا دیتا جو کبھی کبھی رات کے سنّاٹے میں میرے دل میں اُبھر آتا۔ اور میں ہوسٹل کے کمرے میں لیٹا لیٹا یوُں چونک کر جاگ جاتا جیسے کوئی ناگ مجھے ڈسنے کے لیے بڑھ رہا ہو۔ اور میَں اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔

نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے..... مَیں خوفزدہ ہوکر اپنے آپ سے پوچھتا..... بانو نے اگر مجھے چھُوا تھا تو اس میں ایسی کونسی انوکھی بات تھی..... ہم تو دونوں کتنی ہی دیر ایک دُوسرے کی باہنوں میں باہنیں ڈالے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کتنی چاہت سے اپنا سَر میری گود میں رکھ کر لیٹ جاتی اور میَں اُسے ڈھیروں ہی پیار کر ڈالتا۔ اور اس تمام خوف یا گناہ کا ہلکا سا

سایہ بھی ہمارے دلوں میں نہ اُترنا مجھے رشتے کی سچائی پر پختہ یقین تھا۔
لیکن پچھلے چند دنوں سے مجھے بانو کے لمس میں ایک انوکھی سی لذت کا احساس ہوتا۔ ایسا احساس جو مجھے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا سر جب میری گود میں ہوتا تو میں ایکدم اندر سے تن جاتا۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کام کے بہانے سے اُٹھ جاتا۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے میں اُس کو پھر اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر چُپ چاپ چارپائی کے کنارے بیٹھ کر اس کے سانولے چہرے کو دیکھنے لگتا۔ وہ بالکل خوبصورت نہیں تھی، لیکن میرے لیے اُس سے دل کش چہرہ اور کوئی نہ ہوتا۔ اس کی ہنسی سے مترنم ساز دُنیا میں ———— اس سے پہلے کوئی تخلیق ہوا تھا...... وہ تو میری ساری کائنات تھی۔ میری زندگی کا حاصل بنتی جا رہی تھی۔
گُل اور بے بی کے چہرے اب اس لائن میں میرے ذہن میں ایستادہ نہیں تھے۔ وہ سب لوگ جو مجھے اب بھی پیارے تھے۔ کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ اور ساری فضا صرف بانو کی ہنسی سے گونجتی تھی۔ اور میں اُسے سنتا رہتا۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں گناہ کے سائے سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا اور جب مجھے کسی طور چین نہ آتا، تو مجھے لگتا جیسے اُمّی میرا سر اپنے ساتھ لگائے کہہ رہی ہوں "میرے بچے خدا تمہاری معصومیت کی حفاظت کرے۔ خدا تمہیں شیطان کے شر سے بچائے"
لیکن یہ شیطان میرے اندر کہیں مسکراتا رہتا۔ اور میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ جاتا اور کھڑا ان تاروں کو دیکھتا جو میرے سامنے ٹمٹماتے رہتے۔ ہوسٹل کے وسیع برآمدوں میں خاموشی ہوتی اور اَن گنت دروازے بند ہوتے۔ اَن گنت روشنیاں بجھی ہوتیں۔ اور میں بے چین ہو کر اس پراگندہ خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا۔ لیکن یہ خیال ہزار پائے کی طرح اور بھی سختی سے میرے ذہن کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا اور میں اس سے کوئی فرار نہ پا کر وضو کرتا اور ساکت لبوں اور ساکت لبوں سے جانماز پر کھڑا رہتا۔ اور پھر مجھے پتہ چلتا کہ اس تمام عرصہ میں میں نے کوئی دُعا نہیں مانگی۔ میں تو بس بانو کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس کو یاد کرتا رہا تھا۔ اس کے جسم کی سوچ میں اُلجھا رہا تھا۔
میں اپنے اندر پرورش پاتے گناہ سے خائف تھا اور مجھے اس سے چھٹکارا پانے کی ایک

ہی راہ نظر آتی تھی۔ اور وہ عبادت کی راہ ہی تھی۔ میں پانچوں وقت ہوسٹل کی مسجد میں جانے لگا۔
اور صبح تلاوت بھی کرتا، لیکن میری آنکھیں کہیں اور ہی دیکھ رہی ہوتیں۔ سجدے میں پڑا
میں اور ہی یادوں میں گم ہو جاتا..... روشنی اور پاکیزگی کی پگڈنڈی میرے قدموں تلے سے مٹتی
جا رہی تھی۔ خدایا مجھے نیکی کی راہ دکھا۔ مجھے آنیوالے گناہ سے بچالے۔ میں خدا سے گڑگڑا کر
دُعا مانگنا چاہتا، لیکن الفاظ ہمیشہ کی طرح میرے لبوں پر بے جان ہو کر لٹک جاتے اور پھر
میں مایوسی سے واپس آجاتا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر سوچتا کہ میں بانو سے ملنے کبھی
نہیں جاؤں گا، لیکن جیسے ہی وقت نزدیک آتا میرے قدم بے اختیار ہو کر اُس راہ پر چل
پڑتے، اُس راہ پر جس راہ پر گناہوں کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور پھر میرا سراتی کے سینے سے
علیحدہ ہو جاتا اور صرف بانو کی یاد میرے شعور اور لاشعور پر قبضہ کر کے مجھے بے بس کر دیتی۔
میں خیالوں کی تیز چھری سے اپنے آپ کو کاٹتا رہتا اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں بانو
کو اس میں حصّہ دار نہیں بنا سکتا۔ بانو کے روٹھ جانے کا تصوّر ہی میرے لیے جان لیوا تھا۔
میں اُسے کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جتنی یہ حقیقت تلخ تھی، اتنی ہی سچی بھی تھی — اور میں
ویزیٹنگ رُوم میں اُس کی راہ تکتا اور اگر اُسے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو شک وشبہ کا نیا کیڑا میرے
ذہن میں رینگنے لگتا۔ وہ اتنی دیر کیوں لگا رہی ہے۔ اُسے میری پرواہ نہیں.... میرا دل
بے چین ہو اُٹھتا۔ اور اس کے آنے پر میں اُس سے خواہ مخواہ ہی لڑنے لگتا۔
اور اُس کے ساتھ آئی اس کی سہیلی مارتھا کہتی..... "کتنی خوش قسمت ہو بانو تمہارا بھائی
تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے.... تم بڑی نصیبوں والی ہو...." بانو مسکرا کر میری طرف دیکھتی اور
میں جلدی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آتا..... اور پھر ایسا ہوتا کہ میں کہیں اور جگہ
جانے کے بجائے اُسے اپنے کمرے میں لے آتا۔ اور پھر وہ میرے بازوؤں کو تھام کر مجھے
دیکھنے لگتی..... اس کی آنکھوں میں ایک سایہ سا ہوتا۔ ایک خواہش سی ہوتی....
..... لیکن میں اُس خواہش کو کوئی نام دیتے ڈرتا تھا..... کیا معلوم میں ہی کوئی غلطی کر جاؤں۔
کیا پتہ بانو ایسا نہ سوچتی ہو۔ اور میں اسے کیوں کر کھو سکتا تھا..... اس کے چلے جانے یا کھو
جانے کا خیال میری برداشت سے پرے لگتا تھا۔ ساری دُنیا مٹتی جا رہی تھی.... بس میں اور

بانو زندہ تھے .... اور میرا دل پُوری طاقت سے اس کو اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا تھا۔
اُمّی کیا کہیں گی ..... سب گھر والے کیا کہیں گے ..... کیا کہیں گے۔ اور یہ دُنیا....
جو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور میں رات گئے اپنے بستر پر لیٹا جاگتا رہتا اور اپنی بند
آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتا ..... جس پر صرف بانو کا سایہ رہتا تھا۔ اور پھر مجھے لگتا کہ
بزدلی کے مارے میں اپنے دل کی اصلی حالت بھی اپنے پر عیاں کرتے ڈرتا ہوں ....
. . . . میں ان عجیب اور انوکھے خیالات سے ڈرتا
ہوں۔ جنھوں نے میرے سارے وجود پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے ...
..... ایسا نہیں ہونا چاہیے ..... میں سوچوں کے بھنور میں گھرا اُبھرتا ڈوبتا رہتا ...... میرا
دل بزدلی کے بوجھ سے اندر ہی اندر پستا رہتا ..... گھر والے کیا کہیں گے .... کیا کہیں گے۔
..... مجھے کوئی راہ اپنانی ہی پڑے گی جس سے میں اپنی ماں کے سامنے شرمندگی سے بچ سکوں
...... اور مجھے گُل کی طنزیہ ہنسی یاد آجاتی ..... مجھے ننھی کی آنکھوں کا شک یاد آجاتا .....
... اور اُمّی کی بات کہ میں اپنی بہنوں کی بے عزّتی کر رہا ہوں ..... لیکن ان تمام سوچوں کے
باوجود میں بے انتہا خوش تھا .... اور میرا دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ اسی خوشی کی لہروں پر
ڈولتا رہتا ہوں .... بہتا رہوں ..... بانو کے ساتھ ان سوچوں کی راہ پر مارتھا ایک امید
بن کر اُبھری ...... میں نے سوچا تھا ہو سکتا ہے جو شک اور امید و بیم کے پاٹوں میں
پس رہا ہوں۔ ایک راہ ہو جاؤں اور اپنی رُوح کی شرمندگی سے بھی بچ جاؤں ...... اور
اُس لفظ کی لاج رکھ لوں جس کو میں نے اپنی ماں کے سامنے بولتے وقت اپنی زبان میں کوئی
لرزش محسوس نہیں کی تھی ...... میں جانتا تھا ان لفظوں کی سچائی پر اب میرا کوئی یقین نہیں
ہے ..... لیکن میں پھر بھی بانو کی اُس گرفت سے بچنا چاہتا تھا، جو ہر آن میرے گرد اور بھی
تنگ ہوتی جا رہی ہے ..... میں اس گرفت سے آزاد ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی
خواہش پھر بھی ایک موہوم اُمید کے سہارے میں مارتھا کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اکثر
اس وقت اُسے ملنے جانے لگا جب بانو کی ڈیوٹی ہوتی اور پھر میں اس کے کمرے میں بیٹھا
اُس سے وہ تمام خوبصورت باتیں کہہ دیتا جو میں صرف اور صرف بانو سے کہنا چاہتا....

اصل میں مَیں اپنے اندر کھولتے جذبات کو زبان دینا چاہتا تھا اور مارتھا خوشی سے تمتماتا چہرہ لیے مجھے دیکھتی ...... اور مَیں جو جذبات کی شدّت سے بوکھلایا ہوا تھا عجیب والہانہ انداز میں اپنی چاہت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ الفاظ میں بانو کے خیالی پیکر سے کہتا ..... مجھے تو اکثر اوقات مارتھا کا چہرہ بھی نظر نہ آتا۔ مارتھا کا وجود ہوا میں تحلیل ہو جاتا اور بانو ہی بانو باقی رہ جاتی۔ مَیں مارتھا سے باتیں کرتے اس ارتعاش کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا جو مَیں اپنے سارے وجود میں کہیں بھی نہیں پاتا تھا۔ سوائے بانو کے نام کے .... لیکن پھر بھی میں اس ناٹک کو کھیلنا چاہتا تھا۔ مَیں اس کے اندر ایک گرمی اور سچّائی پیدا کرنا چاہتا تھا، جو کسی طور پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ مَیں اب بانو کے ساتھ مارتھا کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا ...... میں بانو کے وجود سے بچنا چاہتا تھا .... مَیں اسے اکیلے اپنے کمرے میں لے جاتے ہوتے ڈرتا تھا۔ .... اور ہوسٹل کے برآمدوں کی خاموشی مجھے ڈرا دیتی ..... مَیں سرگوشی میں مارتھا سے کوئی خوبصورت بات کہہ دیتا اور پھر بانو کو دیکھنے لگتا جو صرف مُسکرا دیتی اور میرے بستر پہ لیٹے لیٹے آنکھیں مُوند لیتی اور پھر میری خواہش ہوتی کہ مَیں آگے بڑھ کر چپ چاپ اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دُوں اور مارتھا سے کہے گئے لفظوں کے لیے معافی مانگ لُوں اور مارتھا کو دھکیل کر کمرے سے نکال دُوں .....

مَیں کسی دوست کو یہ ساری واردات بتانا چاہتا لیکن سارے ہوسٹل میں بانو کے بعد میرا کوئی بھی تو دوست نہ تھا .... مَیں نے بانو کے سوائے کسی اور کو دوست بنایا ہی کب تھا۔

مارتھا میرے اس ناٹک میں ایک کردار ہی تو تھی لیکن ایک روز مجھے احساس ہوا کہ وہ تو اپنی سوچوں میں میرے ساتھ چلتی چلتی بہت دُور آ پہنچی ہے۔ اتنی دُور جہاں مَیں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا ..... مَیں اس کی جذباتی شدّت کو دیکھ کر ڈر گیا .... کیا ہو گا۔ کیا ہو گا۔ نہیں مَیں تو کہیں بھی جا سکتا تھا .... اور کوئی راہ نہیں سوائے بانو کی راہ کے .. .. میری سب راہوں پہ بانو اپنے بازو پھیلائے مجھے روکے کھڑی تھی اور مَیں اس سے فرار ہونے پر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

مَیں مارتھا کے کمرے میں بیٹھ کر اس کے ہاتھ کے پکائے کھانے کھاتا اور سارا وقت

بانو کے قدموں کی آہٹ کا منتظر رہتا۔ نرسنگ ہوسٹل میں گونجتے قہقہے میری ساری توجہ جذب کر لیتے اور میں اِن گونجتے قہقہوں میں بانو کی آواز سُننے کی کوشش کرتا۔ مجھے مارتھا کی آنکھوں کی انوکھی چمک بھی نظر نہ آتی ......۔ مجھے اس کی جذباتی لہجے میں کہی گئی باتیں ایک شور سا لگتیں اور اس کا خوبصورت روشن چہرہ مٹا مٹا اور دھندلا لگتا۔

ایک روز اُس نے کہا تھا "سلمان مجھے لگتا ہے۔ تم میرے ساتھ ایک کھیل کھیل رہے ہو... .... اور میں ڈرتی ہوں کہ کہیں اِس کھیل سے اُکتا نہ جاؤ۔ پھر میرا کیا بنے گا ...." اور میں جو اپنی سچائی میں بھی بزدل تھا، اسے کچھ بھی کہہ نہ سکا، میں اسے کیا بتاتا۔ میں نے تو اسے ایک راہ بنانا چاہا تھا، لیکن میری تمام راہوں پر تو بانو کھڑی تھی۔ بھلا اس کی جگہ کہاں تھی...... ... لیکن پھر میں اس کی اُنگلی پکڑے فرار کی راہ کھوج رہا تھا۔ شاید میں اِس بھول بھلیوں سے نکل آؤں ..... شاید میں کوئی راہ پاؤں ..... شاید کوئی راہ باقی ہو اور بانو میرے دل میں کھڑی میری بے بسی پر ہنستی جا رہی تھی....

پھر ایک روز مارتھا نے کہا تھا "سلمان کیا بات ہے۔ اب میں تمہارے لیے اچھے اچھے کھانے پکا کر رکھتی ہوں لیکن تم بانو کو لے کر فوراً ہی چلے جاتے ہو۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہتی ہوں۔ کبھی تم نے سوچا ہے"...... اور وہ کوئی بات کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شاید اُس گناہ کی راہ سے مارتھا ہی مجھے بچالے۔ شاید میں اس کتاب کے اُٹھائے جانے کا بھرم نبھانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے ایک بار پھر مارتھا کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا۔ بانو کسی کام سے اپنے کمرے میں گئی تھی۔ میں نے مارتھا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ شاید میں بچ جاؤں۔ شاید ــــ

"سلمان میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سلمان تم تو میری زندگی ہو۔ سلمان تم میرا ایمان ہو......" اور وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی ـــ "مجھ سے شادی کر لو سلمان۔ مجھ سے شادی کر لو۔"

"مارتھا اپنے آپ کو سنبھالو"۔ اس کے وجود سے میرے اندر کوئی لہر نہیں دوڑی تھی۔ میری آواز میں کوئی گرمی نہیں تھی، لیکن وہ بند آنکھوں سے میرے ساتھ لگی کھڑی تھی اور

میں اسے تھام کر سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح سارا تانا بانا بانو کے نام سے بُنا ہوا تھا..... مارتھا کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔

بانو ہمیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔ شاید وہ مُسکرائی ہو۔ کیونکہ اس کی آواز میں وہ کھنک نہیں تھی جو اس کی ہنسی کی خاص خصوصیت تھی۔

"بڑا رُومانس چل رہا ہے، سسٹر مارتھا" اُس نے خوش دِلی سے کہنا چاہا تھا، لیکن وہ ہنس نہیں رہی تھی..... وہ مضمحل تھی۔ شاید..... شاید..... میرے ذہن میں ایک شک نے سَر اُبھارا تھا، لیکن پھر بھی مَیں کس طرح یقین کرتا.....

مارتھا چُپ چاپ کُرسی پر بیٹھ کر میرے سامنے اپنے ہاتھ سے پکائی ہوئی چیزیں رکھ رہی تھی، لیکن ہمارے درمیان فضا معمول کی طرح خوشگوار نہیں تھی۔ اور ہوسٹل کے صحن میں ٹنڈ مُنڈ ٹہنیوں پر سُنبل کے سُرخ پھول تھے اور نیچے کی زمین بھی اُن کے وجود سے ستاروں کی طرح خوبصُورت لگ رہی تھی...... اور دُوسرے کمروں پر پڑے پَردے جھُول رہے تھے۔ ایک طوطا تیز آواز میں ٹیں ٹیں کرتا درخت کے اُوپر سے اُڑ کر غائب ہو گیا تھا اور چند لڑکیاں اونچی ایڑیوں سے کھٹ کھٹ کرتیں مارتھا کے کمرے کے سامنے سے گذر گئی تھیں۔ ان کی باتوں اور ہنسی کی آواز دُور تک سنائی دیتی رہی۔ "بانو چلو بازار تک ہو آئیں" مَیں اس فضا سے نکل کر کھلی ہوا میں جانا چاہتا ہے..... میرے اندر کتنی گھٹن تھی... .... جان لیوا گھٹن..... نہ جانے مَیں کیا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیا ہونیوالا تھا۔

اپنے ہوسٹل آکر مَیں نے ہمیشہ کی طرح دروازہ بند کر لیا تھا۔ بانو کُرسی کے پاس چُپ چاپ کھڑی تھی..... ہمارے درمیان اپنائیت اور پاکیزگی کی فضا نہیں تھی..... ہاں میں نے اس کے بُجھے بُجھے چہرے پر ایک تحریر پڑھ لی تھی..... اور پھر سفر کا وہ لمحہ شروع ہوا جس کو عبور کر کے ہم ایک نئے جہنّم زار میں داخل ہو گئے تھے۔ اپنے جسم کے جہنّم زار میں.....

اور رات کو جب مَیں لیٹا ہوں تو مجھے لگا جیسے میں خالی دل اور خالی دامن ہوں۔ میرے دل کی ساری بہاریں کسی نے نوچ لی ہیں۔ اور روشنی کی وہ کِرن جو آج تک مجھے

اپنے اندر روشن لگتی تھی، بُجھ گئی ہے۔ میں اُٹھ کر زار و قطار رو رہا تھا ..... میرا دل چاہتا تھا کوئی میرا اپنا ہو جس سے لگا میں اتنا روؤں کہ گناہ کا داغ میرے دامن سے دُھل جائے۔

اُوہ خُدایا میں نے یہ کیا کر دیا۔ میں نے یہ کیا کر دیا، لیکن شاید اس رات کے بعد میرا خدا ہوسٹل کی دیواروں سے اندر کبھی میرے کمرے تک نہیں آیا ..... وہاں اس کے لیے کیا رکھا تھا ...... روشنی اندھیروں کی تلاش میں کب آتی ہے۔ میں روتا رہا تھا۔ اور مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ بانو تو اب ہمیشہ سے بھی زیادہ نزدیک تھی، لیکن اس رات میں روتا رہا تھا۔ بس رو رہا تھا ...... کسی موہوم گناہ کی معافی کے لیے کسی اَن دیکھی روشنی کے لیے۔ اور دُوسری رات جب میں بُجھے دل کے ساتھ اپنے بانو کے ہوسٹل کی طرف اُٹھتے قدموں کو روکنے کی تگ و دَو میں مصروف تھا۔ اور دل میں کیا پختہ ارادہ کچے دھاگے کی طرح بار بار ٹوٹ رہا تھا، تو بانو دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ آج پہلی دفعہ تیز سُرخی لگا کر آئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک اور ہی رنگ تھا .... پچھلے رنگوں سے مختلف اور شوخ ...... اور پھر آنیوالے دنوں میں میں باوجود کوشش کے بھی خدا کو منا نہیں سکا تھا۔ اور میرے آنسو جب تک خشک ہو گئے تھے۔ میں تو سجدے میں نہ جانے کون سے خدا کی تلاش میں جاتا تھا جو اس کے بعد کبھی بھی مجھے نہیں ملا تھا۔ میرے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھتے تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں ان کو اُوپر اٹھاتے اُٹھاتے تھک گیا ہوں۔ میں تھکن سے چُور ان کو اپنی جھولی میں گرا دیتا اور پھر چپ چاپ منبر کو دیکھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سارے لڑکے چلے جاتے اور مسجد سنسان اور اُداس ہو جاتی ..... اور ہوسٹل کے کمروں کی روشنیاں قطار دَر قطار جل جاتیں۔ آوازوں کا ایک دھیمے سُروں میں بہتا سمندر چاروں طرف پھیل جاتا میں بانو کا انتظار کرنے لگتا۔ اور پھر رات گذر جاتی ...... اور ہمارے جسموں کا جہنم اور بھی دَہک جاتا .... گناہ و ثواب، نیکی بدی۔ خدا اور شیطان۔ سارے تصوّر میرے ذہن سے مِٹ جاتے .... بس بانو کا چہرہ روشن ہو کر سارے کمرے میں بھر جاتا اور مجھے لگتا جیسے میں ہمہ تن اس کی پُوجا میں مصروف ہوں۔ میرے گرد کوئی اور نہیں۔ کوئی دُنیا نہیں۔ سب طرف پھیلے کمروں میں لڑکے نہیں۔ کوئی

بھی تو نہیں۔ بس وہ زندہ ہے۔ اور میرا وجود اس کے تصوّر میں مٹتا جاتا۔ مٹتا جاتا یہاں تک کہ
مَیں بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سے معدوم ہو جاتا۔

مَیں تو بہت دنوں بعد اُس روز جاگا تھا جب وارڈن نے مجھے بلا کر کہا تھا "سلمان
صاحب بانو رات شدید بیمار ہو گئی ہے۔ ہمیں تو خبر نہیں کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اور اس کی
شادی کب ہوئی ..... آخر اس میں چھُپانے والی کیا بات تھی ..... پہلی دفعہ مَیں نے اُس سحر
سے جاگ کر اپنے چاروں طرف دیکھا تھا۔ درختوں کے پتّے خزاں کی زد میں تھے۔ اور آسمان
مٹیالا سا تھا۔ درختوں کی گرد ہر جھونکے کے ساتھ فضا کو سوکھے پتّوں اور مٹّی کی باس سے بھر دیتی۔

"وارڈن صاحبہ! اِن ساری باتوں کا جواب میں ابھی نہیں دے سکتا۔ میں پہلے بانو سے
ملوں گا" اور جب مَیں ہسپتال کے وارڈ میں داخل ہوا ہوں، تو نرسیں آپس میں سرگوشیاں کر رہی
تھیں مریضوں کی ڈولیوں پر گرد کی ہلکی سی تہہ تھی اور کسی کسی گلاس میں سجا گلدستہ مرجھا رہا تھا۔
کِس قدر ویرانی ہے۔ مَیں نے اپنی پریشانی کو چھُپانے کے لیے سوچا..... کِس قدر ویرانی ہے۔

بانو لیٹی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مَیں ہمیشہ کی طرح اس کو اپنے بازوؤں میں لے لُوں
اور اس کے زرد چہرے پر اَن گنت پیار کر ڈالوں۔ مَیں جو اسے دُنیا کی ہر چیز سے بھی زیادہ
عزیز جانتا تھا کیوں کر اس کی تکلیف میں حصّہ نہ بٹا سکا۔ مَیں نے کرسی پر بیٹھ کر چُپ چاپ
اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ میں میرے دل کی ساری گرمی تھی ..... اور بانو نے اُس گرمی کو
محسوس کر لیا تھا اور وہ مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے مُسکرا رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی غلافی
آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اپنا سَر اُس کے
کندھے سے لگا دیا اور پھر ہم دونوں چُپ چاپ روتے رہے تھے۔

اگلے چند دن میرے لیے انتہائی مشکل دن تھے سب سے پہلے مجھے بانو کی جعلی شادی کا سرٹیفکیٹ تیار
کرنا تھا۔ مجھے ایک مکان ڈھونڈنا تھا، جہاں مَیں اسے رکھ سکوں۔ کیونکہ وارڈن نے صاف
کہہ دیا تھا کہ ہم ایسی لڑکی کو ہوسٹل میں نہیں رکھ سکتے۔ جس کا چال چلن مشکوک ہو۔

اور پھر جب محمود نے میری مدد کا وعدہ کر لیا تو مَیں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ وہ میرا
دوست تھا ..... وہ مجھے اور بانو کو ایک بہت بڑی بدنامی سے بچانے کے لیے تیار ہو گیا

تھا۔ بانو بے حد کمزور تھی ...... اور جب مَیں محمود کو اس کا شوہر ظاہر کرتے ڈاکٹروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے لے گیا، تو مجھے پہلی مرتبہ اپنے بزدل ہونے کا یقین ہوا تھا۔ مَیں جو بانو کے گناہ میں برابر کا شریک تھا کیوں اپنے چہرے سے بھائی کے لفظ کے لبادے کو نہ اُتار سکا تھا۔ کیوں مَیں نے ان سب لوگوں کو نہیں بتایا تھا کہ دیکھو یہ مَیں ہوں، جو بانو کی بدنامی کا سبب ہوں۔ مَیں ڈرا سہما اس سارے مرحلے سے گذرا تھا۔ اور پھر جب ہوسٹل سے بانو کا سامان ایک بستی کے مکان میں منتقل کرتے ہوئے محمود نے کہا تھا۔

"کتنا اچھا ہوتا جو مَیں تمہیں ہسپتال لے کر نہ جاتا۔ مجھے لگتا ہے اس تمام گناہ کا ذمّہ دار مَیں ہوں۔ کئی گھڑیاں کتنی منحوس ہوتی ہیں اور ان ساعتوں کی گرفت میں آیا انسان کبھی بھی دُرست راہ نہیں پا سکتا ...... یہ میرا ہی قصور ہے . . . اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا بدبُودار نالیوں کو پھلانگتا واپس ہوسٹل چلا گیا ..... مَیں نے ایک دفعہ پھر دروازہ بند کر کے بانو کو ہمیشہ سے زیادہ سچائی اور پوری جان سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مَیں اس کی بدنامی اور تکلیف کا مداوا کرنے کے لیے تیار تھا۔

مَیں اُس کے لیے یخنی تیار کرتے ہوئے۔ اُس کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہمیشہ دل ہی دل میں اُس کی خوشیوں اور زندگی کے لیے دُعا کرتا۔ اب ہمیشہ سے زیادہ اُس کا چہرہ میرے خیالوں میں چھایا رہتا اور مَیں کالج میں بھی ڈھنگ سے پڑھائی نہ کر سکتا۔ مجھے لیکچر سمجھ میں نہ آتے۔ مجھے تو اپنے اردگرد پھیلی دُنیا کی خبر ہی نہیں تھی۔ مجھے آسمان کا نیلا رنگ دیکھ کر بانو کی نیلی چُنری یاد آجاتی۔ مجھے سفید بادل دیکھ کر اُس کے دانتوں کی سفیدی یاد آجاتی ..... گناہ ثواب کا چکر میرے ذہن سے مکمل طور پر مٹ گیا تھا .... مسجد میں بھی جا کر مَیں اسکی صحت کے لیے دُعا کرتا۔ مَیں نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ہم کونسی راہ پر جا رہے ہیں اور وہ کیوں اس قدر والہانہ انداز سے میرا ساتھ دے رہی ہے۔ کیوں وہ گناہ کی اندھیری راہوں میں میرے ساتھ چل رہی ہے ...... ہم دونوں ایک دوسرے میں جذب تھے۔ میرے لیے اس دو کمروں کے گھر کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں تھا۔ اور مَیں اُس گندی بستی میں آکر بھی خوش تھا۔ مَیں ان تنگ گلیوں کو پار کرتے۔ بھونکتے کتّوں کو بھگانے اور گھرداری کا سارا بوجھ

سنبھالنے کے باوجود اس طرح خوش اور مطمئن تھا جیسے میں ایک منزل پر پہنچ گیا ہوں اور اس کے آگے کوئی راہ نہیں، کوئی روشنی نہیں، تمام راہیں اُس گھر میں آکر ختم ہو گئی تھیں۔ اور تمام روشنیاں بانو کی ہنسی میں قید تھیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں پاتے فائنل ایئر میں پچھلے سال فیل ہو گیا تھا اور اس سال مجھے محنت کرنی ہے۔ اِس سال مجھے ابّا اور امی کی خواہش کو پورا کرنا ہے۔

کالج سے واپس آکر میں اُس کا انتظار کرتا کہ کب وہ اپنی ڈیوٹی سے واپس آئے اور پھر ہم دونوں ملکر کھانا کھائیں اور وہ اپنی ہنسی کے جلترنگ سے اِس اندھیرے اندھیرے کمروں کو روشن کر دے۔ میں خوش تھا کہ اُمّی ابّا اِس تمام کھیل سے بے خبر ہیں۔ اُس نے کہا تھا۔ سلمان میں دوبارہ تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اس شک کا سامنا نہیں کر سکتی جو تمہارے سب گھر والوں کی آنکھوں میں میرے بلیے ہے۔ میں بے عزّت ہونا نہیں چاہتی۔"

اور اب میں اس کو کسی کے ہاتھوں ذرا بھی تکلیف دینے کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا......

مجھے سب لوگ بُرے لگتے تھے، کیونکہ وہ بانو سے محبّت نہیں کرتے تھے۔...... وہ میری عزّت نہیں کرتے تھے۔ بانو کو میں نے اپنی ہی عزّت تو سمجھا تھا وہ تو کل کائنات تھی۔

میں اُمّی کو خط میں سب کچھ لکھ دینا چاہتا تھا..... لیکن جب بھی میں رات گئے قلم پکڑ کر کچھ لکھنا چاہتا تو مجھے لگتا جیسے میرا دل کہیں سینوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اور پھر مجھے اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا ایک بوجھ نظر آتا..... میں اُمّی کے سامنے اپنا بھرم کیسے توڑ سکتا تھا۔ میں تو بزدل تھا.... انتہائی بزدل۔ اور مستقبل ایک اندھیرے میں ڈوب جاتا۔

اور یہ مستقبل تو اُس روز مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا جب اُمّی نے کہا تھا "کیوں سلمان بانو کی شادی تمہارے بھائی جان سے نہ کر دیں .... بانو تمہاری بہن ہے۔

اور مجھے لگا تھا کہ میرے کانوں میں طوفان کی سائیں سائیں کی تیز گونج ہے اور میں گرد آلود بگولوں میں پھنسا تیزی سے چکر لگاتا گھوم رہا ہوں۔ گھومتا ہی جا رہا ہوں.... لامتناہی خلاءیں گونجتے سنّاٹوں میں ایک آوارہ رُوح کی مانند اُمّی بہت غور سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ اور میں ان کی نظروں کے بوجھ تلے دبا دم توڑ رہا تھا۔ مر رہا تھا۔

"کیوں سلمان کیا خیال ہے تمہارا......" امّی پھر پوچھ رہی تھیں۔ کوئی سہارا۔ یہ زمین میرے قدموں تلے سے کیوں کھسک رہی ہے۔ میں کہاں کھڑا ہوں..... آسمان کدھر ہے..... زمین کہاں چلی گئی۔ اور یہ دو کمروں کا اندھیرا گھر... یہ کیوں ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ میرا گلا کون دبا رہا ہے...... ارے...... یہ تو میرے اپنے ہی ہاتھ ہیں۔ جو میری شہ رگ پر دھرے ہیں۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے۔ لیکن صلیب پر ایستادہ مجھے اس سوال کا جواب دینا ہے۔ امّی کی آنکھیں کیوں اس قدر عجیب انداز سے دیکھ رہی ہیں... اور بانو بھی اپنی ڈیوٹی سے واپس نہیں آئی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا جو بانو کے ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتے۔..... تب شاید میں اس بات کا جواب بہت آسانی سے دے سکتا.... میرے دو ہاتھوں پر دھرا بوجھ مجھے پیس رہا ہے۔ یہ بوجھ اُتر کیوں نہیں رہا۔ میں نے اسے امّی کے سامنے بھی اُتارنا چاہا ہے.... میرے چہرے پر کچھ جھوٹ کا لبادہ اور بھی کستا جا رہا ہے۔ میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔" جیسے آپ کی مرضی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں نے امّی کو جواب دے ہی دیا ہے..... میرا دل کرتا ہے میں چیخ چیخ کر روؤں..... لیکن امّی کا جسم پتھر کا ہے۔ میں اسوقت اس کے ساتھ نہیں لگ سکتا..... یہ ماں ہیں۔ اور اُنھوں نے میری سوچوں کے خوبصورت گلاب نوچ کر بھائی کو دینے چاہے ہیں۔ یہ دیکھ کر بھی کچھ سمجھ نہیں رہیں۔ میں کیسے سمجھاؤں، میں کیا کروں....... میں بزدل ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔

ارے یہ میرے ہاتھوں پر کیسا بوجھ ہے..... میں اس تلے پس گیا ہوں....

اور جب امّی کے جانے کے بعد میں نے بانو کو بتایا تو وہ غصّے سے بولی تھی۔

" یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تب میں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے..... اور کہا تھا" ہمیں اس جھوٹ کو نبھانا ہے بانو.... سب لوگ ہی تو یہی سمجھتے ہیں۔ ہم اتنے لوگوں کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اس لبادے کو اور اچھّی طرح اُوڑھ لینا ہے بانو.... میرا ساتھ.... میرا ساتھ دو...."

"تم بزدل ہو....." وہ پتھر کی مانند کمرے میں کھڑی تھی اس کی آنکھوں کی جوت

بُجھ گئی تھی ...... وہ جوت جو میرے دل میں روشن تھی۔

" ایسا نہیں ہونا چاہیے سلمان ...... ہم نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔ ہم اپنی قدموں پر واپس نہیں جا سکتے۔ ہمیں واپس جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ واپسی پر کوئی روشنی ہماری منتظر نہیں ہوگی ...."

" میرے گھر والے کیا سوچیں گے۔ میری امّی کیا کہیں گی۔ میرے ابّا کیا کہیں گے ...." میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا .....

" تمہارے ماں باپ اور میرے ماں باپ اب ہمارے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ...... اور میں جو گاؤں میں اور اپنے خاندان میں پہلی بار پڑھائی کے لیے شہر آئی تھی۔ ان کی پرواہ نہیں کرتی۔ میرے گھر والوں نے سوچا تھا جب میں نرس بن کر کماؤں گی، تو ان کی غربت دُور ہو جائے گی ...... ان کے ارمانوں کا کیا بنا۔ تمہارے ماں باپ کی خواہشوں کا بھی کچھ نہیں بننا چاہیے ..... وہ ہماری راہ میں نہیں آسکتے ..... مجھے ایک اچھّے گھر کی خواہش ہے سلمان۔ اور جب تم افسر بن جاؤ گے، تو پھر میرا اچھا سا گھر ہوگا۔ کار ہوگی نوکر ہوں گے اور ہم ان دو اندھیروں کمروں سے نکل کر خوبصورت بستی میں بسیں گے ...... جہاں مجھے ان گندی نالیوں کو پھلانگنا نہیں پڑیگا .... جہاں ہسپتال کی طرح کا ایک خوبصورت لان ہوگا۔ اس میں پھُول ہوں گے اور تم میرے لیے ہر روز خوبصورت تحفے لایا کرو گے ..... لایا کرو گے نا سلمان ......" اور وہ خواب دیکھتی آنکھوں سے کچھ سوچتی جا رہی تھی۔ وہ بھی کب جاگ رہی تھی۔ خواہشوں کی دُھند .....

" جانتے ہو سلمان جب میں نے تمہیں ہسپتال میں دیکھا تھا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ خدا کرے تم ایک دن میرے شوہر بن جاؤ، لیکن تم اِس راہ پر چل پڑے۔ جس پر ہم ہمیشہ نہیں چل سکتے تھے ...... دو اجنبی انسان۔ اور یہ میں جانتی تھی مجھے معلوم تھا۔ ایک مرد اور عورت کا رشتہ کیا ہو سکتا۔ کیسا ہو سکتا ہے ..... تم نے اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ تم نے اپنی خواہشوں اور میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور میں ایک موہوم اُمیّد کے سہارے تمہاری راہ میں بار بار آتی رہی۔ تم جانتے ہو جب سسٹر مارتھا

تمہارے ہوسٹل آتی تھی اور سارا سارا دن تمہاری راہ میں کھڑی رہتی تھی اور میں اپنی ڈیوٹی دیتی سوچتی ..... تم اسے اپنے کمرے میں لے گئے ہو گے، تو میں جھنجھلا جاتی اور مریضوں سے خواہ مخواہ چڑ کر بولتی ..... اور جب شام کو تم مجھے آکر بتاتے تو میں شک بھری نظروں سے دیکھتی۔ مجھے لگتا جیسے تم جھوٹ بول رہے ہو، لیکن پھر تمہارا والہانہ پن میرے دل سے سارے شک دُور کر دیتا۔ اور میں اطمینان کا سانس لیتی۔ میں منزل کی کھوج میں تھی۔

سلمان مجھے گاؤں کی زندگی سے نفرت ہے۔ مجھے اپنے بھائی سے نفرت ہے جو اس امید میں بیٹھا ہے کہ کب میں ساری کی ساری تنخواہ اسے دُوں گی ..... گاؤں کی گلیاں دُھول سے بھری رہتی ہیں۔ وہاں تو کوئی سینما بھی نہیں جا سکتا ..... میں اس نئے فیصلے سے بھاگ کر صرف گاؤں جا سکتی ہوں۔ اور وہاں میرے سارے گھر والے مکڑی کی طرح میری تاک میں ہیں۔" وہ رو رہی تھی۔

"میں اُمّی کے اعتماد کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتا بانو ..... میں کیا کروں ..... میں کہاں جاؤں ....." میں بے بسی سے بولا۔ "میں بزدل ہوں۔ بہت ڈرپوک۔" "آؤ ہم سول میرج کر لیں ..... تمہاری اُمّی کے آنے سے پہلے اور دُنیا کی ہمیں کیا پرواہ ہے ..... دُنیا اتنی بڑی حقیقت نہیں۔" وہ منّت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "صرف میں اور تم حقیقت ہیں۔" "مجھ میں ہمت نہیں۔" اور میں اسے روتا چھوڑ کر باہر آگیا تھا ..... اور جب میری ٹانگیں شل ہو گئیں اور اس بستی میں سب طرف خاموشی چھا گئی اور گلیوں کا اندھیرا بدبو دار موریوں میں مل گیا تو میں واپس آیا تھا .....

بانو نے مجھے کھانا پکا کر دیا تھا۔ پھر ہم دونوں نے بغیر ایک لفظ ادا کیے کھانا کھا لیا تھا ..... میرا ذہن ایک اَلاؤ بن گیا تھا۔ ایسا اَلاؤ جہاں میں اور بانو دونوں جل رہے تھے۔ چیخ رہے تھے ..... اور ان چیخوں میں ہمارے جسموں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں .... اور رات گذر گئی۔

جب اُمّی چند لوگوں کے ساتھ بانو کو انہی دو کمروں سے بھائی جان کی معیت میں لے کر واپس جا رہی تھیں، تو میرا دل چاہا تھا میں اپنا گلا گھونٹ لوں اور چُپ چاپ

مر جاؤں ..... مجھ سے بانو کی دُوری کی تپش برداشت نہیں ہو سکتی تھی ..... اُمّی نے میرا اُڑا اُڑا رنگ دیکھا تو اُنھوں نے بے تابی اور شک سے میری طرف دیکھا جیسے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں، بہت کچھ سمجھنے کی ....

"کیا بھائی کے ساتھ تم نہیں جاؤ گے؟" ... اُنھوں نے میرے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر پُوچھا تھا ....

"اُمّی میں جا نہ سکوں گا ...." میں نے پہلی دفعہ سچ بولا تھا، لیکن خوشیوں کی ڈور میرے ہاتھ سے چھُوٹ چکی تھی ..... اور میں خالی ذہن اور خالی ہاتھ ان دو کمروں میں کھڑا رہ گیا تھا .... بانو نہ جانے کب سے یوں میری رگ رگ میں بس گئی تھی ..... یہ رشتہ جسموں کے رشتوں سے اونچا تھا۔

"بے بی تم بھائی کے پاس رہ جاؤ۔" امّی نے بی بے کو کہا اور پھر بانو کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ بھائی جان نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے کھڑے دیکھ کر خدا حافظ کے لیے ہاتھ نہیں ہلایا تھا۔ وہ بھی گہری سوچوں میں تھے۔

اوہ خدا! میری قربانی رائیگاں نہ جاتے ..... میں نے صرف اپنے اور بانو کے بارے میں سوچا تھا۔ میں نے اس بھائی کے بارے میں نہیں سوچا تھا جو نہ جانے کیوں اس قدر چُپ اور افسردہ لگتا تھا ...... جس کے ساتھ میں نے دھوکا کیا تھا۔ مجھے تو صرف اپنے لُٹنے کا احساس تھا ...... بھائی کے لُٹنے کا تو میرے ذہن میں کہیں پرتو بھی نہیں تھا .....

بے بی نے دروازہ بند کیا اور چاندنی پر بکھری چیزوں کو سمیٹنے لگی ..... وہ بار بار میری طرف دیکھتی اور پھر کام میں مصروف ہو جاتی ....

مجھے اُس رات کا تصوّر ڈس رہا تھا جو رات دِھیرے دِھیرے بستی کی دیواروں کے ساتھ لگی نیچے رینگتی آ رہی تھی۔ وہ رات جب بانو مجھ سے دُور ہو گی ..... اور پھر میں نے اس جان لیوا اور دردناک عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے نیند کی گولی کھا لی اور آہستہ آہستہ سوچوں میں چکّر لگاتا لگاتا سو گیا۔

"لوگ کیا کہیں گے۔ ابھی تو ولیمہ کی دعوت ہوتے پندرہ دن ہی گذرے ہیں۔۔۔۔۔"
امّی ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں "میرے بیٹے تم نے مجھے بے موت مار دیا ہے۔ میں نے تمہارے بھائی کو کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی شاید اس بات کو پا گیا ہے۔ تبھی تو وہ چوتھے روز ہی بانو کو چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا بانو کو لے جاؤ تو اُس نے کہا تھا۔ امّی وہاں پر اکیلی کیا کرے گی۔ آپ کے پاس اس کا دل بہلا رہے گا۔ وہ کس قدر افسردہ تھا۔ میرا بچہ۔ میرا معصوم بچہ۔ اور تم نے اپنی داشتہ بھائی کے سپرد کر دی۔ بغیر کسی شرم کے۔ تم نے اُس بھائی کو برباد کر دیا جو تم سے انتہائی محبت کرتا ہے۔ تم نے اپنی داشتہ کو اُس کے ساتھ بیاہ دیا۔ تم نے گندگی کی ایک پوٹ اس کی معصومیت بھری جھولی میں ڈال دی۔ اور وہ اس گندگی کو سمیٹ کر چپ ہو گیا۔۔۔۔ صرف میری خاطر۔ میں جو اس کی ماں ہوں۔ جو اس کی پاک خواہشوں کی قاتل ہوں۔ ہائے دُنیا کیا کہے گی۔ ۔۔۔۔۔ ہم کیا منہ دکھائیں گے ۔۔۔۔۔ تم نے تو قرآن شریف اُٹھا کر قسم کھائی تھی کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ میں اگر جانتی کہ تمہاری رگوں میں گندہ خون ہے تو میں تمہاری بات کا اعتبار ہی نہ کرتی ۔۔۔۔۔ اور پھر لوگ ملنے والے محلے والے کیا کہیں گے۔

"میں ان ساری باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔۔۔۔" وہ پریشانی سے بولیں۔ اور میں جوان پندرہ دنوں میں اذیت کے ان جان لیوا دردسے گھبرا کر امّی سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے آیا تھا۔۔۔۔۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چُپ تھا۔۔۔۔۔ میں جو ان سب لوگوں سے محبت کرتا تھا۔ ایک خود غرض اور لالچی انسان بن کر ان کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈالنے آیا تھا۔ ۔۔۔۔۔ میں تو بس یہ جانتا تھا کہ بانو کے بغیر میں نہیں رہ سکتا ۔۔۔۔۔ اور میں امّی کے پاؤں کے ساتھ چمٹا بانو کو واپس کر دینے کی درخواست کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اور امّی ہاتھ ملتے ہوئے مجھے ٹھوکریں مار رہی تھیں۔

" امّی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔۔۔ امّی بانو کو میرے ساتھ بھیج دیجیے" میرے آنسو ان کے پاؤں بھگو رہے تھے۔

" وقت اگر تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے تو ہم بھی اُس کے ماتم میں ہیں۔ لوگ

ہم پر تھوکیں گے۔ لوگ ہمیں گندہ سمجھیں گے..... مجھے ابھی بے بی اور گل کی شادیاں کرنی ہیں۔ میں ان کو ہمیشہ اپنے گھر نہیں بٹھا سکتی۔ میں اتنی بڑی قربانی نہیں کر سکتی۔ تم اگر زہر کھانا چاہتے ہو تو جاؤ مر جاؤ۔ جاؤ مر جاؤ.... جاؤ مر جاؤ..... اُمی نے جھٹک کر اپنا آپ مجھ چھڑا لیا تھا۔

بانو دروازے کے درمیان آ کر کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا..... اس نے آگے بڑھ کر مجھے اُٹھا لیا" دیکھ لیا اپنی قربانی کا انجام۔ کیا ملا.... کیا ملا.... ہم دونوں ہی بھٹک گئے..... میں سچائی کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ میں تمہارے بھائی کو دھوکے میں نہ رکھ سکی۔ میں اپنے پاکیزہ جسم کی سوغات اُنھیں نہ دے سکی اور وہ چلے گئے....."

"فاحشہ عورت تم نے مجھے برباد کر دیا ہے.... تم نے ہمیں لُوٹ لیا ہے۔ جو اپنے ماں باپ کی عزّت کی حفاظت نہ کر سکی۔ ہماری عزّت کی کیوں رکھوالی کر سکو گی....." اُمی غم کے بوجھ سے گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"اُمی یہ فاحشہ نہیں ہے۔ یہ تو بہت پاکیزہ ہے۔ مجھے اس سے محبّت ہے۔ میں بانو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"...." تو تم اسے لے جاؤ۔ اور میرے گھر سے نکل جاؤ...... نکل جاؤ میرے گھر سے" ابّا اندر آ کر ایکدم بولے....

کتنا اچھا ہوتا جو میں تمہارے مجبور کرنے پر یہ کام نہ کرتی" بانو غصّے سے کہہ رہی تھی۔ "میں یہ بے عزّتی نہ کرواتی..... اتنا ذلیل نہ ہوتی....."

"تم جو ایک فاحشہ ہو اور عزّت کی دعوے دار بن رہی ہو کیا کہنے" بی بی جو نجانے کب سے کھڑی تھی بول اُٹھی..... طنز اور غصّے سے مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے ایک زور کا تھپّڑ بے بی کے مُنہ پر مارا..... میں اِس کا مُنہ نوچ لینا چاہتا تھا جو بانو کو فاحشہ کہہ رہی تھی۔

بے بی نے اپنے بال سہلاتے ہوئے کہا تھا" آئندہ سے اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا..... تم جیسے ناپاک انسان کو میں بھائی کہتے ہوئے شرماؤں گی۔ تم نے اس عورت کو بھی تو بہن کہا تھا اور پھر داشتہ بنا لیا۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔

مجھے تم سے نفرت ہے" اور وہ روتی ہوئی دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی ....

"ہاں یہ فاحشہ ہے، میری داشتہ ہے ..... میں اسے لیکر چلا جاؤں گا۔ آپ اگر خوش رہنا چاہتے ہیں، تو میں بھی خوش رہنے کا حق رکھتا ہوں" میں ہمت سے بولا۔ اس وقت نہ جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی" لے جاؤ برخوردار لے جاؤ .... تمہارے اِس کے رشتے کی پاکیزگی کا یہ گھر متحمل نہیں ہو سکتا ....". امّاں طنز سے بولیں۔

میں اور بانو دونوں باہر نکل آئے تھے ..... اور ابّا امّی سے کہہ رہے تھے" بیگم تم نے تو زندگی بھر ایسی غلطی نہیں کی تھی۔ مجھے تو تمہاری فراست پر بڑا بھروسہ تھا۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوا ..... میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا تھا .... لیکن اب مجھے گھر کے معاملات پر نظر رکھنی پڑے گی ...." اور وہ کُرسی پر یُوں گر پڑے تھے جیسے وہ بہت لمبا اور تھکا دینے والا سفر کر کے آئے ہوں۔

بانو کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگی تھی اور میں نوکری کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتا تھا ..... اس سے زیادہ مجھے ہمیشہ کی طرح کچھ یاد نہ تھا .... میں اور بانو پھر اکٹھے تھے اور دُنیا کا کوئی وجود نہیں تھا ..... ایک ماہ بعد ایک روز بھائی جان کا خط آیا تھا لکھا تھا؛

"میرے دوست حالات اس قدر جلدی اور اس قدر ناخوشگوار طور پر پلٹا کھائیں گے، اس کا مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں نے تمہارے اور بانو کے تعلق کو سمجھ لیا تھا۔ لیکن اُمّی اس بات پر یقین نہیں کرتی تھیں اور میں اُمّی کی خوشی میں خوش تھا۔ میں نے بھی ایک قربانی دی تھی اور اس قربانی کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا۔ انسان کو خاندان کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، لیکن دوست ایک بات تو بتاؤ جس بہادری کا مظاہرہ تم نے بعد میں کیا اگر پہلے کرتے تو بہت سے لوگ ذہنی صدموں اور دھچکوں سے بچ جاتے۔ اور تم بھی یوں مغموم اور دُکھی نہ ہوتے۔ میں ان چار راتوں کے لیے تم سے معافی چاہتا ہوں جو میں نے اُس عورت کے ساتھ گذارے۔ سوچتا ہوں تو لگتا ہے میں نے بھی تو خیانت کی ہے ... . مجھے معاف کر دو دوست ..... میں مجبور تھا .... میں تو طلاق دینے کو تیار ہوں لیکن

ابا کہتے ہیں: "اسے ابھی گناہ کے جہنم میں اور جلنے دو۔ وہ پہلے بھی تو اس جہنم کا عادی ہے وہ بزدل نہیں۔ گناہ کی لذّت میں سرشار ہے۔ اور داشتہ اور بیوی کے فرق کو سمجھتا ہے۔"
معاف کرنا دوست میں نے ایک سخت لفظ استعمال کیا ہے، لیکن تمہارے اور اس کے رشتے کو اور کوئی نام بھی تو نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں رہو خوش رہو...... میری تو بس یہی دُعا ہے......"

میں نے اس خط کو پڑھ کر بھائی جان کے دُرد کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، لیکن میرا ذہن شاید منجمد ہو گیا...... ایک دبیز دھند تھی جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوتے تھی۔ اور پھر میں اور بانو دوسرے شہر چلے گئے تھے۔ جہاں اس کے اور میرے رشتے پر کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اٹھایا بوجھ ــــ ہمیشہ کے لیے اتار دیا تھا...... گھر والوں کو ملنے کے لیے اکثر میں بے چین ہو جاتا۔ لیکن میں جانتا تھا میری اور ان کی زندگی دو مختلف دھاروں کی صورت بہہ رہی ہے۔ جو موجودہ حالات میں مل نہیں سکتے......
میں اپنی بزدلی کی تلافی کر رہا تھا...... میں نے ایک دو دفعہ گھر خط لکھا تھا کہ وہ بانو کو طلاق دیدیں، لیکن اُنھوں نے جواب نہیں دیا تھا۔ اور پھر مجھے طلاق کی ضرورت بھی تو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بندھن تو ذہنوں کے ہوتے ہیں...... بندھن تو دلوں کے ہوتے ہیں۔
اور پھر فرقان پیدا ہوا...... اور مجھے لگا جیسے زندگی اور دنیا کی تمام خوشیاں میری زندگی میں مجتمع ہو گئی ہوں...... فرید کے پیدا ہونے پر میں نے پہلی دفعہ شدّت کے ساتھ بانو کی اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچا تھا۔ میرے بچّے جو دوسرے باپ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ کیا ہو گا...... ان کی آنیوالی زندگی...... اور میری شدید خواہش ہوئی کہ یہ لڑکی مر جاتے جو ایک ننھے سے لوتھڑے کی صورت میں بانو نے میرے بازوؤں میں تھما دی تھی۔
...... پہلی دفعہ مجھے لگا تھا کہ میں کتنے عرصہ سے ایک گناہ بھری زندگی بسر کر رہا ہوں...... میں ایسے بچوّں کو پیدا کر رہا ہوں جو خدا اور معاشرے دونوں کی نظروں میں قابلِ نفرت ہوں گے۔
اور میں نے دنوں بعد اس روز پہلی بار مسجد میں قدم رکھا تھا۔ میرا جسم تعفّن اور بدبو سے بھرا ہوا لگ رہا تھا، لیکن سجدہ کرتے وقت مجھے لگا جیسے میری ٹانگیں لوہے کی سلاخوں کی

مانند میرے جسم میں گڑ گئی ہوں۔ اور میں جھک نہیں سکتا۔ میں سجدہ نہیں کر سکتا.... میں اپنے بچوں کی درازیٔ عمر کی دُعائیں نہیں مانگ سکتا.... میرے ذہن میں بازوؤں میں اُٹھایا ایک لوتھڑا تھا جس کی موت کی شدید خواہش ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اس کو بانو کی راہ پر نہیں چلا سکتا تھا.... اور جب میں واپس آ رہا تھا، تو پہلی دفعہ مجھے بانو سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ یہ عورت جو اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے میری ساری شرافت اور پاکیزگی کو ہڑپ کر گئی..... اور میں اس کے جال میں اُلجھ گیا۔ اور اب یہ بچّے۔ یہ کتنی بے شرمی سے انہیں پیدا کرتی جا رہی ہے، تاکہ مجھے اپنے پنجوں میں اور مضبوطی سے جکڑ لے اور میں بے بس ہو کر پھڑپھڑاتا رہوں، اس کے جسم کی پرستش کرتا رہوں۔ اس کی آنکھوں کے سحر میں مبتلا رہوں۔ اور یہ بچّے جن کو میں قانونی طور پر اپنا نہیں سکتا۔ میں ان کی پیشانیوں پر "ناجائز" کا لیبل چپاں نہیں کر سکتا...... میں گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہی جا رہا ہوں...... میں جسم کے جہنم زار سے کیونکر چھٹکارا پاؤں..... میں کہاں جاؤں..... میری بیٹی.... اگر کل کو..... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا.... ایسا نہیں ہونا چاہیے..... میں نے واپس مسجد جانا چاہا تھا..... لیکن میں اس کے دروازے سے اندر قدم نہیں رکھ سکا تھا اور باہر کھڑا روتا رہا تھا۔ اور اپنا سر کسی اندرونی غم سے ٹکراتا رہا تھا یہاں تک کہ خون کی سُرخ لہر نے میری پیشانی کو رنگ دیا......
... شاید میں نے اپنے گناہ کی کچھ تلافی کر دی تھی۔ شاید میں اِس بوجھ کو تھوڑا سا کھسکانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اتنے سالوں سے میرے دل پر دھرا رہتا تھا۔ میرے گناہوں کا بوجھ..
..... مسجد خالی پڑی تھی اور مُلّا اندر حجرے میں چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ مسجد کے دروازے سے ہوتی لمبی سڑک کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑی ہوتی تھی..... میں نے اپنے سُرخ خُون کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور آہستہ آہستہ گھر کو چل پڑا۔ وہ گھر جو محض خیال میں جھولتے ایک ہنڈولے کی طرح تھا۔ کچا اور مٹ جانے والا۔

اُس رات میں گناہ کے بوجھ سے آزردہ اور مضمحل ہو رہا تھا۔ اور اتنے سالوں سے جس خواب نے مجھے اپنے زیرِ اثر رکھا تھا.... اپنا اثر کھو رہا تھا...... اور یہ جاگنا کتنا کربناک تھا۔ میں تو محض ایک ریت کا نگر آباد کیے ہوتے تھا۔ ایک ریت کا نگر۔ لیکن ان دو

بچوں کو ایک پختہ بنیاد کی ضرورت تھی۔ ان کو ایک سچے مستقبل میں سفر کرنا تھا، لیکن وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ صرف اندھیروں کے راہی تھے ...... مجھے اپنی نادانی پر غصہ آرہا تھا۔ سفر کے اس مرحلے پر پہنچ کر اخلاقی اقدار جن کو میں آج تک بھولتا آرہا تھا، سفر کے آغاز میں موہوم نقطوں کی طرح نظر آرہی تھیں، لیکن ان تک پہنچنا کس قدر مشکل تھا۔ میں ان دو بچوں کو کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا.... میں ان بچوں کو اپنے بچے نہیں کہہ سکتا تھا..... مجھے کہاں جانا ہے۔ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر خوشیوں سے تہی اور خزاں زدہ ہو گیا تھا....

.... ان بچوں کے لیے کچھ تو کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنا آپ نفی کرنا پڑے گا ...... جسم کے علاوہ بھی تو بہت کچھ ہے جن کو بھول کر کوئی خوش نہیں رہ سکتا..... ان کا مستقبل ان کی خوشیاں ....

.... ان کی راحتیں۔ اس کا وقار۔ نئی سوچوں کی کڑواہٹ میرے اندر گھس گئی۔ بانو سوئی ہوتی تھی۔ ...... اور دونوں معصوم بچے اس کے پہلو میں سوتے ہوتے تھے..... کتنا اچھا ہو اگر یہ چھت ہم پر گر جائے اور ہماری کہانی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ ہم چاروں کے وجود گرد آلود خون سے لتھڑ کر مٹی ہو جائیں ..... میں نے پھر بہت دنوں بعد اُس خدا کو پہچاننے کی کوشش کی تھی، جس نے نہ جانے مجھے کب سے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ بھٹکنے کے لیے .... تپتے ریگزار میں۔

خدایا مجھے راہ دکھا ..... خدایا مجھے راہ دکھا .... میں نے اپنی دکھتی پیشانی کو چھوا — لیکن وہاں تو صرف بانو کا جسم تھا اور گلیوں گلیوں پھیلا اندھیرا تھا اور خوفناک مستقبل کا ڈراؤنا ہیولیٰ .....

میں ان بچوں کے لیے روشنی کی کھوج میں کہاں جاؤں ... میں نے بانو کے جسم کو بھول کر سوچا تھا، لیکن میری سوچ کے سارے سرے اس کے وجود سے بندھے ہوتے تھے لیکن مجھے اس سحر سے نکلنا ہی ہو گا ..... مجھے کہاں ملے گی ایسی روشنی جو ان دو معصوم روحوں کو ہمیشہ کے لیے اُجلا کر دے .... ان کو شرمندگی اور ذلالت کے اندھیرے سے بچا لے۔

اور میں ایک دفعہ پھر بھائی جان کے پاس کھڑا تھا ..... کراچی شہر کی روشنیاں سیاہی اور روشنیوں کے امتزاج سے آسمان کی وسعتوں کو دُودھیا بنا رہی تھیں ..... اور سمندر کی خُنک ہوا تیز دوڑتے رکشے سے میرے مُنہ پر پڑ رہی تھی۔ گاڑیوں کی روشنیوں کے دھارے

میں بہتا میں بھی دوڑ رہا تھا۔ روشنی کہاں ملے گی؟ شاید میں بھی روشنیوں کے اس بہتے دھارے سے روشنی کی ایک کرن چُرا سکوں ..... اور اپنے گناہوں کی تلافی کرسکوں۔ کون سا گناہ .... خدا تو کہیں بھی نہیں ..... صرف بانو ہے ..... بانو سے پَرے مَیں کچھ نہیں سوچ سکتا اور بھائی جان نے کہا تھا "یار مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ تم بھی کیسے آدمی ہو۔ میرے پاس کیا لینے آتے ہو۔ اُمّی ابّا کے پاس جاؤ۔ اور اگر وہ تیار ہوں تو میں نے صرف طلاق کے کاغذ پر دستخط ہی کرنے ہیں ..... بہر حال جو بھی فیصلہ ان کا ہوگا۔ مَیں تو کچھ بھی نہیں ..... نہ پہلے تھا اور نہ اب ہوں ....."

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اُن دونوں بچّوں کو اپنا لیں کیونکہ آخر تو وہ آپ کے بچّے ہی کہلائیں گے"، مَیں نے آخر اپنی بات کہہ ہی دی .... "پہلے تم نے مجھے اپنی محبوبہ دے ڈالی اور اب آتے ہو کہ مَیں تمہارے بچّے بھی لے لُوں۔ کِس قدر فراخ دل ہو اور کِس قدر بے غیرت "..... بھائی جان اپنا غصّہ دبانے کی کوشش کر رہے تھے ان کے چہرے کی رگیں تن گئیں تھیں اور مجھے لگا تھا جیسے وہ ابھی اُٹھ کر میرا گلا دبا دیں گے ...... ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"مَیں آپ کی منّت کرتا ہوں بھائی جان ..... میں اُن بچّوں کے مستقبل کی روشنی کی بھیک مانگتا ہوں ..." اس وقت سوائے بچّوں کے اور کوئی خیال میرے ذہن میں نہیں تھا۔ "بس دوست بس ...... اس سے زیادہ کا مجھ میں حوصلہ نہیں ..... واپس چلے جاؤ اور آئندہ میرے پاس مت آنا مبادا کوئی ایسی حرکت مجھ سے سرزد ہو جائے جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہو۔ تم نے کبھی اس ماں کے بارے میں سوچا ہے جس کے دونوں بیٹے گم کردہ راہ ہیں ...... جو اپنے اصُولوں پر قربان ہو گئی ..... اور اُف بھی نہیں کر سکتی۔ جو ایک عورت کو بیاہ کر لائی کہ ایک بیٹے کے گھر روشنی کر سکے ..... لیکن خود تاریکی میں بھٹک گئی .... اعتماد کی موت بڑی تکلیف دہ موت ہوتی ہے۔

سلمان تم اتنے بے حس اور مُردہ ہو جاؤ گے۔ مَیں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جاؤ واپس اُس عورت کے پاس جاؤ جو تاریکی بنکر ہم سب کی خوشیوں پر چھا گئی ہے۔ وہ تم کو روشنی کہاں سے

دے سکتی تھی۔ جو ناجائز بچے پیدا کر رہی ہے۔ اور فخر سے ان کو تمہارے نام منسوب کر رہی ہے۔ جو اپنے بچوں کے مستقبل کے متعلق اتنی غافل رہے۔ وہ ایسی جونک ہے۔ جو نفس کی دلدل میں زندہ رہ سکتی ہے۔ جس کے نزدیک گناہ ثواب سوائے اس کی اپنی ذات کی خوشی کے اور کچھ نہیں۔ جاؤ جس گناہ کی کشتی میں تم سوار ہو اُسی میں رہو۔ تمہاری عافیت بھی اسی میں ہے"۔
..... اور اُنھوں نے پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا تھا......" جاؤ دوست جاؤ...... مجھ سے کیا مانگنے آتے ہو...... میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں...... ہم دونوں ہی بے غیرت ہیں...... ہم دونوں ہی...... میں تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا، لیکن ایک فاحشہ کے لیے ایسا کرنا بہت مہنگا سودا ہے......" ان کے نتھنے غصّے سے پھڑ پھڑا رہے تھے...... اور ہم دونوں گلی میں کھڑے تھے۔ ہم دونوں بھائی جو محبّت کے ناطے اس قدر نزدیک تھے، لیکن پھر بھی ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑے تھے۔ ہم دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں الگ الگ سمتوں میں چلنا تھا...... پھر بھائی جان نے دروازہ آہستہ سے بند کر لیا اور میں اس گلی میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ جس سے تھوڑی دُور روشنیوں کی دھارا بہہ رہی تھی...... اور میں روشنی کی ایک کرن بھی تو نہیں لے سکا تھا۔

بانو فاحشہ ہے...... اور بچے...... میں کس قدر اکیلا ہوں، کس قدر اکیلا...... میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سوچا۔ میرے گرد آدھی رات کا سویا شہر پھیلا ہوا تھا......
سائیں...... سائیں یہ میرے اندر کیسی آواز گونج رہی ہے...... میں بانو کو عزّت نہ دے سکا۔ میں اس کو ایک گھر نہ دے سکا...... یہ گونج اس قدر پریشان کُن کیوں بنتی جا رہی ہے۔
...... میرے سارے اپنے کہاں گئے...... اُمّی، اُبّا، بے بی اور گُل...... پورے تین سال۔
...... پورے تین سال سے میں ان کو نہیں دیکھ سکا...... اور بچّے اور اندھیرا...... اور گُناہ...... نہیں مجھے اُس راہ پر نہیں جانا جہاں بانو کے جسم کا طِلسم کدہ آباد ہے۔ میں اور دُور اس اندھیرے اور بے یقینی میں سفر نہیں کر سکتا۔ مجھے روشنی کی تلاش کرنی ہی پڑے گی...... مجھے اپنے اندر کے لیے روشنی کی تلاش کرنی ہی پڑے گی......
چار سال کے یونیسکو اسکالرشپ پر جب میں مزید تعلیم کے لیے کراچی ایئر پورٹ پر

کھڑا تھا، تو میری دُلہن میرے ساتھ تھی اور اس کے ہاتھوں پر مہندی کی جوت اور لالی تھی۔۔۔
۔۔۔۔ اُمی اُبّا اور بھائی جان سب خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے اپنے ہاتھوں میں ہار لیے کھڑے تھے۔ مختلف ایرلائنوں کے اسٹال روشن تھے۔۔۔۔ اور بچّے خوشی سے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔۔۔۔۔ مَیں نے چاہا تھا کہ مَیں بانو اور بچّوں کے متعلق نہ سوچوں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ لیکن مَیں اپنی دُلہن کے چہرے میں بانو کا پرتو ڈھونڈ رہا تھا۔ مَیں بھاگتے دوڑتے بچّوں کے شور میں اُن دو آوازوں کو سُننے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔۔۔۔ اور پھر پھولوں کے ہاروں سے لدے مَیں اور میری دُلہن جب جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے تو مجھے لگا تھا جیسے اُوپر گیلری پر دُور سے ایک چہرہ جھانک رہا ہو اور دو ہاتھ ہل رہے ہوں۔۔۔۔
۔۔۔۔ ہوسکتا ہے وہ محض میرا وہم ہے۔۔۔۔۔ بانو یہاں کہاں ہوسکتی ہے۔ مَیں نے اپنی دُلہن کا ہاتھ پکڑا اور اندر چلا گیا۔ بہت سے رومال ہل رہے تھے۔۔۔۔ بہت سے ہاتھ خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ان ہلتے ہاتھوں میں میرے اپنوں کے ہاتھ بھی تھے۔ میری دُلہن کے اپنوں کے ہاتھ بھی تھے۔ مَیں جاکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔ بند ہوتے دروازے کے باہر میرا ماضی تھا۔ اور پھر مَیں جہاز کی پرواز کے ساتھ ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں اُڑ گیا۔ میرا جہاز فضاؤں میں بلند ہوگیا۔۔۔۔۔ لیکن مَیں کوشش کے باوجود اس بلندی پر نہ جاسکا تھا۔ میرا اپنا آپ تو کہیں دو موہوم ہلتے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دل تو دو ننھے منّے قہقہوں میں اڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔

خدا حافظ میرے بچّو۔۔۔۔ کیا وہ میرے بچّے ہیں؟ مَیں نے شک سے سوچا۔۔۔۔ وقت آگے دوڑتا جا رہا ہے۔۔۔۔ وقت آگے دوڑتا جا رہا ہے۔ میری دسترس سے دُور۔

اور وقت آگے ہی دوڑتا رہا تھا اور مَیں انگلینڈ کے شہر میں اپنی بیوی کی چخ چخ سے خوفزدہ ہوکر سوچتا۔۔۔۔ شاید مَیں گناہ کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔۔۔۔ شاید مَیں اسی طور سے احساسِ گناہ سے رہائی پاؤں۔۔۔۔۔ مجھے چُپ رہنا ہے۔۔۔۔ مجھے سب کچھ برداشت کرنا ہے۔۔۔۔۔

اور میری بیوی فخر سے بتاتی تھی کہ جب "وہ فیکٹری میں داخل ہوتی ہے تو بے شمار

استقبالی سیٹیاں سب طرف گونجنے لگتی ہیں۔ انگریز مرد اُس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔" انہیں اس کا سانولا رنگ بہت بھاتا ہے جسے وہ پوڈر سے خوب گورا کرلیتی ہے اور سر پر مصنوعی بالوں کا بڑا سا جُوڑا سجا کر جب وہ اپنی ساڑھی کو سنبھالتی بازار میں چلتی، تو میں اپنے آپ میں سُکڑ جاتا ہوں ...... میں اپنے کانوں میں اُنگلی دے لینا چاہتا ہوں، لیکن یہ خلافِ تہذیب ہے ...... دُوسرے مرد جاتے جاتے اس کی چُٹکی لے جاتے ہیں ...... مجھے اپنی آنکھیں بند رکھنی چاہئیں۔

تم نئی تہذیب سے بالکل آشنا نہیں ہو سلمان۔ پھر کیا ہے اگر میں ایک انگریز مرد کی پرائیویٹ سیکرٹری بن گئی ہوں ...... یہ تو ہم مشرقی لوگوں کے لیے عزّت کی بات ہے۔" اور جب میں نے کہا تھا کہ میں اِس کو یہ نوکری نہیں کرنے دُوں گا، تو اس نے کمرے میں زور زور سے چیخنا شروع کر دیا تھا، جیسے میں اُسے بے تحاشہ مار رہا ہوں ...... اور ساتھ کے فلیٹس سے عورتیں ہمارے دروازے کے سامنے جمع ہو گئی تھیں اور پھر ملی جُلی آوازوں کے شور میں جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھے لگا جیسے بھرے مجمع میں ننگا ہو گیا ہوں۔ عورتیں شمسہ کے گرد کھڑی اس سے ہمدردی کر رہی تھیں۔ اور مجھے قانونی کارروائی کی دھمکی دے رہی تھیں کیونکہ میں نے شمسہ کو مارا تھا۔ اور انگلینڈ میں کوئی شوہر ایسا نہیں کر سکتا۔" یہاں پر کوئی عورت اتنی بے بس نہیں ہے مسٹر ــــ" مسز کھنّا نے اپنی ساڑھی کو دُرست کرتے ہوئے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔" اگر تم نے دوبارہ اپنی بیوی کو مارا، تو میں ویمنز کلب میں تمہاری شکایت کر دوں گی .... سمجھے ......" اور مجھے لگا تھا کہ دُنیا ایک بار پھر ویران اور اُجاڑ ہو گئی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے بھی زیادہ اکیلا اور تنہا ہوں ...... اُس رات میں نے پہلی بار بانو کو خط لکھا تھا ...... میں نے اُس سے کی گئی زیادتیوں کی معافی مانگی تھی ...... اور رات کو میں شمسہ کے پہلو میں لیٹا چُپ چاپ اندھیرے میں آنسو بہاتا رہا تھا۔ اور کھڑکیوں پر کھنچے پردوں کے پار فلیٹس میں روشنیوں کی دیوالی تھی۔ ...... لیکن میرے دل میں اندھیرا اور ویرانی تھی۔ خوفناک ویرانی ...... ہمارے اپنے گناہ ہم پر پلٹ کر آتے ہیں۔

اس ویرانی کی سختی کو میں نے بانو اور بچّوں کے لیے چیزیں خرید کر کم کرنا چاہا تھا۔ میں نے

دونوں بچوں کے لیے کھلونے اور سوئیٹر بھیجے تھے اور جب وظیفے کے روپے کم پڑ گئے تو شمشہ نے کہا تھا:

تم جانتے ہو ہمارے خاندان میں عورتیں اپنے مردوں پر مکمل کنٹرول رکھتی ہیں۔ ہمارے خاندان کی عورتوں کی گرفت بڑی مضبوط ہے ...... اور ہم جانتے ہیں کہ کس طرح مردوں کو سیدھا رکھا جاتا ہے ......" شمسہ مجھے تنبیہہ کر رہی تھی اور میں چپ تھا۔ میں پچھلے تماشے کو دوبارہ دہرانا نہیں چاہتا تھا ..... میں اپنے میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا .....

ذہنی ابتری اور غیر تسلی بخش حالات کی وجہ سے میں اپنا امتحان پاس نہ کر سکا اور پھر دو سالوں کے بعد میرا اسکالرشپ بند ہو گیا ..... لیکن شمسہ واپس جانے کو تیار نہیں تھی ..... وہ ننھے فرہاد کے لیے ڈھیروں روپے جمع کرنا چاہتی تھی اور مجھے بھی مجبور کر رہی تھی کہ میں دو دو شفٹوں میں کام کروں۔ اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنی آزمودہ ترکیب استعمال کرتی اور پھر میں اس کو چپ کروانے کے لیے ہاتھ جوڑتا اور رات کو اپنے بستر پر لیٹا روتا رہتا ..... کیا روشنی کا وجود کہیں نہیں ..... کیا میری زندگی کی راہ میں صرف سیاہی ہی سیاہی ہے۔ میں کس سے پوچھتا ..... کون میری ان سوچوں کا جواب دیتا ..... کوئی بھی نہیں ... کوئی بھی نہیں ...

بانو نے مجھے خطوں کا جواب دینا چھوڑ دیا تھا اور روشنی اور خوشی کی ایک آخری کرن بھی میری زندگی سے مٹ گئی۔ بھائی جان نے میرے بعد اُسے طلاق دے دی تھی۔ کیونکہ امی ابا نے ان کی شادی کرنی تھی .... میں اس راہ پر کیسے جاؤں جہاں بانو اکیلی کھڑی ہے۔ بانو کی نئی آزادی وطن سے اتنی دُور مجھے بے چین کر دیتی ..... اب وہ کیا کر رہی ہو گی کس طرح گذارہ کرتی ہو گی ...... اور بچے کتنے بڑے ہو گئے ہوں گے ...... میں سڑکوں کی گھما گھمی میں چلتا اکثر اس بارے میں سوچتا ..... کہیں کوئی اور مرد ..... ہو سکتا ہے ..... گھر جا کر میری ساری خوشی فرہاد کی ذات میں اکٹھی ہو جاتی ..... اور میں اکثر فرقان اور فریحہ کو بھول جاتا۔

ہاں یہ میرا اپنا بچہ ہے۔ میں اسے دُنیا کے سامنے لے جا سکتا ہوں اور بے یقینی کا کوئی ناگ مجھے نہیں ڈس سکتا ..... لیکن میرے سینے کے اندر کوئی چیز کھٹ سے ٹوٹ جاتی اور میں فرہاد کو گود میں پکڑے پکڑے سوچوں میں بہت دُور نکل جاتا۔ بہت دُور ..... اُس شہر

میں جہاں بانو اور بچوں کو چھوڑ کر نئی روشنی کی تلاش میں نکل آیا تھا...... اور اب تک اس کی کھوج میں بھٹک رہا تھا...... روشنی کہاں ہے۔ میری خوشی تو پیچھے چھوٹ گئی..... ایک روز شمسہ نے میرے سامنے ایک خط رکھا۔ اُس روز وہ میرے گھر آنے پر بہت مشتعل تھی اور میں فرہاد کو گود میں لیے سوچ رہا تھا...... خدا کرے یہ اتنی زور زور سے نہ چیخیتے..... یہ میرے ساتھ آہستگی سے بھی لڑ سکتی ہے۔ ساتھ کے فلیٹس سے تو کبھی ایسی آواز نہیں آئی تھی..... ہر حادثہ صرف میرے ساتھ ہی وابستہ کیوں ہو جاتا تھا..... میں ہی کیوں حالات کی ستم ظریفی کا شکار بنتا ہوں.......

اور جب چھوٹے سے میز کے کنارے میں نے اُس خط کو دیکھا تو میرا جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ..... اور شمسہ کہہ رہی تھی..... "اگر تم کسی اور سے محبت کرتے تھے، تو مجھ سے شادی کیوں کی؟"

میں نے جواب دینا چاہا تھا، لیکن میں اس کو کیا کیا بات بتاتا..... اور میں جانتا تھا کہ میرے بتلانے سے بات سلجھنے کی بجائے اُلجھ جائے گی..... وہ آج خلافِ معمول خاموش تھی...... وہ زور زور سے بول نہیں رہی تھی۔ وہ خفا ہو کر رات کے وقت باہر نہیں چلی گئی تھی...... میں کسی کو بھی خوش نہیں کر سکا۔ میں کسی کے کام بھی نہ آسکا..... اُس رات میں نے شمسہ کو منانا چاہا تھا، لیکن وہ چُپ تھی اور گہری سوچوں میں رات بھر جاگتی رہی تھی اور میں اس کی خاموشی سے اور بھی زیادہ ڈر گیا تھا۔

اور جب ایک ہفتہ بعد اس کا ایک خالہ زاد بھائی جو انگلینڈ کے مضافات میں عرصہ سے رہ رہا تھا، میرے گھر آیا اور اُس نے میرے سامنے ایک کاغذ رکھا تو مجھے شمسہ کی خاموشی کا راز سمجھ میں آگیا، اُس نے اپنے دس ہزار کے حق مہر کے بدلہ میں ایک لاکھ کے حق مہر کے کاغذ پر دستخط کروانے چاہے تھے۔

"لیکن میں اتنا حق مہر کہاں سے ادا کروں گا؟" میں اُن دونوں کے درمیان بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا........ لیکن ان کی گرفت مجھ پر میری عقل سے کہیں زیادہ مضبوط تھی.....

"مسٹر سلمان ہمیں اپنی بیٹی کا مستقبل تو بہر حال محفوظ کرنا ہے۔ اور آپ کو دستخط

کرنے پڑیں گے۔ صرف دستخط ہی تو ہیں۔ آپ کو دینا تو کچھ بھی نہیں پڑے گا"..... اور میں جان گیا تھا کہ مجھے اس پر دستخط کرنے ہی ہیں۔ فرار یا انکار کا کوئی راستہ نہیں...... اور پھر میں نے چپ چاپ دستخط کر دیے۔

شمسہ نے بڑی نفرت سے کہا تھا....." سلمان اگر تم نے مجھے لوگوں میں خواہ مخواہ بدنام کیا تو یاد رکھو یہ ایک ہی خط تمہیں جھوٹا بنانے میں پورا اُترے گا...... تمہاری ساری عزّت دھری رہ جائے گی....." اور وہ فرہاد کو اُٹھا کر اپنے خالہ زاد کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی... اُس نے مجھے بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی.... وہ عورت کی آزادی اور انگلینڈ میں ان کے حقوق سے پوری پوری آگاہ تھی۔ اور فرہاد رو رہا تھا۔ میں نے اسے ساتھ لگا لیا۔ میں نے بانو کو ناامیدی کی اس گہری کھر میں آخری سہارے کے طور پر خط لکھا تھا...... میں نے ابا کو بھی خط لکھا تھا۔ میں نے اپنی بربادی کا ذمہ دار ان کو ٹھہرایا تھا۔

اور امی نے جواب دیا تھا۔ میرے بچّے انسان اپنی قسمت کا اتنا مالک نہیں ہوتا۔ ہم سب ایک دوسرے سے بندھے ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں زندہ ہیں۔ تم نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور تم ہی سب سے زیادہ ستم ظریفی کا شکار ہوتے۔ میں تمہارا دُکھ سمجھتی ہوں...... تم نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے آپ کو حالات کا شکار بنا ڈالا.... اور اب تمہارا ایک بچّہ بھی ہے....... اگر ہو سکے تو جلد واپس آ جاؤ.... تمہاری رہائی کا ایک ہی راستہ کھُلا ہے......

لیکن شمسہ جانے کے لیے تیار نہیں تھی...... ابھی ہمارے پاس اتنے روپئے جمع نہیں ہوئے تھے کہ ہم واپس جا کر ایک بڑا سا مکان خرید سکتے۔ ابھی مجھے ایک سال اور دو دو شفٹوں میں کام کرنا تھا.....

مجھے بانو کے خط کا انتظار تھا..... لیکن مایوسی کی یہ دُھند ابھی نہیں چھٹی تھی...... اور پھر میں نے سوچا..... میں کیوں ہمیشہ حالات کے مخالف رُخ چلتا ہوں...... میں کیوں قسمت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں کیوں ماضی کے اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہوں...... میرا ماضی تو اُس روز ہی مجھ سے بچھڑ گیا تھا، جب ہوسٹل کے کمرے میں میں نے

لذتوں کے ایک نئے جہان میں قدم رکھا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والے سال محض سراب اور دھوکا ہیں......

اور پھر میں نے شمسہ کو خوش رکھنے کی کوشش شروع کردی۔ میں نے اُلٹے رُخ بہنا چھوڑ دیا تھا...... مجھے لگا تھا جیسے میرے جسم کی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہو...... بس جی رہا تھا، کیونکہ مایُوسی کے اندھیرے میں فرہاد کی ہنسی تھی...... مجھے حالات سے دوستی کرنی چاہیے...... میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ میں اب شمسہ کے ہر کام کی تعریف کرتا اور سب سے زیادہ فرہاد کی ذات نے مجھے اپنی ننھی باہوں کی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے دو ننھے ننھے دانت دو چمکیلے ستارے لگتے تھے، جو میری زندگی پر روشن تھے...... مجھے شمسہ کو خوش رکھنے کا طریقہ سمجھ آ گیا تھا۔ میں اکثر اپنے دوستوں کی دعوت کرتا۔ ہم نے چند انگریز خاندانوں کو بھی دوست بنا لیا تھا۔ میرے دوست شمسہ کی تعریف کرتے، تو وہ خوش ہوتی۔ اور پھر مرد اس کے جسم کی خُوب صُورتی کی تعریف کرتے اور میں مُسکراتا...... مجھے مُسکرانا ہی تو چاہیے تھا...... گذرا وقت تو گذر گیا تھا...... اور شمسہ کی معیت میں زندگی کا وسیع مطلب مجھے سمجھ میں آ رہا تھا...... زندگی صرف رات کے لمحوں میں قید نہیں۔ میں جو آج تک اپنے خیالوں میں جکڑا جیتا آ رہا تھا......

...... اپنے سے علیحدہ ہو کر دُنیا کو دیکھ رہا تھا...... ہاں دُنیا تو انوکھی اور وسیع ہے...... پھر میں دوستوں کی محفلوں میں اپنے اُس ذوق کا اظہار کرنے لگا...... میں میوزک پارٹیز دیتا پھر ہم پاکستانی دوست مِل کر خُوب خُوب گیت گاتے اور سارے گیتوں کو ٹیپ ریکارڈ کر لیتے۔ ہمارے انگریز دوست بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور پھر ہم ملکر انگلش گیت گاتے...... مِل کر برتن دھوتے...... اب مرد جب شمسہ کی تصویریں پکنک اسپاٹس پر کھینچتے، تو میں فرہاد کو سنبھالنے بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا...... اور پھر میں نے سارے یورپ کی سیر کر ڈالی...... اور جب ہم واپس آئے تو بانو کا خط آیا رکھا تھا...... اور میرے دفتر کا شفاف میز اس کی موجودگی سے بھرا بھرا لگتا تھا۔ اُس خط کو لے کر میں کتنی ہی دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا۔ میں کب تک ماضی میں سفر کرتا رہوں گا۔ میں کب تک ان لذتوں کی کھوج میں بھٹکتا رہوں گا۔ جو بہت پیچھے چھُوٹ گئی ہیں۔ مجھے اپنے مستقبل سے رشتہ استوار کرنا چاہیے...... شمسہ کا جسم

کتنا خوبصورت ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ جانتی ہے۔ اور پھر فرہاد۔ میرے اور اس کے تعلق میں کوئی شک نہیں ..... فرقان اور فریحہ کو اُٹھاتے ہمیشہ میرے دل کا چور مجھے اپنے اندر سے جھانکتے لگتا تھا۔ میں ان کو کبھی اپنے کندھوں پر بٹھا کر بازار نہیں لے گیا تھا.....
..... ہمارے درمیان ایک پردہ تھا ..... اور میرا دل چاہتا تھا کہ وہ پردہ ہمیشہ پڑا رہے۔ اور شفاف میز کی سطح اُس خط کے وجود سے بھر گئی تھی اور میں ہمیشہ کی طرح بانو کے متعلق اپنے کسی فیصلے پر پورا نہیں اُتر سکا تھا ...... اس نے لکھا تھا:

میں نے اپنی تبدیلی ایک اور شہر میں کروالی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہارا شوہر کہاں ہے، تو میں بتاتی ہوں کہ وہ مزید پڑھائی کے لیے انگلینڈ گئے ہیں۔ تب میری کولیگز کے چہروں پر ایک حسرت سی چھا جاتی ہے ..... اپنی محرومی پر ...... اور میں دل ہی دل میں ہنستی ہوں ..... فرقان اور فریحہ خاصے بڑے ہو گئے ہیں۔ اور میں ان کو اُس گھر میں بند کر کے آتی ہوں، جو میں نے کرایے پر لے رکھا ہے۔ گاؤں سے کبھی نہ کبھی کوئی رشتہ دار آجاتا ہے، تو اس کا خیال ذرا کم ہو جاتا ہے۔ نہیں تو فرقان فریحہ کا جھولا ہلاتے ہلاتے زمین پر ہی سو جاتا ہے۔ یا بند دروازے کی موری سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے ..... اور مجھے آوازیں دیتا رہتا ہے۔ اور ڈیوٹی دیتے دیتے اتنی دور مجھے لگتا ہے۔ جیسے اس کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہو.....
..... لیکن مجھے کوئی تو کام کرنا ہی ہے۔ زندگی گذر جائے گی ...... تمہارے بھیجے ہوئے سوئیٹر مل گئے تھے۔ اور انھوں نے میرا بھرم رکھنے میں خاصا کام کیا ہے ..... میں سوچتی ہوں میں اُن دنوں کو بھول ہی جاؤں تو اچھا ہے، جب ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے ..... مجھے اپنی پوجا کروانے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ ہر مرد جو میری طرف بڑھتا ہے۔ مجھے ادھورا اور بے وقوف لگتا ہے۔ کیونکہ وہ توجہ دینے کی بجائے توجہ مانگتے ہیں ..... تم نے بھی مجھے کس قدر غلط عادت ڈالدی تھی ...... میں تو اتنا اُلجھ گئی ہوں کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا مستقبل۔ میرے سہانے سپنے ...... میرا گھر ...... سب کچھ مستقبل کی گہری دھند میں چھپے ہوئے ہیں اور میں ایک جگہ رُک کر اُن کا انتظار کر رہی ہوں ..... فرقان اور فریحہ کمرے میں بند ہوتے ہیں اور میں اپنے اندر قید ..... وہ تو زمین پر سو جاتے ہیں، لیکن میں خوابوں کی قوسِ قزح میں اُڑتی رہتی ہوں ... لیکن

تم تک نہیں پہنچ سکتی۔ اصل میں مَیں نے وقت سے بہت پہلے اُڑنا شروع کر دیا تھا نا.....
.... لیکن مَیں اپنے کیے پر پشیمان نہیں ہوں ..... مَیں اپنے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی اور اب بھی اپنے لیے ہی زندہ ہوں ...... اب تو مجھے اکثر تمہاری یاد بھی نہیں آتی، کیونکہ دُنیا میں ہر طرف مَرد ہی مَرد بکھرے پڑے ہیں۔ اور اس راہ پر چلنا جس راہ پر مَیں تمہاری معیت میں چلتی رہی تھی کوئی مشکل نہیں ...... مَیں چاہوں تو ہر رات ایک نیا مَرد میری زندگی میں آسکتا ہے .... یہ بات پڑھ کر تم غصّے سے بھر گئے ہو گے ..... لیکن فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ...... تم نے مجھے کبھی اپنے بیوی اور بچّوں کے بارے میں نہیں لکھا .... سوچتے ہو گے .... مجھے بُرا لگے گا شاید ...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ...... آخر میری زندگی میں مرد آتے ہی رہتے ہیں ۔ چاہے چند گھنٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو ...... اگر ہو سکے تو کچھ روپے بھیج دینا، کیونکہ میرا گذارہ ذرا مشکل ہے "

مَیں میز کے کنارے بیٹھا بیٹھا کانپنے لگا تھا ..... تو بانو بھی ایک سراب تھی ..... بانو جس کے لیے میری زندگی کے سارے خوبصورت جذبات تھے۔ اور مَیں نے اُن جذبات کو اُس پر سے نچھاور کر دیا تھا اور اب اُسے ایک مرد کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ اُسے پُوجا کروانے کی عادت پڑ گئی ہے اور مَیں دُور ہوں ..... شاید ابّا نے ٹھیک کہا تھا کہ "داشتہ اور بیوی میں بڑا فرق ہوتا ہے"۔ بانو جانتی تھی کہ اگر وہ میری محبوبہ رہے گی، تو مَیں اس کی اُنگلی کے گرد لپٹے دھاگے سے بندھے لٹّو کی طرح گھومتا رہوں گا ..... لیکن جب وہ بیوی بنے گی تو مَیں اس کو ایک نئی روشنی میں دیکھوں گا۔ سب کچھ مِٹ رہا ہے ..... نہیں ابھی سب کچھ نہیں مِٹا ..... ابھی بھی میرے دامن میں خوشیاں بھر سکتی ہیں۔ مَیں شمسہ اور فرہاد ۔ مستقبل تاریک نہیں .... مجھے اپنے دل میں نئی روشنیاں جلانی ہیں۔ مجھے نئی قندیلوں کی روشنی میں آگے بڑھنا ہے ..... فرہاد کے دو ننھے بازو میرے گلے میں حمائل ہیں ..... اور شمسہ کا جسم بانو سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے ...... مَیں نے خط کو آہستہ آہستہ پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر دیا اور پھر بجھے دل سے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا ...... اور باس کے بُلانے پر اس کے کمرے میں چلا گیا .....

میرے باس نے کہا تھا "مسٹر سلمان چائے کے برتن پڑے ہیں۔ آپ نے انہیں صاف

کیوں نہیں کیا...... آپ کو یہ کام کرنا ہے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے......" اور میں جو اکثر چائے بنا کر سب کے ساتھ مل کر پیتا تھا، ایکدم بھڑک اٹھا تھا......" مسٹر ایڈمنڈ میں آپ کا ذاتی نوکر نہیں ہوں...... اور میرا درجہ اگرچہ آپ سے کم ہے، لیکن میں برتن صاف کرنے نہیں آیا۔ ...... آپ خود صاف کر سکتے ہیں..... آپ نے مجھے کیا سمجھ کے بات کی ہے......" اور میرا دل کرتا تھا کہ میں چائے کے گندے برتن اُٹھا کر مسٹر ایڈمنڈ کے سر پہ دے ماروں.....

..... میں اپنے کمرے میں آگیا تھا اور پھر میں نے اپنا استعفیٰ لکھ کر میز پہ رکھا اور اُس بڑی سی عمارت سے باہر آگیا جس کی بیسویں منزل پر میرا دفتر تھا..... میں نے مڑ کر اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کو دیکھا اور اُس کی ردّی کی ٹوکری کے متعلق سوچا جس میں بانو کا پُرزہ پُرزہ خط پڑا تھا۔ ..... لیکن پھر بھی بانو کا قدِ آدم مجسمہ میرے دل میں ایستادہ تھا... جب میں نے اپنے فلیٹ کے دروازے پر اپنے آپ کو کھڑا پایا تو میں حیران رہ گیا۔ کس طرح میں اتنی دُور پیدل آگیا تھا ..... میں نے دروازہ کھولا اور اپنے بستر پر گر کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا..... میری پچھلی زندگی کے ماہ و سال..... میری زندگی کی تمام خوبصورتیاں..... میرا اپنا آپ..... سب کچھ فنا نہیں ہو سکتا..... نہیں ہو سکتا..... میں زندگی میں پہلی بار بچّوں کی سی بے بسی سے رو یا تھا۔۔ ..... اور میرے آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا..... فلیٹ کی کھڑکیوں سے باہر ہمیشہ کی طرح دُھند میں لپٹا شہر تھا۔ اور کہیں نیچے بہت نیچے گاڑیوں کا شور تھا..... اور میں نے زندگی میں دُوسری دفعہ نیند لانے والی گولی کھائی تھی..... ہاں نیند نے ایک مہربان ماں کی طرح مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

چار سال کے دن ایک کے بعد ایک گذر گئے تھے اور جب میرے جہاز نے کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تو دُور اُوپر گیلری کی چھت پر اَن گنت چہرے تھے جو آپس میں طے جُڑے کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ میں فرہاد کا کھلونا تھا اور شمسہ نے اپنی ساڑھی کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے بازو میں بیروت سے خریدا ہوا بڑا سا بیگ تھا، جس میں اُس نے مصنوعی زیورات بھر رکھے تھے۔ میں نے آسمان کی نیلاہٹ کو دیکھا کراچی کا آسمان افق تا افق پھیلا ہوا تھا اور سمندر کی تیز ہوا میں ایئرپورٹ پر ایستادہ جھنڈا پھڑپھڑا رہا تھا...... مجھے لگا جیسے کسی پچھلے جنم میں میں نے

اس دھرتی کو دیکھا تھا۔ اس آسمان کی نیلاہٹ مجھے انگلینڈ کے دھند آلود آسمان کے مقابلے میں عجیب بے رنگ اور پھیکی لگی تھی۔ اور سورج کی تیز دھوپ میں میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں ..... اور میں انگلینڈ کی برف کو یاد کر رہا تھا۔ میں وہاں کی دھند کو یاد کرتا تھا...... اور فرہاد کی بے بی سسٹر کو جس نے آتے ہوئے فرہاد کو یہ کھلونا دیا تھا اور جس کو میں تھامے ہوئے چل رہا تھا......

مجھے بی بے اور گل کی آوازیں سنائی نہیں دی تھیں جو انھوں نے اپنے شوق کی پوری قوت سے لگائی تھیں..... وہ گیلری کی چھت پر کھڑی تھیں اور ہاتھ ہلا ہلا کر میرا نام پکار رہی تھیں۔ امّی اور ابّا اپنے ہاتھوں میں چمکیلے ہار لیے کھڑے تھے...... بھائی جان کی بیوی نے ہار پہناتے ہوئے کہا تھا...

"جہاز تو اتنا لیٹ آیا ہے کہ ہم واپس جانے والے تھے" بے بی اور گل میرے گلے کے ساتھ لگی رو رہی تھیں۔ اور امّی نے میری پیشانی کو چوم کر اور اپنے پلّو سے آنکھیں پونچھ کر مجھ پر کسی قرآنی آیت کو پھونکا تھا..... اور ابّا نے کہا تھا...... "تم تو بڑے خوبصورت لگ رہے ہو میرے بیٹے"..... شمسہ کے والدین سامان کو سمیٹنے میں لگے تھے.... اور شک بھری نظروں سے میرے والدین کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان تمام واقعات کا تھوڑا سا حصّہ بھی تو امّی ابّا کو نہیں لکھا تھا..... جو شمسہ نے اپنے والدین کی ہدایات پر میرے ساتھ کیے تھے۔ میں جانتا تھا وقت اب میری بے چارگی اور والدین کی دوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور میں وقت کے بے رحم ہاتھوں میں ایک کھلونا تھا...... اور ان چار سالوں میں میں ان کا عادی بھی تو ہو گیا تھا...... شمسہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتی تھی...... اُس نے سب روپئے اپنے نام کروا لیے تھے...... کیونکہ ان کے خاندان میں ایسا ہی رواج تھا...... فرہاد کا ہاتھ پکڑے میں نے ان سب لوگوں کو غور سے دیکھا...... اور پھر میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ ان سب کے دوبارہ ملنے پر خوش کیوں نہیں ہوں...... مجھے یہ کیوں اجنبی اجنبی سے لگ رہے ہیں۔ کیوں میں نے آگے بڑھ کر بے بی کے آنسو نہیں پونچھے۔ کیوں میں نے دوری کی تڑپ سے بے چین ہو کر امّی کو پیار نہیں کیا...... میں دل میں خوفزدہ کیوں ہوں...... کیوں صرف میرے ہاتھ میں پکڑا

یہ چھوٹا سا ننھا سا میرے بیٹے کا ہاتھ ہی اتنی بھری پری دُنیا میں تنہا مجھے اپنا لگ رہا ہے......
.....اور سارے رشتے...... سب اپنے لوگوں کا پیار مجھے اپنی طرف کھینچ نہیں رہا......سب
جو شاید مجھ سے اب بھی پیار کرتے ہیں۔ دھیرے دھیرے چلتی الیکٹرک ٹرالی سے کسی نے اپنا
آخری بکس اُٹھایا..... ایک جوان عورت جاتے ہوئے نوجوان کو آنسوؤں بھری آواز میں
خدا حافظ کہہ رہی تھی......اور بھائی جان کی بیوی اپنے چھوٹے سے بیٹے کو ایک کونے میں
بیٹھی دُودھ پلا رہی تھی.....اور پھر نہ جانے کیوں مجھے بانو ایکدم یاد آ گئی.....بانو جس کو
مَیں نے اپنی پوری کوشش سے بُھلا دیا تھا.....مَیں نے گھریلو لذتوں میں اپنا آپ بھولنا چاہا
تھا۔ اور اس میں مجھے کامیابی بھی تو ہو گئی تھی، لیکن برسوں بعد آج جب کہ مَیں پختہ ارادہ کر کے
جہاز سے اُترا تھا کہ پچھلی ساری باتیں میرے لیے مر چکی ہیں...... مَیں ایک دفعہ پھر یادوں
کی اذیت میں تنہا کھڑا تھا..... اپنوں کے درمیان جو شوق اور محبت بھری نظروں سے
مجھے دیکھ رہے تھے۔

حالات کے دھارے کو مَیں نے اپنی سمت بہانا چاہا تھا.....لیکن پھر شمسہ اور میرے
درمیان پچھلی تلخیاں اُبھر آئی تھیں۔ مَیں جو انگلینڈ میں اکیلا تھا، اب اس قدر خوفزدہ نہیں تھا۔
مَیں نے اس کا ناجائز رُعب ماننے سے انکار کر دیا تھا اور حالات اِس قدر تلخ ہو گئے کہ شمسہ
اپنے والدین کے پاس چلی گئی اور اس نے مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں.....اس نے
میرے ماضی کا کھوج لگایا تھا اور یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق مجھے اپنی گرفت میں لینے
کے لیے میرے خلاف نئے نئے الزامات کی ایک زنجیر اپنے والدین کے ساتھ مِل کر تیار کر رکھی
رہی تھی۔ تاکہ مَیں ان میں بندھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے قدموں میں لوٹتا رہوں......اور
وہ ان تمام باتوں کو کوڑے کے طور پر میری برداشت اور ضمیر پر آزماتی رہے.....اُس نے
میرے ماضی کو اپنی باتوں سے میرے سامنے زندہ کر دیا تھا.....اُس ماضی کو جس کو مَیں نے
دفن کرنا ہی بہتر سمجھنا چاہا تھا۔

مَیں اور شمسہ چھ ماہ سے ایک دُوسرے سے خفا تھے اور مَیں اپنے اندر کی گھٹن کو کسی طرح دُور
نہیں کر سکا تھا۔ ننھا فرہاد مجھے یاد آتا رہتا اور مَیں اپنے دفتر کے بعد سائیکل لے کر سڑکوں سڑکوں

پھرتا اور تھک کر رات پڑے گھر آجاتا.....

بانو اور بچے ایک دُور کے شہر میں رہتے تھے..... لیکن میں نے اپنا تمام تعلق ان کے ساتھ ختم کر دیا تھا..... میں بانو کے پاس جا کر اپنے حالات کو اور زیادہ بگاڑ نہیں سکتا تھا — اور پھر مجھے معلوم تھا کہ شمسہ کے والدین بانو کی پوری پوری رکھوالی کر رہے تھے..... اور میں دل ہی دل میں شمسہ اور اس کے بچھائے ہوئے جال سے خوفزدہ تھا..... اور پھر فرہاد کا ننھا سا وجود جو میری کُل کائنات بن گیا تھا۔ میں اپنی کائنات کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں خلا کی گہری دلدل میں خودکشی نہیں کر سکتا تھا..... مجھے زندہ رہنا تھا، میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ سے زیادہ شدّت اور پختگی کے ساتھ۔ اور شمسہ مجھ سے زیادہ اپنی فتح چاہتی تھی..... ہم دونوں حالات کے موٹے رَسّے کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ ہم دونوں اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ایک دُوسرے کی شکست کے خواہاں تھے..... اور پھر ایک روز میری برداشت کی طاقت میرا ساتھ چھوڑ گئی..... میں شمسہ سے ان حالات میں جیت نہیں سکتا تھا، لیکن میں اپنے ساتھ کیے گئے وعدہ کو توڑ کر اس کی طاقت کو شکست دے سکتا تھا..... اِس کی اُس طاقت کو جس پر اُسے ناز تھا۔

لائل پور کی گہما گہمی اور بھیڑ بھاڑ میں ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے میں نے اس گنجان اور گرد آلود شہر کو دیکھا۔ لوگوں کے گروہ اور ان کے خوشیوں سے تہی چہرے..... اور آوازوں کا ایک بے ہنگم شور..... اور ان سب شور و شغب سے زیادہ میرے اندر اُٹھتا ایک الگ شور تھا..... میں خوش تھا کیا..... نہیں..... مجھے معلوم تھا کہ میں صرف ایک موہوم امید کے سہارے بانو کے پاس جا رہا ہوں..... میں اور بانو اب ایک راہ نہیں چل سکتے۔ ایک ساتھ نہیں چل سکتے..... میرے اندر کسی اخلاقی خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا..... میں تعلق کے اس زہر کو ابھی تک امرت سمجھتا تھا..... جسموں کا وہ تعلق جس میں میری رُوح اٹک گئی تھی..... میں نے بانو کو یا اپنے آپ کو کبھی بھی کسی اخلاقی جرم کا سزاوار نہیں سمجھا تھا..... میری رُوح ہمیشہ اس کے گرد منڈلاتی رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ میں اس کی گرفت سے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں..... میں اس کو خوش رکھنے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اس کے برتن دُھو سکتا ہوں۔ اس کے لیے کھانا پکا سکتا ہوں..... اپنی تمام ضرورتوں کو بھول کر اس کے لیے ڈھیروں

تجھے لاسکتا ہوں ...... لیکن وہ میرے اندر چھپے اس بزدل انسان کو نہ جان سکی تھی، جو ایک دن اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا...... یہ خوف خدا کا خوف نہیں تھا بلکہ فرقان اور فریحہ کے اندھیرے مستقبل کا خوف تھا۔ اور جب مَیں نے ایک تنگ سی گلی میں داخل ہونے سے پہلے دیکھا تو دُور تک پھیلے ہوتے گھر خاموش تھے۔ موریوں میں گندا پانی بہہ رہا تھا اور گھروں کی کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردوں سے روشنی کی مدھم اور تیز لکیروں کا جال تھا جو گلی کی اینٹوں پر پڑ رہا تھا۔ تب میرا دل میرے پہلو سے ٹکرا ٹکرا کر دھڑکنے لگا تھا...... میرا سارا جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ اور مجھے شدّت کی پیاس نے گھیر لیا...... مَیں جو اتنا تھکا دینے والا لمبا سفر کر کے آیا تھا.. ...... اُمید اور نا امیدی کے ایک نئے دوراہے پر کھڑا تھا...... بانو اس وقت گھر میں کیا کر رہی ہوگی...... اور دونوں بچّے تو یقیناً ان چار سالوں میں بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے .... دونوں بچّے ...... مجھے ان سے کس طرح ملنا چاہیے...... کیا مَیں ان کو پیار کر سکوں گا.. ...... کیا مَیں ان کو اسی طرح لپٹا کر ان کا مُنہ چُوم سکوں گا، جس طرح مَیں فرہاد کا چُومتا ہوں ...... کیا بانو اب بھی ان کو کمرے میں بند کر کے ڈیوٹی پر جاتی ہوگی...... اور وہ دونوں موری کے سوراخ میں باہر دیکھنے کی کوشش میں گرد آلود فرش پر ہی سو جاتے ہوں گے۔ نہیں مجھے ان سب باتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے...... یہ تو میری یادوں کا حصّہ ہیں۔ وہ یادیں جو انگلینڈ کی گرتی برف کی سفیدی میں چپکے سے میرے دل میں اُتر آتی تھیں اور مَیں برف کی مانند ہی خاموش اور یخ ہو جاتا تھا...... اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتا تھا...... مجھے لوٹ جانا چاہیے...... ہو سکتا ہے اب اس نے اس شادی کر لی ہو۔ اور وہ خوش ہو ...... مَیں نے آنے سے پہلے بہت مہینوں بعد اسے خط لکھا تھا...... ... شاید میں اب بھی اس کے جادُو میں گرفتار تھا۔ شاید اب بھی میں اسی شدّت سے اس سے محبّت کرتا تھا۔ اور مَیں اس کو کھو دینے کا غم بُھلا نہیں سکا تھا...... ہاں میں اُسے بھول نہیں سکا تھا۔ وہاں گلی کے سامنے کھڑے کھڑے مجھے لگا تھا کہ مَیں وقت کے اُسی کنارے پر کھڑا ہوں اور اُسی لمحے کی صلیب پر لٹک رہا ہوں۔ جب مَیں نے اپنے ہوٹل کا دروازہ ایک نئے سفر کے آغاز پر بند کیا تھا...... مَیں آج بھی اسی کمرے میں بند ہوں ...... مَیں تو کہیں

بھی نہیں گیا تھا..... اور میرے سامنے بانو کھڑی ہے...... اور ساری دُنیا خلا میں تحلیل ہو گئی ہے۔

جب میں نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو چھوٹے سے صحن میں مدہم روشنی تھی۔ اور سامنے کمرے میں وہ سب بیٹھے تھے۔ وہ سب جو کبھی میری زندگی کا ایک حصّہ تھے لیکن اب ان کے اور میرے درمیان ایک دُوسرا آدمی کھڑا تھا.... اذیت.... دُکھ... بیچارگی اور محرومی کو اتنی شدّت سے میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا... میں ایک لمحے کی صلیب پر لٹکا ہوا تھا اور موت کی اذیت کو محسوس کر رہا تھا.... میں واپس مُڑنا چاہتا تھا۔ لیکن کونسی راہ پر..... کہاں ...... کہاں...... میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کھولتے ہوئے سوچا تھا.... بانو مجھے دیکھ کر اپنی خوشی کے بوجھ سے بھاری آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے گی اور پھر ہم سب کو بھول جائیں گے..... لیکن بانو میری طرف آئی تھی.....اور اس کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی.... ہم دونوں ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے تھے ......دو مسافر..... دو اجنبی..... جو ایک دُوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر وہ دُوسرا آدمی جو بانو کے ساتھ کھڑا تھا..... اور اُس نے بانو کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا... اور میں جلن اور اذیت کی تیز دھار سے خون خون ہو کر بہہ رہا تھا۔ مِٹ رہا تھا... مٹتا ہی جا رہا تھا......

جب اُس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کرسی پر بٹھایا ہے، تو میرا سارا وجود سائیں سائیں کی آواز کے ساتھ تیز تیز گھوم رہا تھا۔ اور زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی تھی......

"آئندہ تم یہاں نہیں آؤ گے"..... اُس نے اپنی فوجی وردی کے بٹنوں کو چھوتے ہوئے تیز آواز میں کہا تھا..... وہ بے چینی سے کمرے میں پھر رہا تھا.....اس نے کھونٹی پر ٹنگی اپنی ٹوپی کو اُتارا۔ سر پر رکھا، جیسے وہ ابھی باہر جانے کے لیے تیار کھڑا ہو، لیکن دُوسرے ہی لمحے اُس نے ٹوپی کو دوبارہ کھونٹی پر لٹکا دیا تھا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا دراز قد میری نظروں کے سامنے چھا گیا تھا.... اور اُس کی آنکھیں.....

"تم اتنے برسوں بعد یہاں کیا لینے آئے ہو جبکہ تم اس کو طلاق دے چکے ہو....."

وہ شائد اپنے اندر کھولتے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کا سوچ رہا تھا.....

مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی..... میں تو بزدل تھا..... میں نے تو اسے کھو دیا تھا..... میں تو اتنے برسوں اس کی یاد کو بھلانے میں ہی لگا رہا تھا..... اور بھلا نہیں سکا تھا. ..... میں نے دور کھڑی بانو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ اس کا بھرم رکھنے کی التجا.....

"میں کتنا لمبا سفر کر کے تو یہاں تک آیا ہوں..... مجھے کچھ دیر تو آرام کرنے دو۔" میں تھکی تھکی آواز میں بولا..... "مجھے بچّوں سے تو ملنے دو۔" "نہیں یہ بچّے تمہارے نہیں ہیں۔. ..... یہ بچّے بھی میرے ہیں..... میں ان کو یقین دلا دوں گا کہ میں ہی ان کا باپ ہوں..... ..... تم ان کی راہ میں نہیں آؤ گے، تو یہ میری بات کا یقین کر لیں گے..... یہ مجھ سے پیار کرتے ہیں اور میں بھی اِن سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں بانو کو پیار کرتا ہوں..."

بانو کا نام سُن کر میرا دل چاہا تھا کہ میں آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا دوں..... اس کو کیا حق پہنچتا تھا کہ بانو کا نام لے..... میں ایکدم کھڑا ہو گیا..... کیوں بانو آگے بڑھ کر اس کی غلط فہمی دور نہیں کرتی..... کیوں بانو نے آجتک اس کو نہیں بتلایا کہ وہ مجھ سے الگ نہیں..... ..... اور میں نے بانو کو کہنا چاہا تھا..... لیکن پھر اس کی وہی التجا بھری آنکھیں میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں..... وہ آنکھیں جو ہمیشہ مجھ پر جادو سا کر دیا کرتی تھیں..... میں ابھی بانو کی نئی دنیا کو تہہ و بالا کر سکتا تھا..... میں ابھی بانو کے اس جھوٹے لبادے کو تار تار کر کے اسے برہنہ کر سکتا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ سوائے میرے کوئی دوسرا مرد اُسے اس حالت میں قبول نہیں کرے گا۔ وہ ایک گندگی بنکر ساری عمر گذارے گی..... لیکن بانو کی جادو کرتی دو آنکھیں مجھے دیکھتی ہی جا رہی تھیں اور میں ان کی تپش میں پگھل کر ختم ہوتا جا رہا تھا..." تم نے کب بانو سے شادی کی ہے؟" میں نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی مجھے شادی کی فرصت نہیں۔ ابھی ہم سرحدوں پر ہی ہیں۔ اور جب میں سرحد سے پیچھے آجاؤں گا، تو پھر میں اپنا ایک گھر بناؤں گا اور بانو اور بچّوں کو لے جاؤں گا۔" وہ خواب دیکھتی آنکھوں اور آواز میں بتا رہا تھا..... "تم کب سے بانو سے واقف ہو..."

"مجھے تو لگتا ہے مَیں ازل سے اسی عورت کی تلاش میں تھا.... مَیں انتہائی زخمی ہو کر ہسپتال میں آ گیا تھا..... اور بانو نے اپنے خلوص اور ہمدردی سے میری زندگی مجھے واپس دلائی تھی..... مَیں اس کو مسکراتے دیکھ کر بستر پر لیٹا لیٹا سوچا کرتا تھا..... مَیں ایسی ہی ہستی کی خواہش تو کیا کرتا تھا..... یہ عورت ہی تو وہ عورت ہے جس کو بیوی بنانے کی تمنا مجھے تھی....." وہ بول رہا تھا....

اور مَیں نے وہاں بیٹھے بیٹھے دل میں کہا تھا "تم مجھ سے زیادہ سچے اور ایماندار ہو۔ تم نے اسے بیوی بنانے کا سوچا تھا..... تم میری طرح بزدل نہیں ہو..... تمہارا حق مجھ سے زیادہ ہے۔ اور ہو سکتا ہے مَیں نے بانو سے کبھی محبت ہی نہ کی ہو۔ اور مجھے صرف اپنے آپ سے محبت ہو" وہ کہہ رہا تھا" اور پھر جب مجھے بانو کی زندگی کے المیے کا پتا چلا، تو مَیں نے اسے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ہم فوجی لوگ سچ بولتے ہیں....." اُس نے دوبارہ اپنی وردی کی کریز کو دُرست کیا اور ٹوپی اپنے سر پر اوڑھ لی۔ اُس کے انداز سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

"جب بھی مجھے لمبی چھٹی ملی تو ہم شادی کریں گے۔ پہلے مَیں اسے اپنے گاؤں لے جاؤں گا...... اور پھر شہر میں ایک خوبصورت مکان بنواؤں گا..... جس میں بانو رہے گی...." ....؛ وہ شاید پھر خوابوں میں کھو گیا تھا.....

یہ خواب جو انسان کے دل کو ہمیشہ ہی گھیرے رہتے ہیں۔ اور انسان ان کے جالوں میں مکڑی کے جالوں کی طرح گھرا رہتا ہے۔ دُوسروں کی تاک میں تا کہ وہ ہمارے خوابوں کو مکمل کر سکیں سارا وقت صرف ہم اپنے سے محبت کرتے رہتے ہیں۔ اپنی ہی پُوجا کرتے ہیں۔ اپنے ہی بُت کے لیے مندر تعمیر کرتے ہیں..... دُوسرے ہمیں صرف اس مندر کی تعمیر میں اینٹ گارے کا کام دیتے ہیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے احساس ہوا تھا کہ مَیں تو ہمیشہ اپنی ہی خواہشوں کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا تا رہا ہوں۔ مَیں نے بانو کی سچی خوشی کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا...... اُس روز بھی نہیں جب وہ میرے بھائی کی دلہن بن کر گئی تھی۔ مَیں نے اسے اپنے جسم کی اندھوں خواہشوں کی بھینٹ چڑھا دیا...... اور سوچتا رہا کہ مَیں اُسے چاہتا ہوں..... اُس روز بھی وہ میرے سامنے موجود نہیں تھی جب مَیں اسے چھوڑ کر دُور دیس نئے مستقبل

کی تلاش میں چلا گیا تھا...... میں نے اُسے کوئی گھر دینے کا نہیں سوچا تھا۔ میں نے اُسے کوئی عزّت دینے کا نہیں سوچا تھا...... اور اب یہ ایک آدمی جو اُسے سچی خوشی اور گھر کے خوبصورت تصوّر سے سجانا چاہتا ہے تو میں پھر بانو سے یہ سب کچھ چھین لینے کی خواہش کیوں رکھتا ہوں اسے سچّائی اور نیکی کی ایک راہ نظر آ رہی ہے۔ اُسے اس پر چلتے ہی جانا چاہیے۔

"شادی کے بعد بانو مزید ٹریننگ کے لیے امریکہ چلی جائے گی...... دونوں بچّے بھی ساتھ ہی چلے جائیں گے"...... وہ اپنی زندگی کی پوری اسکیم بتا رہا تھا...... اُس کی آواز امیدّ اور روشنی سے گرم تھی...... "اور وہ گھر؟"...... میں نے سوچا تھا بانو کو ایک خوبصورت گھر مل جائے گا تو اس کی زندگی کی محرومی کی تلافی ہو جائے گی...... "لیکن اب" وہ گھر ہم واپس آنے پر تعمیر کریں گے...... میں بھی کچھ مہینوں کی رُخصت لے کر ان کے ساتھ جانے کا سوچ رہا ہوں۔ اور ہو سکتا ہے میں فوج کی نوکری چھوڑ دوں...... بانو کو وہاں میری ضرورت ہو گی...... ...بچّوں کو سنبھالنا اور ان کے اخراجات پورے کرنے ہوں گے۔ میں بھی وہاں کام کرونگا"

اُس نے سوئی ہوئی فریحہ کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا......

......فرقان حیران نظروں سے اپنے بستر پر لیٹا مجھے دیکھ رہا تھا...... میں نے سوچا میں آگے بڑھ کر اُسے اپنی گود میں اٹھا لوں اور اتنا ہی پیار کروں جتنا میں فرہاد سے کرتا تھا... ......لیکن میں کرسی کی سخت پشت سے لگا بیٹھا رہا...... میں اب کبھی بھی اس خلیج کو پار نہیں کر سکوں گا۔ اس خلیج کو جس کے اس پار وہ چاروں کھڑے تھے...... ہاتھوں میں ہاتھ دیئے... ......میں نے رنج سے سوچا...... اس نے اپنی گھڑی کو دیکھا...... اور دیوار کے ساتھ ٹنگے آئینہ میں دیکھ کر بال بنانے لگا......" مجھے اب جانا ہے...... مجھے صبح اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے......" وہ کچھ دیر میرے سامنے کھڑا ہو کر مجھے دیکھنے لگا...... جیسے میرے جانے کا منتظر ہو ......لیکن چُپ تھا...... اس نے کھونٹی سے ٹنگی ٹوپی اُتاری اور بانو کو ایک نظر دیکھ کر باہر چلا گیا......

ابھی تھوڑی دیر بعد مجھے بھی جانا ہے...... ہمیشہ کے لیے اور پھر وہ دُوسرا آدمی میری جگہ لے لے گا...... وہ دُوسرا آدمی بانو کے جسم پر قبضہ جما لے گا...... میں اُس وقت

بھی صرف اپنے اور بانو کے بارے میں سوچ رہا تھا...... مجھے فریحہ اور فرقان یاد نہیں آ رہے تھے.......

"کیا نام تھا اس کا.....؟" میں نے بانو سے ہولے سے پوچھا... "ارشد اعوان"

میں نے بانو کے لہجے کی مٹھاس کو محسوس کیا تھا... یا یہ میرا وہم ہی تھا.....

مجھے اب چلنا چاہیے..... میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سب طرف اندھیرا تھا... اور مجھے ان اندھیروں میں ہی اپنی راہ بنانی ہے..... میں نے بانو کو دیکھتے دیکھتے سوچا.... کیا یہ وہ آدمی نہیں جن کی تصویر آپ کے پاس تھی اور جس کو اب آپ نے اپنے بکس میں رکھ لیا ہے۔ آپ کہتی تھیں یہ میرے ڈیڈی ہیں" فرقان اُٹھتے ہوئے بولا:

"چُپ کرو فرقان"..... بانو سختی سے بولی..... "سو جاؤ..... اتنی رات گئے کیوں جاگ رہے ہو..... سو جاؤ جا کر....."

"مما کیا یہ میرے ڈیڈی نہیں..... یہ میرے ڈیڈی ہی تو ہیں..... میں نے ان کو پہچان لیا ہے....." وہ بستر سے اُتر کر میرے سامنے کھڑا تھا.....

آنسوؤں کی دُھند میں مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا..... یہ فرہاد سے کسقدر ملتا ہے..... فرقان اور فرہاد...... میں نے پھر کوشش کی تھی کہ اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں لیکن میں تو ہل بھی نہیں سکتا تھا..... میں پتھر کا بن گیا تھا شاید....

"مما اکثر جب آپ گھر نہیں ہوتیں تو میں اس تصویر کو نکال کر دیکھتا ہوں.... آپ جھوٹ بول رہی ہیں..... یہ میرے ڈیڈی ہی تو ہیں۔ اور میں تو ہر رات ان کا انتظار کرتا تھا۔ ...." وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آیا تھا...... اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں"

"اب مجھے چلنا چاہیے" میں پھر نیم مُردہ آواز میں بولا تھا.... میں نے اس کا آگے بڑھا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ کیا فائدہ۔ کیا فائدہ ...... "سلمان تم حالات کو سمجھ رہے ہو۔ مجھے ان بچوں کو ایک باپ دینا ہے۔ اور اُمید ہے تم ان کی راہ میں نہیں آؤ گے...." بانو نے فرقان کو بستر پر لیٹا کر میرے پاس آ کر کہا تھا۔ فرقان رو رہا تھا۔ تم اب یہاں کبھی نہیں آؤ گے.... میں اپنے ماضی کو دفن کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ پچھلی باتیں بھلا چاہئیں۔

......ان کو دُہرانا فضول ہے..... تم یہاں پھر کبھی نہ آنا...."

"کیا یہ ڈیڈی ہی ہیں نا؟" فرقان پھر بستر میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا.... وہ شک بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ "نہیں بیٹے میں تو خبر لے کر آیا تھا کہ تمہارے ڈیڈی دُور دیس میں تھے اور پھر وہاں پر مر گئے...."

"ڈیڈی مر گئے کیا...." فرقان کو موت کا مطلب سمجھ نہیں آرہا تھا....

"ہاں مر گئے...." میں اس کے بستر کے پاس کھڑا ہو گیا.... میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا.... "میرے بیٹے تمہارے ڈیڈی مر گئے.... میرے بیٹے ....." میں رو رہا تھا.... "تمہارے ڈیڈی مر گئے.... مر گئے...."

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو..... وہ تصویر بالکل تمہاری جیسی ہے.... تم ہی میرے ڈیڈی ہو ..... یہ دُوسرا آدمی مجھے اچھا نہیں لگتا...."

"بہت سی شکلیں ایک دُوسرے سے ملتی ہیں فرقان.... بانو پھر اُسے لیٹنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ "لیٹ جاؤ میں تمہارے لیے ایک نیا ڈیڈی ڈھونڈ لوں گی...." اس کی آواز میں غصہ تھا.... "لیکن وہ تصویر"..... فرقان شک بھری نظروں اور آواز میں کہہ رہا تھا ...." وہ تصویر کسی کی بھی نہیں...... وہ تصویر نقلی تھی.... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو" بانو کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی.....

"اب مجھے چلنا چاہیے" میں صحن میں نکل آیا تھا۔ اس چھوٹے سے صحن میں ایک طرف ٹرائی سائیکل اور چھوٹی سی جیپ پڑی ہوئی تھی..... اس پر دُھلے ہوئے بچوں کے کپڑے ہوا میں ہل رہے تھے..... اور اُوپر آسمان کے اندھیرے میں ستارے چمک رہے تھے۔

"سلمان مجھ سے آخری وعدہ کرو کہ تم دوبارہ نہیں آؤ گے...." اس کی آواز میں پھر التجا تھی.....

میں نے بانو کو دیکھا..... اور پھر ہمیشہ کے لیے اُس دروازے سے باہر آگیا۔ اس دروازے کے باہر جس کے اندر میرا بیٹا اور بیٹی تھے.... لیکن میں ان کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا.... اور اسی میں میرے گناہوں کا مداوا تھا.....

تمہارے ڈیڈی مر گئے فرقان بیٹے۔ مَیں نے تیز تیز قدموں سے گلی کو عبور کیا۔ روشنی کہیں بھی نہیں..... روشنی کہیں بھی نہیں...... میری زندگی کے رائیگاں ماہ و سال...
.... اوہ خُدا ......

اور اب مَیں نے پھر زمانوں بعد اپنے پیچھے دیکھ لیا ہے۔ اور مَیں پتھر کا بن گیا ہوں.....

مار گزیدہ

ڈاکٹر داؤ سے بات کرنے سے پہلے مجھے احساس کی اس شدّت کا گمان تک بھی نہ تھا۔ مَیں تو بس یُونہی مینٹل ہاسپٹل چلا آیا تھا۔

میرے ذہن کے اس خوابیدہ گوشے کو رات رَاحیلہ کی دہکتی قربت نے جگا دیا تھا اور پھر برسوں پہلے کا ایک عُریاں جسم مجھے یاد آ گیا تھا۔ ایک نادر مجسّمہ جو آنکھیں بند کیے میرے سامنے کھڑا تھا، لیکن سفر کا وہ ایک قدم میرے لیے کڑے کوس بن گیا تھا۔ اور مَیں نے گبھرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔ اور نُدرت کو اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اس کی خوبصُورت آنکھیں حیرانی اور شرم سے پھیل گئی تھیں۔ اُس کے آنسو اُس کی گالوں پر بہنے لگے تھے۔ اُس کے ہونٹ کپکپا کر ساکت ہو گئے تھے۔ مَیں نے بند آنکھوں سے ہی چیخ کر کہا تھا۔ "چلی جاؤ نُدرت، چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں، مجھے تمہاری کوئی خواہش نہیں۔ مَیں غم سے محبت نہیں کرتا۔ دوبارہ یہاں نہ آنا۔" اور پھر وہ چلی گئی۔ اور جب اُس کے بھاگتے قدموں کی چاپ ڈوب گئی تو مَیں یوں بیٹھا رہ گیا تھا، جیسے اس لمحے سے پہلے اور بعد میں کوئی لمحہ اتنا زندہ نہیں تھا۔ وہ لمحہ جو اپنی تخلیق کی ساعت میں قید ہو گیا تھا۔

اکثر جب میں جام کو ہاتھ میں لیے پینے لگتا ہوں یا اپنے کمرے کی نیم تاریک روشنی میں کسی دوشیزہ سے بہت ہی خوب صورت باتیں کرتا ہوں، تو وہ لمحہ کہیں نہ کہیں سے آ کر میرے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ پھر میرے ہاتھ ایک لمحہ کے لیے کانپ جاتے ہیں اور ٹھنڈ کی تکلیف دہ

لہر مجھے ہراساں کر دیتی ہے، حالانکہ نُدرت سے مَیں نے انتقام لیا تھا۔
ایسی ہی لہر مَیں نے رات محسوس کی تھی جب راحیلہ کے کمرے میں بیٹھ کر مَیں نے آنے والے دل پسند لمحوں کی دُھند سے راحیلہ کو جھانکا تھا اور پھر وہی لمحہ کہیں سے آن کر میرے ذہن پر رقصاں ہوگیا۔ مَیں گھبرا کر بغیر معذرت کیے، یا خُدا حافظ کہے، انٹر کانٹی نینٹل کے لمبے کاریڈار سے بھاگتا باہر آگیا تھا۔ وہ لمحہ جو نُدرت کی مانند ہی بے ضرر تھا، لیکن انوکھا، میری دسترس سے دُور اور پرے۔ میری مضبوط گرفت میں نہ آنے والا۔
اُس روز مسز رفاقت نے فون پر کہا تھا " مائی سُویٹ بوائے! راحیلہ گھر ملو کرائسس سے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان ہے، اس لیے اس کو بہلانے کے لیے مَیں نے چند قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ ضرور آنا۔"
اور جب مَیں نے انٹر کون کا گیٹ عبور کیا ہے، تو مَیں تو آنیوالے وقت کی خوب صُورتی سے دل ہی دل میں مُسکرا رہا تھا۔ ارغوانی مَے۔ خوبصورت ماحول۔ جوان جسم اور پھر بے باک قہقہے۔ انٹر کون کی خوبصورت عمارت پوری طرح روشنیوں کی زد میں تھی، لیکن کمروں میں کہیں کہیں جلتے لیمپ۔ ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی مچی آنکھوں سے اشارہ کر رہا ہو۔ بُلا رہا ہو۔ درختوں کے نیچے یو۔ بی۔ ایل کے روشن نیون سائن بورڈ تھے۔ اور سُرخ لائٹس میں لکھا ہوا ہوٹل کا نام اس طرح لگ رہا تھا جیسے تازہ خون کی سُرخی منجمد ہوگئی ہو۔ درختوں کی شاخوں میں الجھا ہوا اور مٹا مٹا اندھیرا تھا اور درختوں کے اوپر اندھیرے کا وسیع جال تھا۔ اپنی گاڑی کو لاک کرتے ہوئے مَیں ایک بہت ہی ماڈرن دُھن گنگنا رہا تھا۔ جب بار میں گیا ہوں تو بیرا ٹرے میں بوتل اور گلاس رکھے لے جا رہا تھا۔
مجھے دیکھ کر مسز رفاقت نے کہا تھا۔
"یُونانی بوائے! تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو۔ راحیلہ تمہارا انتظار کرتے کرتے بور ہو رہی ہے"
مَیں نے جُھک کر مسز رفاقت کی گال پر ایک بھرپور بوسہ لیا تھا اور راحیلہ کے پاس بیٹھ گیا تھا۔
راحیلہ نے جب میرا ہاتھ پکڑا تو وہ بہت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"اسلم صاحب! آپ وقت کی اہمیت سے بالکل غافل لگتے ہیں۔ بہت انتظار کروایا"۔ راحیلہ نے برف کی ڈلی میرے گلاس میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

مَیں ہنس دیا تھا اور زمرد کو دیکھنے لگا تھا جو گلاس کو پکڑے پاؤں سے تال دیتی سوچوں میں مگن تھی۔ اُس نے خالی گلاس کو زور سے تپائی پر رکھا اور کھڑی ہو گئی۔

سُر کے خوابناک لہریے دل کو دھڑکاتے ہوئے ہمارے چاروں طرف پھیل رہے تھے جیسے کوئی خوبصورت رُوح اِس ہال کی چار دیواری سے اُڑ کر فضائے بسیط میں گم ہونا چاہتی ہو۔ اُونچی بہت اُونچی۔ بہت دُور۔ نیلے آسمان کی پہنائیوں سے بھی پرے۔ وہاں پر موجود سب لوگ خوش تھے۔ ہمارے پاس خوب صُورت جسموں کی گرمی تھی۔ اور پھر ہم سب جو ایک دُوسرے سے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے، ایکدوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

مَیں نے اُٹھ کر زمرد کے خوبصُورت جسم کے گرد اپنے بازو ڈال دیے اور تیز سُروں کا ساتھ دیتے ہوئے گھومنے لگے تھے۔ راحیلہ نے اپنی آنکھیں بند کر کے سَر کو صوفے کی پشت پر رکھا ہوا تھا اور مسز رفاقت فخرالدین کے ساتھ لگی بیٹھی پی رہی تھی۔ ہم سب آگے پیچھے گھومتے جا رہے تھے۔

"زمرد جی، آپ کا جسم واقعی ڈانس کے لیے بنا ہے۔ اگر آپ ڈانس نہ کریں تو یہ آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی۔ آپ کو بازوؤں میں لے کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا گداز اور لوچ کیا معنی رکھتا ہے"!

اُس نے جھٹکے سے اپنے آپ کو مجھ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم جانتے ہو کہ عورت کو کیسے خوش کیا جاتا ہے، اسی لیے تم مجھے اچھے بھی لگتے ہو، لیکن میں خوش ہونے کے مُوڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے کئی دنوں سے کوئی کنٹریکٹ نہیں ملا۔ اس لیے چُپ چاپ ناچتے جاؤ۔ اُس نے کاؤنٹر کے پاس جا کر نیا گلاس اُٹھایا اور میرے کندھے کے ساتھ سَر لگا دیا۔

اور جب مَیں اپنے آپ سے خوش خوب صُورت جسم کی لذّت سے مسحُور ہو رہا تھا، تو مجھے نُدرت کی حیران اور روتی ہوئی آنکھیں بار کے چاروں طرف سے جھانکتی نظر آنے لگیں۔ اور میرے بازو

زمرّد کے جسم کے ساتھ لگے اکڑے سے گئے تھے۔ اُس محرومی سے خوفزدہ سے جو نُدرت کی یاد سے وابستہ تھی۔ مَیں نے زمرّد کو اپنے اور بھی نزدیک کر لیا تھا۔ مَیں اِس جسم سے لگا، اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جو کبھی بھی پوری طرح میری گرفت میں نہیں آیا تھا اور جس کی یاد مجھے اُس پیمانے کی یاد دلاتی تھی جو انتہائی تشنہ لبوں تک نہ پہنچ سکا ہو۔ وہ جسم ایسا ہی تو پیمانہ تھا۔ وہ ایسا ہی تو لمحہ تھا۔ اور پھر مَیں خوفزدہ ہو کر زمرّد کی تپش کے باوجود سرد ہو گیا تھا۔

یہ آنکھیں ..... یہ آنکھیں مجھ سے کِس بات کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ مَیں نے اپنے آپ سے پُوچھا تھا۔

اور زمرّد کہہ رہی تھی ”وہ پروڈیوسر کا بچّہ ابھی تک نہیں آیا۔ اُسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔

اور مسز رفاقت کہہ رہی تھیں ”بے بی مَیں تمہاری بے چینی سمجھتی ہوں، تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور جب نینی تال کے ساتھ مَیں رُاحیلہ کے ساتھ بیٹھا ہوں تو مَیں نے گذری باتوں کو اپنے ذہن سے پوری طرح جھٹک دینا چاہتا تھا۔ مَیں نُدرت کے بارے میں تو کم از کم کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ایسا وَرق تھا جس پر مَیں اپنے حسبِ مرضی کوئی تحریر نہیں لکھ سکا تھا۔ مَیں تو اُسے ایسا صفحہ سمجھنا چاہتا تھا جو ہوا کی تیزی میں اُڑتا کہیں گم ہو گیا ہو بغیر کوئی سوچ چھوڑے، لیکن مکمل راحت کے اُس ماحول میں گھِرا مَیں اُس کی پھڑپھڑاہٹ کو سُن رہا تھا۔ مَیں نے راحیلہ کے اُداس چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

”راحیلہ اِن خُوب صُورت لمحوں کو یُوں ضائع کیوں کر رہی ہو۔ کیا یہ سب خُوب صورتیاں اور مسّرتیں تمہارے دل کو خوش نہیں کر سکتیں۔ مَیں نے بظاہر یہ لفظ راحیلہ سے کہے تھے، لیکن مَیں اپنے دل کے اندر اُس برف کی سِل کو پگھلانا چاہتا تھا جو نُدرت کی آنکھوں کے تصوّر سے میرے اندر اُتر آئی تھی۔ وہ مجھے کیوں یاد آ رہی تھی۔؟

رُاحیلہ نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ سامنے کی روشنی کے مدّھم گلوب کو دیکھ رہی تھی اور جب مَیں نے جُھک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا، تو اس کی آنکھیں نَم آلود تھیں۔ نُدرت

کی آنکھیں..... ندرت کی آنکھیں۔ نہیں تو..... نہیں تو.....

"اسلم صاحب ایسی عورت کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ جس کا شوہر اُس کو ٹھکرا چکا ہو۔ جس کا بچہ اُس سے بچھڑ چکا ہو۔ جس کی زندگی کو لامتناہی اکیلے پن اور دُکھ کا سامنا ہو۔ اُس نے گلاس کو پاس پڑی تپائی پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھ کر خاموش ہوگئی۔

اُس کی گود میں پڑے دو ساکن ہاتھ مجھے اُن ہاتھوں کی یاد دلا رہے تھے جو ندرت کے چہرے پر دھرے تھے۔ میَں ان ہاتھوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میَں اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی شدید خواہش کے باوجود میَں نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ اُس وقت میَں نے سوچا تھا۔ عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سب عورتیں برابر ہی تو ہیں۔ اور پھر میَں نے اپنی اَنا کی اتنی بڑی قیمت وصُول کر لی تھی۔ مجھے تو بہت خوش ہونا چاہیے تھا۔ پر نجانے کیا بات تھی کہ میَں ندرت کے تصوّر سے ہمیشہ خوفزدہ اور ٹھنڈا ہو جاتا ہوں۔ کیا میرا یہ گناہ دوسرے گناہوں سے مختلف اور انوکھا تھا۔ میَں سوچنا چاہتا تھا، لیکن میرا ذہن منجمد ہونا لگتا اور میَں گھبرا کر کسی بہت ہی ضروری کام میں اپنے آپ کو لگا کر اُسے بھُول جانے کی کوشش کرتا۔ اُس کے جسم کے بارے میں میَں کیوں سوچتا ہوں جو پوری طرح اُنگلیوں کی پَوروں سے مس بھی نہیں ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے مجھے فاروق یاد آ گیا۔

چند دِنوں بعد میرے دوست فاروق نے آ کر کہا تھا۔ "معلوم ہے دوست ندُرت کا کیا حال ہے؟"

میَں نے کبھی کبھار اُس کے متعلق سوچا تو تھا، لیکن میَں اُس کی یاد کی کسی گرفت میں قید نہیں تھا۔ شکست کو یاد رکھنا شکست خوردگی کی نشانی ہے۔

کیوں کیا ہُوا اُسے؟ میَں نے اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے اُن آخری ساعتوں کو یاد کیا تھا اور مُسکرا کر فاروق سے پُوچھا تھا۔

"وہ پاگل ہو گئی ہے اور زنجیروں میں بندھی اپنے سَر کو چاروں طرف ٹپکتی ہوئی کہتی رہتی ہے۔" روشنی بند کر دو..... روشنی بند کرو۔ کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں عُریاں ہوں۔ میں کتنی عُریاں ہوں۔ اور تم یُوں بے تعلقی سے کھڑے میرا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ سب روشنیاں

گُل کر دو۔ اندھیرے میں رُوح کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ اندھیرا تو ایسا نقاب ہے جو سب کچھ چھُپا لیتا ہے۔ اور پھر وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر رکھ لیتی ہے۔ شاید اس کو اپنی دونوں بند آنکھوں کا اندھیرا مطمئن کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی ساکت آنکھوں سے چپ چاپ اپنے سامنے دیکھنے لگتی ہے اور دیکھے ہی چلی جاتی ہے اور پھر جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ نُدرت کی امّی اس کی ساکت آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"میری بچی۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ اپنی ماں کو دیکھو۔ میری نُدرت ..... اور نُدرت بڑبڑانے لگتی ہے۔

"روشنی میں جسم عُریاں ہو جاتا ہے۔ روشنی بُجھا دو۔ روشنی بُجھا دو"

فاروق کی آواز کسی اندرونی غم سے بوجھل تھی۔

اور میں جو اَن گنت لذّتوں سے آشنا۔ اپنے گمان میں قید اس ساری بات کو ایک عام واقعہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے فاروق سے بہت کچھ پوچھنا چاہا تھا، لیکن میں تو ہنس بھی نہیں سکا تھا، حالانکہ میں نے زور زور سے قہقہے لگانے چاہے تھے۔ میں نے اپنی فتوحات کی لسٹ میں ایک اور جسم کا اضافہ کرنا چاہا تھا..... لیکن میرا دل ساکت ہو گیا تھا۔ اور میں خالی خالی نظروں سے فاروق کو دیکھنے لگا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہ گئے تھے۔

فاروق کے جانے کے بعد میں نے اپنے سامنے رکھی کھلی فائل کو آگے بڑھا کر پڑھنا چاہا تھا۔ جس کے لیے میرا پی اے کتنی دفعہ آچکا تھا، لیکن میں نُدرت کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے تو درجنوں لڑکیوں کی منتیں سُنی تھیں۔ میں نے تو عورت کو ہمیشہ ہی ایک کھلونا سمجھا تھا۔ ایسا کھلونا جس کو پھینکا بھی جا سکتا ہو۔ میں نے محبت کے خوبصورت لفظوں کو خراج سمجھ کر لیا تھا، لیکن یہ کیا ہوا کہ اس سب سے بڑے خراج کو وصول کرتے ہوئے میں بکھر کر رہ گیا تھا۔

پھر میں آفس ٹائم سے بہت پہلے ہی اُٹھ کر گھر آ گیا۔ میں نے سر جھٹک کر اُس

تکلیف دہ سوچ کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ اُس ہنسی کو بھولنا چاہا تھا جو میرے لاشعور میں نہ جانے کیوں محفوظ ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا "ندرت کیا تھی.... ندرت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ ندرت کا میری زندگی میں کوئی حصّہ نہیں تھا۔ اُن درجنوں عورتوں کی طرح جو صرف ایک رات کا ساتھ تھیں اور جن کو میں نے دوبارہ کبھی ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔" پر میں اپنے کمرے میں بیٹھا چُپ چاپ اُس کے متعلق سوچنے لگا۔ ندرت جو روشنی میں اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔ ندرت جو روشنی سے ڈر کر اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔ ندرت جو سراپا روشنی تھی اور میں نے اُس روشنی کو گل کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی اور "آخر کار میں نے اس روشنی کو گل کر ہی دیا نا۔" میں نے ہنس کر اپنے آپ کو خوش کرنا چاہا تھا لیکن کوشش کے باوجود میں ہنس نہیں سکا تھا۔ میں اپنی اَنا کی چکا چوند میں گھر اسب کو شکست دینا چاہتا ہوں۔ کسی کے مجھ سے آگے بڑھے ہوتے دو قدم مجھے مشتعل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں تو اپنے آپ میں ہمیشہ ہی خوش رہا تھا۔ لیکن اُس روز اپنی اَنا کے اندھیرے اور سیاہ رُخ کو دیکھ رہا تھا۔

سگریٹوں کے اَدھ جلے ٹکڑے میرے ایش ٹرے میں پڑے سُلگ رہے تھے۔ اور میرے دل پر ایسا بوجھ جو میری ناپسندیدگی کے باوجود میرے سینے میں ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان تمام جسموں کی قطار میں صرف ایک چہرہ تھا۔ جس پر دو ہاتھ دھرے تھے۔ رات بوجھل ہوگئی تھی۔ اُس بوجھل یاد کی طرح "ندرت منصور علی۔ آخر میں تم سے شکست کھا ہی گیا۔ میں نے جز بز ہو کر بے یقینی سے اپنے آپ سے کہا تھا۔ میں یادوں میں گم ہو گیا تھا..... اسلم صاحب بہت گہری نیند سے اچانک جگا دیا ہو۔ میں نے راحیلہ کے غمگین چہرے کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اُداسی مجھے اور بھی اُداس کر گئی۔ میرے دل میں اُس وقت اُس کے لیے نہ جانے کیوں رحم پیدا ہو رہا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ دینا چاہتا تھا؛ حالانکہ عورت کے آنسو مجھے ہمیشہ ہی تسکین دیتے ہیں۔ راحیلہ کو مسز رفاقت نے دُور سے دیکھ کر کہا تھا۔ "جاناں تمہارا گلاس ابھی تک خالی نہیں ہوا۔ اتنی سُستی بھی کیا۔ تم اپنے مہمانوں کو کس طرح زیادہ خوش کر سکتی ہو۔ دیکھو کتنی جاندار اور دلکش دُھن بج رہی ہے۔ اُٹھونا۔

اسلم بھی بور ہو رہا ہے۔

مم۔ میرا دل نہیں چاہتا۔ راحیلہ کی آواز میں اُداسی اور اندرونی چھپا غم تھا۔

"اُٹھو بھئی۔ جوان لوگ جب سُست ہو جائیں، تو ہم بوڑھے لوگ تو بالکل ہی مِٹ جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا زمرّد رانی ـــ" مسز رفاقت نے اس کی طرف اپنا گلاس لہراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمارا گلاس خالی کیوں ہے اسلم بیٹے۔ ایسی دل نشین راتوں میں خالی گلاس کو ہاتھ میں تھامے رکھنا بڑی بدذوقی ہے۔"

مَیں مسز رفاقت کو دیکھ کر مُسکرایا تھا اور پھر راحیلہ کا اُداس چہرہ مجھے اور بھی اُداس نظر آنے لگا۔ وہ بھی یادوں کے بھنور میں گھری تھی اور مَیں بھی چُپ چاپ بیٹھا تھا۔

"راحیلہ تمہارا بیٹا کتنا بڑا ہے۔" مَیں نے بے خیالی میں ہی پوچھ لیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے وہ اُن گذرے لمحوں کو یاد کر رہی ہو جو اس نے ایک مرد کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ اپنے بچّے کے نرم آگیں بوسوں کو یاد کر رہی ہو جو معصوم ہونٹوں سے اُس کے چہرے پر ثبت کیے گئے تھے۔

"میرا بیٹا۔ اس کی غمگین آنکھوں میں خوشی کی روشنی صرف ایک لمحہ کے لیے ہوئی تھی ــــ دوسرے لمحے وہ جوت بجھ گئی تھی۔ ٹمٹماتے دیئے کی مانند۔ یاد کی تُند ہوا سے۔

میرا بیٹا.... میرا بیٹا چھ سال کا ہے۔ وہ بہت ہی خوب صُورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی گرمی کی تپش تھی اور آنکھیں ماضی میں دیکھ رہی تھیں۔

ماضی تو کوئی حقیقت نہیں۔ بس لذّتوں کے وہ لمحے ہیں جو ایک زنجیر کی صورت میں حال سے مستقبل میں بدلتے رہتے ہیں۔ میرے لیے تو بس حال کا زمانہ ہی زندہ ہوتا ہے جب مَیں آئینے میں کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور پوری طمانیت کے ساتھ مسکراتا ہوں۔ اور میرے لبوں میں سگریٹ کا دھواں آنے والی لذّتوں سے مخمور ہو کر بل کھا کر فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔ ندرت منصور علی کو حاصل کرنے کی تگ و دَو میں میرے اندر کبھی وہ جوش پیدا نہیں تھا جو خوشی اور صرف پاکیزہ اور الوہی خوشی ہوتا ہے۔ دوسروں کے زندہ اور جاندار

جذبوں کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں اور پھر عورت جو میرے نزدیک لذّت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ نُدرت کو میں الگ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میرے نزدیک اس کی ذات میں ایسی کوئی الجھی ہوئی بات ہی نہیں تھی، جو بہت مشکل ہو۔ پھر بھی مَیں نہ جانے کیوں ماضی کی گذری باتوں کے متعلق سوچ رہا تھا؛ حالانکہ راحیلہ کا گداز جسم میرے ساتھ چھُو رہا تھا۔

"وقت سب سے بڑا مَرہم ہے راحیلہ ڈیئر! چھوڑو اُن باتوں کا ماتم، جو تم کو دھوکہ دے گئیں۔ جب تک تم پورے دل سے سُن سکتی ہو۔ تم وقت کو مات دے سکتی ہو۔ مَیں نے اس کے سرد ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ مَیں اپنی لگاتار آتی یادوں سے پریشان ہو اُٹھا تھا۔ میں اور راحیلہ مدہم روشنی کی زد میں بیٹھے تھے۔ ہمارے خالی گلاسوں کو بَیرا نئے سِرے سے بھر گیا تھا۔ اور جب جاز کے تیز سُر شوریدہ سری سے ہمارے کانوں سے ٹکراتے تو سب لوگوں نے اپنے ہاتھ تیزی سے گلاسوں کی طرف بڑھائے تھے۔ ہم دونوں نے بھی اپنے گلاسوں کو اُٹھا لیا تھا......

راحیلہ نے کہا تھا "اسلم صاحب مَیں ہمیشہ خوش رہتی ہوں، لیکن گذری باتیں بعض اوقات ایسے اُبھر آتی ہیں جیسے جھولتی روشنیوں کے ہنڈولوں سے سائے۔ اور پھر مَم کی زندہ دلی۔ ان کی دعوتیں۔ پارٹیاں اور نِت نئے لوگوں کی محبتیں۔ مَیں اُداس نہیں رہ سکتی۔ اسلم صاحب" اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا تھا۔ مَیں مَم کی شکر گذار ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔" اور پھر جب ہم دونوں تال کی لہروں پر تیر رہے تھے تو مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا وجود ہلکا پھلکا ہو کر دُھند میں اُڑ رہا ہو۔ اور میرے پاس کسی اور انجانی ہستی کا بھی وجود ہو۔ جو کہہ رہا ہو۔

"اسلم۔ عورت تو ازل سے حوّا ہے اور سانپ کے ورغلانے میں ہمیشہ ہی آجاتی ہے۔ اپنی حفاظت کے حصار سے نکل کر جادُو کے پھندے میں پھنس جاتی ہے۔ عورت محبت کے زہر کو ہنس کر پیتی ہے اور جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قربان کر دیتی ہے۔" یہ آواز کس کی ہے ..... مَیں نے سُروں کی دُھند سے اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے اپنے آپ سے پُوچھا۔ راحیلہ نے میرے کندھے پر اپنا سَر رکھ دیا تھا اور مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اُسے مسکراتے دیکھ کر

مجھے نُدرت کی ہنسی یاد آرہی تھی۔ نُدرت جو مینٹل ہاسپٹل کے گرد آلود فرش پر بیٹھی خلاؤں میں دیکھتی رہتی ہوگی اور پھر لمبے چوڑے میدانوں میں اُڑتی گرد اور تپش سے گھبرا کر خالی ذہن موٹی سلاخوں سے لگی دُوسری عورتوں کو دیکھتے دیکھتے اپنے دن گذار دیتی ہوگی .... مجھے نُدرت کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہیے، لیکن میں بے بس ہوں۔ فاروق ندرت کے بھائی کا دوست تھا۔ ایک روز اُس نے آکر کہا تھا۔

"دوست، عورت بھی کتنی نازک سی چیز ہے۔ ٹوٹ گئی تو ٹوٹ گئی۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں جُڑتی"۔ میں نے اُس سے نُدرت کے بارے میں پُوچھنا چاہا تھا۔ میں نے اُس کی بربادی سے لذّت لینی چاہی تھی، میں تو کب کا احساسِ گناہ کے اُس ہلکے سے تصوّر سے بھی چھٹکارا حاصل کر چکا تھا، جو پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا، لیکن میرے اندر سے کوئی چیز مکمّل خوش نہیں تھی۔ میں خاموش اُس کے ذکر کا منتظر رہا تھا اور فاروق نے کہا تھا۔

مجھے کبھی کبھی قدرت کی بے رحمی پر بڑا غصّہ آتا ہے۔ بھلا نُدرت کو کس بات کی سزا ملی۔ اُس سے کس بات کا انتقام لیا گیا مینٹل ہاسپٹل میں جانے سے پہلے اُس کا گھر میں بھی علاج کرنے کی کوشش کی گئی ..... لیکن اس کی ذہنی حالت اور بھی بدتر ہوگئی۔ وہ سب کمروں میں گھومتی ساری بتیوں کے سوئچ آف کرتی رہتی تھی اور پھر اپنے کمرے میں جاکر اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لیتی۔ نفسیاتی معالج تو اس کی توجیح عجیب ہی انداز میں کرتا تھا۔ وہ سارا خاندان تو بہت صحت مند رجحانات کا مالک ہے۔ ان کے ہاں بے جا بے حیائی اور بیجا حیا۔ دونوں کو ہی دخل نہیں .... کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟

اُس کی آنکھوں میں لکھے گئے سوال کو پڑھ کر میں نے بہت کچھ بتانا چاہا تھا۔ اُن لڑکیوں کے قصّوں کی مانند جو میری مردانگی کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں، ..... عورتوں کی رسوائی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، لیکن پھر بھی میں نُدرت کے بارے میں اور کوئی بات کر کے اُس رسوائی کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا جو نُدرت کی بیماری نے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی ..... اُس روز فاروق زبردستی مجھے باغِ جناح میں لے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا۔ جو اسے بے چین کیے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں اُداسی کے

سائے سے تھے۔ فاروق اور مَیں ایک نسبتاً اُداس کنج میں پھر رہے تھے۔ باغ کے کیفے میں لوگوں کا ہجوم تھا، غمگین چہرے، تھکے چہرے، اُداس چہرے۔ سب آپس میں گڈمڈ تھے۔ وہاں پر ہنسی کا ترنّم بھی تھا۔ زندگی اپنے بہاؤ پر بہے جا رہی تھی۔ اور فاروق کی معیت میں میرے اندر احساسِ گناہ بھی تھا جو میری فطرت کے خلاف تھا اور مَیں اُس سے چھٹکارا پانے کی خواہش پر بھی نہیں پا رہا تھا۔ مَیں کس چیز پر نادم ہو رہا تھا ..... میرا کون سا گناہ ہے؟ مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا..... اور نُدرت کا وجود اُن لانبے درختوں کے درمیان کسی صلیب پر لٹکا میری نظروں کے سامنے جھول گیا..... مَیں مداوا کرنا چاہتا ہوں، تو کس چیز کا مداوا کروں..... اور مداوا میرے بس میں کب تھا۔ بس کبھی کبھی جب زندگی کے ہنگاموں سے تھک کر مَیں رات کے پچھلے پہر آکر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ایک جسم اندھیرے کے کینوس پر اُبھرتا اور میری بند آنکھوں کے سامنے ٹھہر جاتا اور پھر مَیں درجنوں ہی اَدھ جلی سگریٹوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ اور تھک کر روشنی کر دیتا اور دُھندلے شیشوں پر ملگجی روشنی کے دائرے سے بنکر شیشوں کے بھُوتوں کو واضح کر دیتے اور نوکر آکر بیڈ ٹی رکھتا ایش ٹرے کو صاف کرنے کے لیے جاتا اور سہما سا میرے کمرے کی بے ترتیبی کو دُرست کرتا رہتا۔ اور پردوں کو برابر کر کے چلا جاتا.....

... پھر مجھے معلوم ہوتا کہ رات گذر گئی ہے۔ لمبی سیاہ رات۔

میری یادوں میں نُدرت کا بس اتنا ہی حصّہ تو تھا۔ اور وہ نُدرت جو مینٹل ہاسپیٹل کی سلاخوں سے لگی کھڑی تھی..... اُس کا تو خیال بھی مجھے شدّت سے نہیں آتا تھا..... مَیں تو اُس کے بعد بھی کئی لڑکیوں سے ملا تھا۔ وہ کوئی اکیلی تو نہیں تھی، پھر یہ کیا بات تھی کہ اُس کی یاد کے ساتھ شکست اور محرومی کی کسک مجھے پریشان کر دیتی۔ وہ کسک کیا تھی؟ نُدرت کو بغیر مَسلے کھو دینے کی جلن یا میرے اندر کوئی اور بھی جذبہ تھا جو دُوسروں سے الگ تھا۔ تب میرا ذہن بوجھل سا ہو جاتا اور ساری سوچیں گرم پتّھر کی مانند میری کنپٹیوں کو گرما دیتیں۔ مَیں خاموش دیوان پر لیٹا خالی ذہن سا ہو جاتا اور پھر الجھا ہوا سا آفس میں چلا جاتا۔ اور کسی خوب صُورت آواز میں ٹیلی فون مجھے ساری رات کی تھکاوٹ سے نجات دلاتا لگتا۔ مَیں زیرِ لب سیٹی بجاتا۔ فائلوں کے اوراق اُلٹتا..... سرسری نظر سے دیکھ کر دستخط کر دیتا اور

پھر شام کے خیال سے خوش ہو کر زور سے سگریٹ کا کش لے کر دُھواں اُڑاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی رات کی تھکن دُور ہو جاتی، لیکن اس روڈ وہاں پھرتے ہوئے مَیں فاروق کو کیا بتاتا۔ مَیں اپنی فتوحات کے قصّے کہہ سکتا تھا، لیکن مَیں نے تو ہمیشہ نُدرت سے شکست کھائی ہے اور اس شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے مَیں نے جو راہ چنی وہ بھی مجھے دھوکا دے گئی۔

اُس دن سکندر حیات کے گھر دعوت تھی۔ مخلوط پارٹی کی اُس گہما گہمی میں مَیں نے نُدرت کو دیکھا تھا۔ وہ فاروق کی بہن کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھی اور مَیں کوشش کے باوجود اپنی توجّہ کسی اور طرف مبذول نہ کر سکا۔ مَیں اس کو دیکھ رہا تھا۔ جو بے انداز حسین نہیں تھی، لیکن اس کے چہرے پر ایک انوکھی موہنی تھی۔ اُس کی ہنسی میں انوکھا سا ترنم تھا۔ میرے سب طرف خوب صورت چہرے تھے اور مجھے عورتوں کی توجّہ حاصل کرنے کے لیے کبھی بھی زیادہ تگ و دَو نہیں کرنی پڑی۔ پر میرا دل اس کو دیکھ کر نئے طور سے دَھڑکا تھا۔

"ڈیم ہر"، مَیں نے اپنے آپ سے کہا تھا اور اُن کے پاس پڑے میز سے گلاس اٹھانے کے لیے چل پڑا۔ بڑے سے مخملی لان میں شیشم کے دَرختوں کی اوُٹ سے چاند جھانک رہا تھا اور تیز روشنی میں پھولوں کے رنگ اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ درختوں کے پرے سُرمئی بادلوں کا رنگ تھا اور میرے سب طرف ہنسی کا جلترنگ تھا اور نُدرت کا چہرہ تھا، جو سب سے دلکش نظر آ رہا تھا۔

سکندر حیات میرے پاس آیا۔ اُس نے میرے انہماک کو دیکھ کر کہا تھا۔

"یار کیا بات ہے۔ چلو تعارف کراؤں۔" وہ مجھے اُن کے پاس لے گیا۔

"بھئی یہ میرے دوست اسلم ہیں۔ اور یہ ہیں نُدرت اور یہ ہیں پنکی رحمان۔ اپنے نام کی مناسبت سے بھی زیادہ گلابی۔" .... پنکی رحمان نے مجھے سلام کیا اور نُدرت کا ماتھے تک گیا ہاتھ ایک ساعت کو رُکا اور پھر وہ بڑی لاپروا ہی سے پلیٹ پر جُھک گئی تھی۔ اس کے خوب صوُرت ہونٹوں پر ہنسی سی تھی۔ وہ میرا وہم تھا اور پھر میں نے اپنی تمام صلاحیتیں اسے مرعوب کرنے میں لگا دیں تھیں، لیکن وہ لاپروا اور لاتعلق سی کھڑی رہی تھی۔ اُس نے ایک دفعہ بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

, پنکی رحمان کی ہنسی کے جلترنگ میں میں ایک اور آواز سُننے کی خواہش میں وہاں کھڑا ... بے سروپا باتیں کرنے لگا تھا۔ میں جو بہت سی فتوحات میں ایک مغرور شہنشاہ کی مانند گھرا رہتا تھا۔ ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے نُدرت کہہ رہی ہو۔

"کیوں اس قدر اچھل کود کر رہے ہو۔ میں ایسی ٹہنی تو نہیں جس کو تم جھکا کر توڑ سکو"

"دیکھا جائے گا" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔ جو میں زندگی کی تمام شیرینیوں سے شرابور رہنا جانتا تھا۔ اس ایک وقتی شکست سے کیسے ہار سکتا تھا۔ میں جو دوستوں میں اپنی کامیابیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتا تھا۔ یوں ایک دم ہراساں ہونے والا تو نہیں تھا۔ پر نُدرت کی لاپرواہی نے میرے غرور کے تناور پودے کو مرجھا سا دیا تھا۔ ندرت کا بے نیازی کا انداز ایک تازیانہ تھا۔ ایک چیلنج تھا۔ جس کو میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور مان لیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے درختوں کے مونگیا اندھیرے کے پیچھے چاند کے روشن چہرے کو دیکھا اور پھر اس ناکامی کو چھپانے کے لیے دوسرے لوگوں میں شامل ہو کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا تھا۔

اُس وقت اگر نُدرت کو میں ایک دفعہ بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا لیتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ میرے اندر کے زہر نے نُدرت کی زندگی کو ڈس لیا۔ فاروق سے باتیں کرتے میں چُپ ہو کر سوچنے لگتا۔ اور جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ جانے لگی تو میری رُوح کھینچ کر میری دو آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ صرف ایک خواہش کے لیے۔ کتنا اچھا ہوا اگر نُدرت جاتے ہوتے صرف ایک دفعہ ہی میری طرف دیکھ لے تو میں اپنے اندر اکٹھے ہوتے زہر کو ہنس کر مٹا دوں۔ لیکن گاڑی کے پٹ سے اُس کا صرف تھوڑا سا چہرہ نظر آیا تھا اور پھر اُن کی گاڑی لمبی سیاہ سڑک کے موڑ پر مڑ کر نظروں سے اُوجھل ہو گئی تھی۔

میں چُپ چاپ کھڑا چاند کے نیچے جمع ہوتے سفید بادلوں کو دیکھتا رہا تھا۔

سکندر حیات نے کہا تھا۔

"کہو دوست اُداس کیوں ہو......؟"

نہیں معلوم ہے اُداسی جیسے لفظ کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں اور میں نے ایک زور دار قہقہہ لگانے کی کوشش کی تھی، لیکن اُس قہقہے کے کھوکھلے پن سے ڈر کر میں نے جلدی سے انھیں خدا حافظ کہا اور پوری رفتار سے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا اور موڑ پر میری بریک کی تیز آواز دُور تک گونج گئی تھی۔

اور پھر باغ جناح میں اُس روز میں اور فاروق رات گئے تک گپیں ہانکنے کی کوشش میں پھرتے رہے تھے۔ فاروق مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاس بتانے کے لیے کوئی ایسی بات نہ تھی جو مجھ پر اپنے فخر کو ظاہر کر سکتی۔ اور میں رنگ و نور کے طوفان میں اپنے اندر سمٹ گیا تھا.... یہ سوچیں ..... یہ اندھیرے۔

راحیلہ کے سر کا بوجھ میرے کندھے پر تھا اور پھر راحیلہ نے کہا تھا۔

"اسلم صاحب آپ میرے شوہر سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔" راحیلہ میرے اور قریب آ گئی تھی۔

"میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ راحیلہ ڈیئر۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"راحیلہ بیٹی تھک تو نہیں گئی ہو۔" مسز رفاقت اپنے مہمانوں کو الوداع کہہ رہی تھی۔

"مم ڈیئر آپ میرا کس قدر خیال رکھتی ہیں۔" راحیلہ نے ان کے پاس جا کر کہا تھا۔

"مائی بے بی۔ یو آر مائی لائف۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

فخر الدین نے اپنی ٹائی دُرست کرتے ہوتے کہا تھا۔ "بے بی تمہاری ماں تو بہت وَنڈر فُل ہے۔ ایسے لوگ تو روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

زمرّد نے اُکتائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "مسٹر فخر الدین آپ اور پیجیے۔ ابھی ہوش میں ہیں۔ کوئی بہت تیز سا جام۔ تاکہ آپ کو ہماری رفاقت آنٹی ہی وَنڈر فُل نہ لگیں، بلکہ ساری دُنیا ہی وَنڈر فل ہو جائے۔"

"شریر لڑکی۔ پروڈیوسر کے نہ آنے سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی ہو تو میں تمہیں دو ہزار ماہانہ پر نوکر رکھ لوں۔ چلو گی میرے ساتھ۔" فخر الدین نے مسز رفاقت کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

"میں ابھی جوان ہوں اور اتنی مایوس بھی نہیں۔ شکریہ میں بوڑھے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔"
اور اُس نے زور سے تپائی کو ٹھوکر ماری تھی۔ یہ پر وڈیوسر کا بچّہ۔ سُوّر کی اولاد کہیں اور منہ کالا کر رہا ہوگا۔

"چ چ ...... چ چ۔ اتنی مایوسی۔ میری آفر اب بھی موجود ہے۔" اور فخرالدّین نے زور کا قہقہہ لگایا۔

زمرّد اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر غصّہ تھا۔ "آنٹی اب میں چلوں گی۔"
اُس نے راحیلہ کے پاس آکر مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور مسز رفاقت نے اس کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔

"میں موجود ہوں۔ فکر کیوں کرتی ہو۔ میری پہنچ سے کوئی بھی باہر نہیں۔"
"ذرا مجھے گاڑی تک تو چھوڑ آؤ۔" اُس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے راحیلہ کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پاس بالکل خاموش کھڑی تھی اور مدّہم روشنی میں بالکل ہی بے جان لگ رہی تھی، اُس کی ساڑھی کے جھلملاتے ستارے چمک رہے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں کی جُوت بجھی ہوئی تھی۔ باقی لوگ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ جیسے وہ سب لوگ وقت کے سحر میں قید حقیقت کی تلخیوں سے آنکھیں چُرائے اس جگہ اکٹھے تھے۔ لیکن پھر بھی ایک دُوسرے سے دُور اور ناواقف۔

زمرّد نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے ساتھ چلو۔ آج میں بہت اُداس ہوں۔ اور اکیلی بھی۔"

"پھر کبھی سہی"۔ میں نے سیاہ آسمان کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ آسمان مجھے راحیلہ کی مانند لگ رہا تھا۔ چمکیلا لیکن اُداس۔

ایک اُداس۔ غمگین عورت کو قابو کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور میں تو بہت سے تجربات اخذ کر چکا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" اُس نے پورے زور سے پٹ کو بند کیا تھا اور جب میں نے مُسکرا کر اُسے خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ ہلایا تو اس کی گاڑی گیٹ کو پار کر چکی تھی۔ مجھے کس بات

کی جلدی تھی۔ مجھے اپنی طاقت کا احساس تھا۔ زمرّد کو کبھی نہ کبھی میری کشش کھینچ ہی لائے گی۔"
مَیں نے راحیلہ کے غمگین چہرے کے متعلق سوچتے ہوتے اپنے آپ سے کہا تھا۔ مجھے دُوسروں کے غمزدہ چہروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مَیں تو زندگی کو ایک گیند سمجھ کر اپنے آگے آگے بھگاتا چلا آیا تھا۔

اور جب ہم تھکے قدموں سے چل رہے تھے تو راحیلہ نے کہا تھا۔

"بہت دُکھی ہوں اسلم صاحب۔" ہوٹل کے لمبے کاریڈار میں اندھیرا سا تھا۔ دُور کسی بلب کی دھیمی روشنی تھی۔ کسی اور منزل پر کوئی دروازہ بند ہوا تھا۔ کہیں مٹتی ہوئی قدموں کی چاپ تھی۔ ہر حرکت مکمل طور پر ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔

رات بہت گزر گئی ہے۔ راحیلہ۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے، لیکن وہ ایک معصوم بچّے کی مانند میرے ساتھ لگی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ پھر اس کی سسکیوں کی ہلکی سی آواز لمبے کاریڈار میں پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ میرا دل کسی انجانے خوشگوار خدشے سے دھڑک رہا تھا۔

راحیلہ چُپ چاپ مسہری پر بیٹھ گئی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر اس کے بیٹے کی تصویر رکھی تھی۔ اس نے اُس کو اٹھایا آہستہ سے چُوما اور پھر اُلٹ کر رکھ دیا۔

کمرے کا خوابگوں ماحول مجھ پر جادُو کر رہا تھا یا میری رگوں میں ساری شراب کی تیزی تھی جو مَیں نے اپنے اندر انڈیل لی تھی یا پھر اور بھی کچھ تھا۔

راحیلہ نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ میرے قدم قالین کی نرمی میں گڑے ہوتے لگ رہے تھے۔

رات تھوڑی ہی باقی ہے۔ مَیں نے ٹیبل لیمپ کو جلا کر گھڑی کے ڈائل کو دیکھا۔

"رات تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ رات کا تو کوئی کنارا نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے اسلم صاحب۔ مت جایئے۔ مت جایئے۔" اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ مَیں اسکے پاس بیٹھ گیا تھا اور کوئی تسلّی بھرا لفظ کہنا چاہا تھا۔ مَیں راحیلہ کے احساس کی باگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنا چاہتا تھا۔ مَیں جانتا تھا میرا جذبہ وقتی ہے

اور صبح جب میں جاگتی دُنیا میں شامل ہو جاؤں گی۔ تو میرے ذہن سے سب کچھ مٹ جائیگا اور میں بڑے مطمئن انداز سے سارے کام کروں گا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کو گُل کر دیا تھا۔ مکمل اندھیرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ باہر کی روشنیاں کمرے میں مدھم سا جال بن رہی تھیں۔

اسلم صاحب! میں نے بارہا مرجانے کی خواہش کی ہے۔ لیکن مَمۡ ڈھال بنکر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں"۔۔۔۔

میں اُس کی کوئی بات نہیں سُن رہا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ وہ خوف یا خوشی تھی۔ میں اس بارے میں جاننا نہیں چاہتا تھا۔

میں بڑے سکون کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تھا، لیکن پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ نُدرت کا سراپا ایک دم اُس مٹے مٹے اندھیرے میں اُبھر آیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھے ہوتے تھے۔ اور اسکی پوروں کے درمیان سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آج ہی میں اس اذیّت میں کیوں گرفتار ہو گیا ہوں"۔ ایسی اذیّت جس کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔

"راحیلہ مجھے معاف کرنا۔ اب میں جاؤں گا۔ میرا جی ٹھیک نہیں"۔ میں نے پہلی دفعہ خوفزدہ ہو کر کہا تھا۔

راحیلہ یوں کھڑی ہو گئی تھی جیسے اُسے شدّت کا غم اپنی گرفت میں لے رہا ہو۔ پھر ہم دونوں کچھ لمحے کھڑے رہے جاتے ہوتے میں نے جُھک کر اس کے بیٹے کی تصویر کو سیدھا کر کے رکھتے ہوتے اُسے دیکھا۔ وہ اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ نُدرت کی مانند۔

آج کی رات نُدرت میری یادوں سے کیوں وابستہ ہو گئی ہے۔ کیا میں اُس کے انتقام کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اُسی کے بارے میں سوچتا ہوا پا رہا تھا۔

تیز قدموں سے چلتا ہوا میں نیچے آیا تھا۔ لمبے کاریڈار میں میرے پیچھے سِسکیاں سی گونج رہی تھیں یا شاید باہر لان میں تیز ہوا چل رہی تھی۔

جب میں لان میں آیا درختوں کے پار سے فطرت کی گلابی جھانک رہی تھی اور ساری فضا پر اُداسی اور غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے اکیلی سڑک پر گاڑی کی سپیڈ تیز کرتے ہوئے اپنے ذہن کو خالی کرنا چاہا تھا لیکن میرا ذہن اور دل پُرانی یادوں سے بھاری ہو رہا تھا ..... یادیں جن کا ہر زاویہ نُدرت کے چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

میں اتنا مشتعل کیوں تھا۔ مجھے کن باتوں کا رنج تھا۔ میں نے تو نُدرت کی ذات سے اپنے کسی دُکھ کو وابستہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن نُدرت میرے حافظے کی سطح پر اُبھر رہی تھی۔ جیسے سیاہی کے پہلو سے روشنی کی خوابیدہ سی کرن جھانک رہی ہو۔

اُس روز اپنی کھڑکی میں کھڑے میرے ذہن پر مینٹل ہسپتال کی موٹی سلاخیں اُبھر رہی تھیں۔ جن کے پیچھے نُدرت کا جسم قید تھا۔ ہاں ...... وہ وہاں قید تھی، لیکن اُس کی رُوح تو تمام رنجشوں سے بالا تھی۔ میری یاد سے دُور۔ میرے دئیے ہوئے زخموں سے ماورا۔

میں نے ایک روز فاروق سے کہا تھا "تم آخر نُدرت کے معاملے میں اتنا تعلق کیوں محسوس کرتے ہو مینٹل ہاسپٹل میں سبھی لوگ کسی نہ کسی وجہ سے ہی آتے ہیں۔

تب فاروق نے دُکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

دوست کبھی کبھار وہ لوگ جنکو ہم سرِراہے جانتے ہیں یوں ہمارے دل میں بیٹھ جاتے ہیں جیسے وہ ہمیشہ سے وہاں تھے۔ اپنے اپنے سے قریب تر۔ میری داستان تو بہت لمبی نہیں اور اب کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور سب سے زیادہ تم کو تو کوئی غم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ تم اُن کو کبھی یاد نہیں کر سکتے۔ تمہیں کبھی یاد نہیں آ سکتیں۔ تم اُن کو جانتے ہی کب ہو۔

میں نے پوچھا تھا "تم میرے اور نُدرت کے بارے میں کیا جانتے ہو"

"صرف ایک لفظ کہ تم جو اُس کی بربادی کے ذمّہ دار ہو اس قدر بے حس کیوں ہو۔ کبھی جی بھر کر اس کی بربادی کا ماتم تو کر لیا ہوتا، تاکہ اُس کے ساتھ کوئی انصاف ہو جاتا۔"

"مَیں کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اُس کا ذہن اُس کی بربادی کا سبب ہے۔ مَیں کیا کر سکتا تھا" مَیں فاروق کو کیسے بتاتا کہ ندرت جو میری اَنا کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ میرے لیے ایک چیلنج تھی۔ اور مَیں نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔

"دوست تمہیں الزام کون دے رہا ہے۔ مَیں تو بس بات کر رہا ہوں۔ میں تو اس دُکھ کی داستان بھی تمہیں نہیں سُنانا چاہتا تھا جو میری بہن نے روتی آنکھوں سے مجھے سنائی تھی لیکن تمہارا سویا ضمیر کسی طور جاگ جائے تو۔ اور تم اُس کے لیے ماتم کرلو جو تمہارے لیے برباد ہوگئی۔ ایسا نہ ہو جب تم اُس کے لیے ماتم کرنے کی خواہش کرو تو وہ موت کے اندھیروں میں جا چکی ہو۔"

کیا تم بھی نُدرت سے محبت کرتے تھے" مَیں نے اُس کی باتوں کی کاٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پُوچھا تھا۔ اُس نے میز پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا اور طنز سے ہنس کر کہا تھا۔ اِس "بھی" کا بھی کوئی جواب نہیں دوست۔ مَیں تو اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا تمہیں۔ اور خاص طور پر اب اُس کے ہونٹ دُکھ سے کپکپا رہے تھے۔

میں اُسے کیا جواب دے سکتا تھا۔

"زندگی میں بعض ایسی غلطیاں انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کا کوئی مداوا نہیں ہوتا، تم بھی ایک ایسی غلطی ہو جو ندرت سے سرزد ہوئی اور اب تو وہ اس غلطی پر پچھتا بھی نہیں سکتی۔ اچھا ہی ہوا۔ اس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔ جانتے ہو چند روز پہلے میری بہن ثریا ندرت کی اُمّی کے ساتھ اسے ملنے ہاسپیٹل گئی تھی۔ جانتے ہو وہاں پر اُس نے کیا دیکھا"

"بتا دو۔ اگر یہ ساری بات اس کوشش میں ہے کہ مجھ پر کوئی الزام ثابت کرسکو تو یہ تمہاری بھول ہوگی" مَیں نے اُس وقت اپنے دل کو ہر قسم کی یادسی خالی پاتے ہوئے کہا تھا۔ میری آواز میں لاپرواہی تھی۔ مَیں گناہ کے احساس کا قائل ہی نہیں تھا۔

فاروق چُپ بیٹھا رہا تھا جیسے کسی بہت ہی تلخ مزے کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ندرت اور ثریا دوست تھیں" اُس نے بھاری آواز میں کہا تھا جیسے آنسوؤں کا ایک

سیلاب ہو جو ہر بند سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔
" نُدرت کے ہاسپٹل جانے پر ثریّا بہت روئی تھی۔ اور مَیں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مَیں جو نُدرت سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتا تھا۔ مَیں اپنے اندر کے چھپے جذبوں کو کیسے عیاں کرتا۔
مینٹل ہاسپٹل میں میٹرن کے کمرے میں بیٹھ کر ثریّا نے سوچا تھا نُدرت صاف ستھرے لباس میں کسی چارپائی پر خاموش اور اُداس بیٹھی ہوئی خلاؤں میں دیکھتی ہوگی۔ اندر پھول ہوں گے۔ گھاس کا سبزہ ہوگا۔ تتلیوں کے رنگین پر ہوں گے۔ لیکن جانتے ہو وہاں کیا تھا۔ وہاں پر گرد آلود زمین کی برہنگی تھی۔ سورج کی روشنی میں تپتا آسمان تھا۔ بارکوں کے برآمدوں میں بیٹھی عورتیں تھیں۔ جن کی آنکھیں خالی تھیں۔ جن کے چہرے تمام جذبوں سے تہی تھے۔ جن کے ہاتھ ساکن تھے، اُن کی آنکھیں آنیوالوں کو دیکھتی تو تھیں، لیکن اُن میں پہچان کی روشنی نہیں تھی۔ کسی کسی چہرے پر ہنسی تو تھی، لیکن وہ ہنسی اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہیں۔ ثریّا کا دم اُس کے سینے میں گھٹ رہا تھا اور وہ خوفزدہ سی نُدرت کی امّی کے ساتھ لگی آگے بڑھتی جا رہی تھی ..... ثریّا کو لگا تھا جیسے یہ فاصلہ کئی میلوں پر محیط ہو گیا ہو۔ اُس نے بڑے بڑے درختوں کے گرد آلود پتّوں کو دیکھا تھا اور اُسے لگا تھا جیسے سب طرف ویرانی ہی ویرانی ہو۔ اتنے میں ایک سانولی سلونی سی پندرہ سولہ لڑکی نے آ کر سلام کیا اور کہا۔
" سہیلی کیا تم میری شادی میں آئی ہو۔ پر میرے پاس تو صابن ہی نہیں، جہاں آرا چُرا کر لے گئی ہے اور پھر اُوپر سے ناراض بھی ہو گئی ہے۔ کیوں میٹرن جی آپ جہاں آرا کو ڈانٹیں گی نا"
میٹرن نے اُسے پیار سے کہا تھا۔ مَیں جہاں آرا سے تمہارا صابن واپس دلا دوں گی۔
وہ پگلی ثریّا سے پھر کہنے لگی۔
" سہیلی تمہیں معلوم ہے بھلا صفائی کے بغیر انسان کہیں جا سکتا ہے۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔ خوب صورت بنوں گی اور پھر اپنے سُسرال جاؤں گی۔ ٹھیک بات ہے نا سہیلی" اور میری بہن کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ اُس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے بڑی مشکل سے روکا تھا۔

ندُرت کی ماں نے اُس کو اپنے گلے سے لگایا تھا۔ اور کہا تھا۔" بیٹی ایک دن تم ضرور دلہن بنوگی۔ تمہارا دولہا آئے گا اور تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔"

وہ ندُرت کی ماں سے لگی ہنسنے لگی تھی۔ خوش ہو رہی تھی۔ اور میری بہن نے اُس کے ڈھیلے قمیص اور پاجامے کو دیکھ کر سوچا تھا۔" کیا ندُرت بھی ایسے ہی موٹے لباس میں ہوگی۔ کیا اسکے بال بھی ایسے ہی بے ترتیب ہوں گے۔ کیا وہ بھی ننگے پاؤں تپتی زمین پر پھر رہی ہوگی۔ اور اُس کے چہرے پر ایسی ہی اپنے حالات سے بے خبر مسکراہٹ ہوگی۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس کا دل بند ہوتا لگا تھا۔ پگلی کہہ رہی تھی۔

میٹرن جی مجھے صابن ضرور لا دینا۔ کہیں مہمان آجائیں اور میں گندی ہی بیٹھو رہوں اور پھر اُس نے ثریا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

" میرے کپڑے دیکھوگی؟" میری بہن نے روتی آنکھوں سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر پگلی نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مختلف چیزیں نکالی تھیں۔ صابن کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ لوٹے دندانوں والی کنگھی موتیوں کا معمولی ہار اور پہنے ہوئے گلابی کپڑے۔ وہ ہر چیز کو بہت پیار اور محبت سے دیکھ رہی تھی اور بہن کا دل ایک بوجھ کی مانند اسے اپنے سینے میں چبھتا ہوا الگ رہا تھا۔

ثریا اور ندُرت کی امی ایک بڑے سے پُرانے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی تھیں۔ ثریا نے اپنے سامنے بیٹھی اُن عورتوں کو دیکھا جو جوان تھیں، لیکن وہ سب چُپ چاپ ایک دُوسرے کے ساتھ لگی بڑی ترتیب سے چٹائیوں پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سر مُنڈے ہوتے تھے اُن کے کپڑے گرد آلود تھے۔ اُن کے چہروں پر زندگی کی کوئی تازگی نہیں تھی اور ثریا ندُرت کا سوچ رہی تھی جو اُسے ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ ندُرت کی امی سے ...... خواہش پر بھی نہیں پوچھ رہی تھی۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف پیدا ہو رہا تھا ..... اُسے لگا تھا جیسے وہ بھی ابھی اپنے ترتیب سے بنے بالوں کو بکھرا کر ان کے درمیان چُپ چاپ بیٹھ جائے گی۔ اس نے ندُرت کی اُمی کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ندرت کا نام لیتے بھی ڈر رہی تھی۔ وہ واپس آنا چاہتی تھی۔ وہ ندُرت کو اس چاروں طرف پھیلے ماحول میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی ..... وہ اُس ندُرت کو کیسے یوں دیکھ لیتی جو اس کے بچپن کی دوست تھی۔

پگلی نے پھر کہا تھا۔ "سہیلی میں یہ ساری چیزیں سنبھال کر اس لیے رکھتی ہوں کہ کوئی چرا کر نہ لے جائے۔" ثریا نے چاہا تھا کہ وہ اس پگلی کے پاس بیٹھ کر اُس کی چیزوں کو ترتیب سے باندھ دے اور کہے۔

دیکھو سہیلی انسان جن جذبوں کی، جن چیزوں کی زیادہ حفاظت کرتا ہے، وہی چرائی جاتی ہیں۔"

میٹرن کا سفید بے داغ لباس اور سیاہ چھتری۔ اس تمام ماحول میں اُس کا پورا وجود ہی صرف ہوشمند دُنیا کی نشانیاں تھیں..... احساس سے عاری عورتیں۔ گرد آلود پتے۔ مٹیالی زمین اور بارکوں کی سلاخوں کی ویرانی اور کرختگی..... ان سب باتوں نے ثریا کے اندر ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔

دو تین نسبتاً اُجلے بستروں کے پاس سے گزر کر جب وہ آگے بڑھی ہیں، تو اس بارک میں اندھیرا تھا اور جب ثریا نے موٹی سلاخ کو پکڑ کر اندر جھانکنے کے لیے اپنا سر ساتھ لگایا ہے تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ آئی تھی اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ اتنی دلخراش حقیقتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جو سب کی سب اُس کے سامنے عُریاں کھڑی تھیں وہ سب اپنے وجود کی برہنگی سے بے خبر تھیں اور خالی نگاہوں سے ان کو وہاں کھڑے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے گرد آلود تھے۔ وہ مختلف حالتوں میں بیٹھی تھیں۔ یا سلاخوں کو پکڑے باہر دیکھ رہی تھیں۔

نُدرت کی اُمی نے گھبرا کر میٹرن سے کہا تھا۔ "میٹرن صاحبہ آپ میری بیٹی کو یہاں ان سب کے درمیان کیوں لے آئی ہیں۔" ثریا کو محسوس ہوا تھا جیسے نُدرت کی امی اپنی عمر سے کہیں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اُن کی آواز کہیں پاتال سے آتی لگ رہی تھی اور ثریا نے جلدی سے آنکھیں کھول کر نُدرت کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ نُدرت نہیں ہو سکتی۔ اُس نے ایک گندے بالوں اور اُجاڑ چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔ یہ نُدرت نہیں ہو سکتی۔" اور ندرت کی امی بارک کی سلاخ کو پکڑے رونے لگی تھی اور نُدرت اُن تمام عورتوں کے درمیان کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

میٹرن نے اپنی نظریں دُوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"بیگم صاحبہ، یہ پرائیویٹ وارڈ میں روشنی کو دیکھ کر بہت شور کرتی ہے اور جب تک اندھیرا نہ ہو جائے پریشان رہتی ہے، لیکن دُوسرے مریض اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔ یہ کشمکش اِس کی ذہنی صحت کے لیے اچھی نہیں تھی۔ ایسا مجبوراً کرنا پڑا ہے۔"

نُدرت کی اُمّی کا چہرہ سفید ہو گیا جیسے کسی نے خون کی بوند بوند نچوڑ لی ہو۔

ثریّا نے آہستہ سے پُکارا تھا "نُدرت ... نُدرت اِدھر دیکھو مَیں ثریّا ہوں مَیں تمہیں ملنے آئی ہوں۔" لیکن وہ بالکل ساکت وہاں آنکھیں بند کیے کھڑی تھی اور کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

نُدرت کی اُمّی نے میٹرن سے پُوچھا تھا۔ میٹرن صاحبہ میری بیٹی کب تک ٹھیک ہو جائے گی۔" اُن کی آواز میں مِنّت تھی اور تمام ماتا کا درد بھی ایسا درد جو صرف بیٹی کے اُجڑنے پر ماں کے دل میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

میٹرن نے چھڑی گھُماتے ہوئے جواب دیا تھا "بیگم صاحبہ ہمارا کام تو صرف ان کی دیکھ بھال ہے۔ باقی کام تو بڑے ڈاکٹر صاحب کے ذمّہ ہے۔" اور ثریّا نے نُدرت کی ماں سے کہا تھا۔

"آنٹی! آپ نُدرت کو گھر لے چلیں۔ وہ یہاں پر مر جائے گی۔ مر جائے گی۔"

نُدرت کی ماں نے کہا تھا "بیٹی گھر میں مجھ سے اس کا درد نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جب روشنی کو دیکھ کر چیخنے لگتی ہے، تو میرا دل ڈوب جاتا ہے اور پھر گھر کے دُوسرے لوگ —— زندگی اندھیرے میں کِس طرح گذر سکتی ہے۔"

نُدرت نے آگے بڑھ کر سلاخ کو پکڑ لیا تھا۔ وہ ثریّا کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی اُمّی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں سُورج کی روشنی پر تھیں جو پارک کے پیچھے سے سیدھی پیپل کے بوڑھے درخت کے پتّوں پر پڑ رہی تھی۔ پھر اُس کے چہرے پر خوف کی تیز لہر سی پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ کانپ کر ساکن ہو گئے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

یہاں پر کتنی چمک اور روشنی ہے۔ وہ دیکھو تیز بلب جل رہا ہے۔ سب طرف روشنی ہے۔ اور مَیں یہاں کھڑی ہوں ... میرے کپڑے کہاں ہیں ...... اور وہ بڑبڑاتی ہوئی پیچھے کو

ہٹ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اپنے ہاتھوں کو چہرے پر رکھ لیا، لیکن وہ اپنی انگلیوں کے درمیان سے اُدھ کھُلی آنکھ سے باہر پھیلی روشنی کو دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی۔

نُدرت کی ماں نے دُکھ سے میٹرن سے کہا تھا "میٹرن صاحبہ یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گی ؟" اور میٹرن نے کہا تھا "بیگم صاحبہ، شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ آپ دُعا کرتی رہا کریں۔ ویسے یہ پہلے کی نسبت بہت بہتر لگتی ہے۔ اب روشنی کو دیکھ کر اتنا نہیں چیختی..... بس بڑبڑانے لگتی ہے۔ ابھی دیکھا ہے نا آپ نے ایسے ہی یہ اکثر کرتی ہے..... آپ دُعا کریں اللہ ضرور سُنے گا۔ ....." اور ثریا نے روتی آنکھوں سے نُدرت کو ایک بار پھر پُکارا تھا۔ لیکن وہ زمین پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کو چھُپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا سَر اُس کے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

ثریا اور نُدرت کی ماں کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہیں تھیں۔ پیپل کی شاخ پر بیٹھی کوئی چڑیا چوُں چوُں کر رہی تھی اور پگلی اپنے تھیلے کو کندھے پر ڈالے بہت ہی معصوم مسکراہٹ سے ثریا کو دیکھ رہی تھی۔

نُدرت کی اُمی نے وہ نیا جوڑا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے لائی تھی اُس پگلی کو دے کر کہا تھا "...... بیٹی دُلہن بنتے وقت یہ پہن لینا ضرور پہن لینا۔ برہنہ جوان بیٹیاں ماں باپ کے دل کو چھلنی کر دیتی ہیں۔"

دوست کیا تم زندگی کی اِس تلخ حقیقت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہو۔ شاید تم اس ماں کے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہو گے جس کی جوان خوُب صوُرت بیٹی اُس کے سامنے عرُیاں کھڑی ہو اور اس کے کپڑے وہ دُوسری لڑکی کو دے دے۔ ہو سکتا ہے کہ تم اندازہ لگا سکو کہ بربادی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

پگلی نے ثریا سے کہا تھا "سہیلی اِن تمام لڑکیوں نے شاید اپنے کپڑے دُھو کر ڈالے ہیں۔ ان سب نے بھی تو ڈولی میں بیٹھنا ہے۔ اِن سب نے بھی تو سُسرال جانا ہے۔ کیوں سہیلی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ؟ اُس پگلی کے چہرے پر معصوم خواہشوں کا شائبہ تھا۔ اور اس کے پہلو میں دِل تھا جو خواہش کے بھنور میں پھنس کر چکر لگا رہا تھا۔

ثریا ندرت کے لیے چند چیزیں لے کر گئی تھی، لیکن ندرت کو اِن چیزوں کی ضرورت نہیں تھی اور پھر ثریّا نے وہ چیزیں دُوسری عورتوں میں بانٹ دی تھیں۔ اُس کے خالی ہاتھ اُس کے پہلو میں لٹک گئے تھے، جیسے وہ دو سخت لکڑیاں ہوں جن کو وہ ہلا نہ سکتی ہو۔

اور جب وہ بڑے گیٹ کو پار کر کے باہر آنے لگی، تو پگلی اپنے تھیلے کو کندھے پر لٹکائے اُداس نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ثریّا سے زور سے کہا تھا۔

"سہیلی جب میں ڈولی میں بیٹھوں گی تو مجھے دیکھنے ضرور آنا۔ آج تو میرا ساجن جہاں آ آنے لے لیا ہے۔ جب وہ واپس کرے گی تو میں صاف ستھری ہو جاؤں گی" ثریا نے اپنا سر ہلایا تھا۔

جب خدا حافظ کہنے کے لیے ثریّا نے اپنا ہاتھ اُٹھایا تو وہ پگلی رو رہی تھی اور ثریّا کو آواز آئی تھی۔

"دیکھو سہیلی میری شادی میں ضرور آنا" اور ثریّا اُس کی ڈولی کے بارے میں سوچنے لگی تھی جس میں ندرت کو بیٹھنا تھا۔ اُن قہقہوں اور ہنسی کے متعلق سوچنے لگی جواب کبھی سنائی نہ دیگی ثریّا کے بابل کے گیت اُس کے اندر ہی دم توڑ چکے تھے، جو اُس نے ندرت کی شادی پر گائے تھے۔

اور ندرت کی ماں کہہ رہی تھی "کئی ڈولیاں کبھی نہیں اُٹھتیں میری بیٹی۔ ماں باپ کے کندھے ان کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے شل ہو جاتے ہیں، اور وہ ان کے کندھوں کا ہی بوجھ بنی رہ جاتی ہیں۔ یہ اِنتظار بہت جان لیوا ہے۔ میری بیٹی" یہ انتظار بہت جان لیوا ہے"

جانتے ہو دوست ...... ثریّا نے یہ سب باتیں اتنی دفعہ دہرائی ہیں کہ مجھے لگتا ہے، جیسے مَیں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ جیسے مَیں نے بھی اُس دُھول کو اپنے پاؤں پر لگایا ہے جیسے مَیں نے بھی وہاں کی ویرانی کو اپنے اندر گھستے محسوس کیا ہے۔ جیسے وہ پگلی کہہ رہی ہو۔ ندرت یہاں اکیلی تو نہیں، ہم سب بھی تو ندرت ہیں۔ تم کِس کِس کے لیے غمزدہ ہو گے، کِس کِس کا ماتم کرو گے۔

دوست مَیں تم کو الزام نہیں دے رہا۔ مَیں تو خدا کو بھی الزام نہیں دے سکتا۔ اِس تمام داستان میں تمہارا تو ذکر بھی نہیں آتا۔ اور پھر مَیں تمہیں کیونکر کوئی الزام دے سکتا ہوں۔ مَیں تو جانتا بھی نہیں کہ ندرت کی بربادی میں تمہارا کتنا حِصّہ ہے۔ تم نے اس کی زندگی کی بساط پر کونسا مہرہ بنکر اُسے مات دی"

مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں تو بس سُننے والے کی مانند خاموش تھا۔ یہ ساری کہانی تو صرف نُدرت کی تھی ...... اُس لڑکی کی جو کبھی میری زندگی میں آئی تھی...... اور میں شاید اُسے بھُول بھی چکا تھا۔

فاروق چُپ چاپ کرُسی پر بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے اور پھر بڑے کلاک کی تیز گھنٹی نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

فاروق میرے دفتر کا دروازہ بند کر کے جب باہر گیا، تو مَیں نے سوچا "ہاں اس ساری کہانی میں میرا تو کہیں ذکر بھی نہیں، لیکن یاد کا ایک اذیت ناک لمحہ ابھی تک میری یاد میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ لمحہ جو میری شکست پر ختم ہوا۔ کیا مَیں فاروق کو بتا دُوں؟ کیا مَیں فاروق کو بتا دُوں۔ وہ کہانی جو میری مجروح اَنا سے شروع ہو کر اُس رات پر ختم ہوتی ہے۔ جب مَیں نے نُدرت کو اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔ نکل جانے کو کہا تھا۔ مَیں نے سوچا تھا مَیں ندرت کو فتح کر چکا ہوں۔ مَیں نُدرت کو مٹا چکا ہوں ...... اس سے زیادہ مجھے کیا چاہیے۔ نُدرت کی یہی سُزا تھی۔

فاروق کے جانے کے بعد مَیں نے سیٹی بجا کر اپنے ذہن کو ہلکا کرنا چاہا۔ مَیں نے خوش ہونا چاہا کہ ایک عورت میری مردانگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نُدرت کو آخر کار مَیں نے شکست دے ہی دی۔ ہو سکتا ہے ..... میرا ذہن بھاری ہو رہا تھا۔ کیا مَیں خوش ہوں ..... ہو سکتا ہے .....

شکست اور فتح۔ وقتی جذبے۔ بے وقعت احساس ..... لیکن پھر بھی زندگی کے لیے ضروری .....

فاروق اور نُدرت کے خاندانوں کے ساتھ مَیں سکندر حیات کی وجہ سے ہی متعارف ہوا تھا۔ میرے اندر کا شیطان بڑے خُوب صُورت انداز سے اُن کو مرعُوب کرنے کی کوشش میں تھا۔ مَیں جو کئی لڑکیوں کو دوستی کے خُوب صُورت جال میں پھنسا چکا تھا۔ اس بات کا اندازہ کر چکا تھا کہ نُدرت کو ڈھب پر لانے کے لیے مجھے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ مجھے شرافت کا لبادہ اوڑھنا پڑے گا، جو شریف لڑکیوں کے دل میں اُترنے

کے لیے کارگر ہوتا ہے۔

اور پھر کس طرح میں نُدرت کو اُن سب باتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جس پر میرا اپنا کبھی بھی یقین نہیں تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے اُلجھا ہوا اور ٹیڑھا مرحلہ تھا۔ مَیں اکیلے میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا میں اُس وقت سے انتظار میں تھا۔ جب آگے بڑھ کر مَیں اُس کی ساری پاکیزگی کو روند سکوں۔ لیکن اس کی معصوم اور خود اعتمادی سے بھرپور نظریں مجھے اپنی ہی نظروں میں حقیر بنا دیتیں۔ تب نفرت کا عجیب کڑوا کسیلا احساس میرے اندر بھر جاتا۔ مَیں اُس کے تقدّس کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتا تھا.... اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"کہو نُدرت خانم کیا ہوا تمہارا وہ تقدّس اور پاکیزگی" لیکن وہ کتابوں کے وَرق پلٹتی ہوئی میرے پاس دفتر میں بیٹھی رہتی۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتی اور مَیں اپنے ناٹک میں نئے اور زیادہ دل لبھانے والے رنگ بھرتا رہتا۔ مَیں جانتا تھا اُس کے دل کو تسخیر کیے بغیر اس کے جسم کی طرف بڑھنا ایک شدید غلطی ہوگی۔ تب مَیں چُپ چاپ بیٹھا اُس کے جسم کے خطوط کو دُزدیدہ نظروں سے دیکھتا اور اُس کے دیکھنے پر آنکھیں جھکا کر بڑے رسان سے مُسکراتا۔

مَیں اُس کی موجودگی میں اپنی زندگی کا سب سے مُشکل کردار کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

ایک روز مَیں نے کہا تھا" نُدرت زندگی تمہارے بغیر اُدھوری اور نامکمل لگتی ہے۔ میں اُسے ٹٹولنا چاہتا تھا۔ اُس کے جذبات کی شدّت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اندرونی احساس سے کانپ سی گئی تھی۔ اُس کے معصُوم چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔ وہ محبّت کے الوہی جذبے میں گرفتار تھی۔ اُس کے چہرے پر چھائے رنگوں کو دیکھ کر میں دل ہی میں ہنس رہا تھا۔ ہاں اب وہ میرے قابو میں آنے والی ہے۔ مَیں کامیاب ہونے والا ہوں۔

اور جب مَیں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کے ہاتھ کو چھُونا چاہا تو وہ ہمیشہ کی طرح سُکڑ سی گئی تھی۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"اسلم محبت لمس اور گرفت نہیں۔ یہ تو انسان کے اندر یوں دوڑنے لگتی ہے جیسے خون کے ساتھ روانی۔ میں بہت حسّاس ہوں اور اگر تم نازک بھی سمجھ لو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ چھوٹی سی بات میری ساری ہستی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ نہ جانے میں اس طرح کیوں ہوں۔ لیکن اس پر میرا بس بھی تو نہیں۔ میں جب اپنے اندر جھانکتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں۔ میرا توڑنا کتنا آسان ہے۔ مجھے مٹانا کوئی مشکل نہیں اور خاص طور پر اُس کے ہاتھوں جو مجھے ساری کائنات لگتا ہے" وہ آہستہ سے ہنس پڑی ...... اور دفتر کی دُودھیا روشنی میں بیٹھی وہ کوئی غیر مرئی ہستی لگ رہی تھی "لیکن یہ مت بھولنا میں اخلاقی طور پر بھی کمزور ہوں۔ میں زمانوں تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔ میرے لیے تمہارا اتنا ہی قرب کافی ہوگا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے ..... اسلم۔ لیکن میں کمزور نہیں ہوں" اُس کی آواز میں اعتماد اور یقین تھا۔ اپنے آپ پر۔ مجھ پر۔ میں کچھ نہیں کہہ پاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ پھر میں نے زور سے قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا۔

"یہ باتیں تو بڑی ماورائی سی ہیں نُدرت۔ اِن کی خوب صورتی ہمیں اپنے اندر سمیٹ تو لیتی ہے لیکن ہمیں مکمل طور پر خوش نہیں کر سکتی اور میں پورے طور پر خوش ہونا چاہتا ہوں" میں نے اپنے اندر چھپی خواہش کو آواز دے ہی دی آخر کار۔ وہ میری بات کے مفہوم کو پانے کی کوشش میں سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"خوبصورت جذبے اپنا صِلہ خود ہیں اسلم" پھر وہ ہنس پڑی۔ اور بڑے یقین سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا یہ یقین ہی مجھے زہر آلود کر رہا تھا۔ اُس کے انداز میں فاختہ کی سی بے بسی اور لاچاری نہیں تھی۔ وہ کیوں اپنے پر اتنا یقین رکھتی تھی۔ کیوں۔

"تو کیا میں تم سے ماورائی محبت کروں؟ کیا میں تمہاری محبت سے تمہیں نکال دُوں۔ کیا میں اپنے جذبوں کی نفی کر دوں"

"کیا حرج ہے آخر اس میں۔ اگر کر سکو تو" اُس نے سُن کر بہت سکون سے جواب دیا۔ اور ہنستی ہوتی اُٹھ کر چلی گئی۔

"ماورائی محبت۔ خوب صورت جذبے اپنا صلہ خود ہیں" میں نے بیزاری اور نفرت سے

اُس کے کہے الفاظ کو دہرایا اور زور سے پاؤں کو زمین پر مارا۔

"یہ لڑکی آخر اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ مَیں ان سب باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ یہ جذبے کیا ہیں اور اِن کی سچائی۔ سب بکواس۔ سب بکواس۔ صرف جسم ہے زندہ اور جاندار جسم۔" مَیں نے نُدرت کے جسم کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

خوب صُورت جذبے جو نُدرت کے لیے اس کے اندر سمٹ گئے تھے۔ اور میرے لیے اس کے جواں جسم کی لائنوں اور زاویوں میں مجسّم ہو گئے تھے۔ وہ اتنی حسّاس تھی کہ کوئی خوب صُورت چیز، کوئی خوب صُورت جذبہ، کوئی خوب صُورت لفظ اُس کے ہاتھوں کو لرزش میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ یُوں کانپنے لگ جاتی تھی جیسے نرم ٹہنی ہو، لیکن وہ اِن تمام باتوں کے باوجود کتنی سخت بھی تھی۔ وہ خوبصُورتی سے متاثر تھی، لیکن مَیں جو اپنی جسمانی خوب صُورتی کا سب سے بڑا ہتھیار رکھتا تھا اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا۔ اور میری یہ بے بسی میرا اپنے پر یقین ڈگمگا رہی تھی۔ نُدرت میری پہنچ سے کس طرح دُور ہو سکتی تھی۔ پر وہ مجھے بہت ہی دُور لگ رہی تھی اور مَیں دیوانہ وار اس کو اپنے انتقام کے پنجے میں دبوچ کر مَسل دینے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ میری تمام خوبصورتی کے سامنے اس کے نازک وجود کی کیا حقیقت تھی اور اُس کی یہی حقیقت ایک تلخ زہر بنتی جا رہی تھی۔ اُس کے اور میرے درمیان ایسی لائن تھی جس کو عبور کرنے کے لیے مَیں کوئی سی بھی قیمت چکانے کو تیار تھا۔ یہ خواہش اُس کے جسم کی شدید خواہش تک ہی تو تھی اور مَیں تو ہمیشہ جسموں کا ہی خریدار رہا تھا۔

مَیں جب بھی اُس کو فون کرتا تو ایسے ایسے خوب صُورت الفاظ میں باتیں کرتا۔ جن میں سچائی اور شرافت کا پَرتو ہو۔ اور جو کھوکھلی آواز بنکر میرے اندر گونجتے رہتے تھے۔

مَیں اِس کھیل سے تھک چکا تھا۔ جس کا کوئی انجام مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ سچائی اور شرافت کی ایکٹنگ کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ میرے پاس آتی تھی اور مزے اور آرام سے باتیں کرتی رہتی جیسے اُس کو میرے وجود کی طاقت سے کوئی خوف نہ ہو۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھے نہیں دیکھتی بلکہ اپنے اندر پیدا محبت کے خوب صُورت جذبے کی پرستش کر رہی ہو۔ اس نے اپنے لیے ایک خوب صُورت اور نازک جال بُن رکھا

تھا اور آنکھیں بند کیے اس کے اندر بیٹھی سب طرف سے غافل ہو چکی تھی۔ اور پھر بھی میرے ہاتھوں کی گرفت سے دُور تھی۔ اُس کے چھونے کی خواہش پر بھی میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا حالانکہ وہ میرے آفس میں اکیلی ہی ہوتی تھی، لیکن میں اپنی کرسی پر بیٹھا سُرد ہوتا رہتا اور غصّے کے مارے پیچ و تاب کھاتا رہتا۔

ایک روز میں نے پُوچھا تھا۔ "ندُرت کیا تم وجود کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہو"؟

اُس کی ہتھیلیاں پسینے سے نم ہو گئی تھیں اور اُس نے اُن کو پلو سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

" اسلم وجود آتا تو ہے۔ لیکن اپنے وقت پر..... اور جلدی سے چلی گئی تھی۔

پھر میں نے ندُرت کو ملنا چھوڑ دیا اور شکست خوردہ ہو کر اس جذبے کو بھُولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں نے اپنے چپراسی سے کہہ دیا تھا کہ جب مس ندُرت آئیں تو کہہ دینا کہ میں مصروف ہوں۔ چند روز بعد جب وہ میرے دفتر کا دروازہ کھولنے لگی تو چپراسی نے کہا تھا۔

مس صاحبہ۔ صاحب بہت مصروف ہیں۔ آپ سے نہیں مل سکتے۔

میں اندر اپنی کُرسی پر بیٹھا تن سا گیا تھا اور اپنے اس نئے داؤ کا اثر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو مجھے زندگی میں پہلی بار آزمانا پڑا تھا۔

چند ساعتوں تک باہر خاموشی رہی تھی۔ میرے سٹینو کی ٹائپ مشین کی ٹِک ٹِک میرے سُر میں ہتھوڑوں کی مانند لگ رہی تھی اور دفتر کے خوب صُورت رنگ ایک دم بے جان سے نظر آنے لگے تھے۔ میری زبان پر کڑوا سا مزہ تھا جو میری شکست نے پیدا کیا تھا۔

چپراسی نے ایک دفعہ پھر کہا تھا۔

مس صاحبہ۔ صاحب نے ہدایت کی ہے کہ کوئی فالتو آدمی اُن کے دفتر میں نہ آنے پائے۔

ندُرت کی آواز سنائی دی تھی..... اُس نے کہا تھا۔

" ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا"۔ اُس کی آواز میں بے یقینی اور غصّہ تھا۔ "مس صاحبہ کہہ جو دیا کہ صاحب مصروف ہیں"۔ "آپ اندر نہیں جا سکتیں"۔ چپراسی کی آواز میں بدتمیزی تھی اور اندر بیٹھا میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

"بے کار کا دردِ سر۔ مفت کا جھنجھٹ" میں نے فائلوں کو آگے کھکا کر اُن پر بڑی روانی سے دستخط کرنے شروع کر دیئے اور میرے لبوں سے سیٹی کی مدھم آواز میرے کمرے میں بھر گئی تھی۔ لیکن ساتھ کے کمرے سے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ کا مجھے نہ جانے ہمیشہ سے زیادہ کیوں احساس ہو رہا تھا.....

"اوہ۔ اتنا شور کیوں ہے آخر۔ کیا تم لوگ آرام سے کام نہیں کر سکتے" میں زور سے چلّایا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔ شکست خوردہ..... شکست..... شکست..... تم ہار گئے ہو۔ ٹائپ مشین چیختی رہی اور میں نے گھبرا کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا.......... میں نے اُسے لوٹایا ہے میں نے اُس پر فتح حاصل کی ہے..... جھوٹ ہے..... جھوٹ ہے کلاک کی ٹک ٹک کہتی رہی اور میں سر کو ہاتھوں میں تھامے فائل کے کھلے کاغذ کو گھورتا بیٹھا رہا تھا۔

فون کی گھنٹی کی مسلسل ٹرن۔ ٹرن..... سے گھبرا کر جب میں نے ریسیور کو اُٹھایا تو ندرت کی آواز سُنائی دی اور میں نے پوری بات سُنے بغیر فون کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اور اپنی پہلی ناکامی پر غصّے کے مارے میں نے چپراسی کو بُلا کر بلا وجہ خوب ڈانٹا تھا۔

"پھر کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا...... میں اب بھی بہت سے جسموں پر قبضہ کر سکتا ہوں" میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔

اُس روز میرے سر میں شدید درد تھا۔ اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ دیوار پر پھیلی بیل کے پتّے سوکھ کر گر رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں جو بہار میں سارا وقت اِن پھولوں کے بھیتر میں گھستی شہد اکٹھا کرتی رہتیں تھیں۔ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ صرف چند مکھیاں کبھی کبھار آ کر بیٹھتی اور پھر شروع سردیوں کی ہوا سے گھبرا کر واپس اُڑ جاتیں۔ آسمان دھندلا تھا جیسے ہلکی سی کُہر کی چادر نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا ہو۔ میں سگریٹ پیتا ہوا ٹائم کے نئے پرچے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھُلا۔ دبے قدموں کی چاپ میری کرسی کی پشت پر آ کر رُک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ندرت تھی۔

مَیں اپنی آخری ناکامی کے مٹ جانے پر دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ یہ میرا بچھایا ہوا جال تھا۔ وہ کس طرح بچ کر جا سکتی تھی بھلا۔

نُدرت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس کا چہرہ زرد اور غمگین تھا۔

مَیں نے اپنے چہرے کو تمام جذبات سے عاری بناتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ دھوئیں کی ہلکی تہ کے پار سے نُدرت کے آنسو چمک رہے تھے، جو اس کی زرد گالوں پر ایک دھار کی طرح چپکے چپکے بہہ رہے تھے۔ مَیں نے اپنی آنکھیں خزاں زدہ بیل پر اُڑتی اکیلی مکھی پر جما دیں تھیں۔

"ناراضگی کی وجہ تو بتا دو" نُدرت کی آواز میں زمانوں کی محرومی تھی۔ وہ کھڑی کھڑی ویرانے میں اکیلی شاخ کی طرح کانپ رہی تھی۔

"وجہ تو کوئی نہیں بس دل نہیں چاہتا" مَیں نے اپنی آواز میں لاپرواہی لاتے ہوئے جواب دیا۔

"اسلم تم چاہتے کیا ہو" وہ جھک کر میرے بستر کی پائنتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جیسے غم کا بوجھ برداشت نہ کر پا رہی ہو۔

"صرف اپنے پر اعتبار" مَیں بدستور ٹائم کے ورقے پلٹ رہا تھا۔

"وہ تو مجھے ہے کیا۔ اس تمام عرصے میں تم اتنا بھی نہیں جان سکے۔ تمہیں معلوم ہو جانا چاہیے تھا اسلم کہ میرے جیسی لڑکی جب ایک مَرد کے دفتر میں اکیلی آتی ہے، تو اُس پر اعتبار کرتی ہے اور آج جب مَیں تمہارے گھر چلی آئی ہوں تو اعتبار کے بھروسے سے ہی تو آئی ہوں"۔

"یہ جھوٹ ہے اور خالی باتیں مجھے مطمئن نہیں کریں" مَیں غصّے سے بولا اور تازہ جلی سگریٹ کو مَیں نے زور سے ایش ٹرے میں مَسل کو بجھا دیا۔

"اسلم ان چند دنوں کی اذیت اور کرب نے میرے اندر کا سارا حوصلہ اور غرور نچوڑ لیا ہے۔ اسلم یہ محبت اتنی جان لیوا اور دَرد ناک ہوتی ہے اور دُوسرا شخص اتنا عزیز اور پیارا لگتا ہے یہ تو مجھے اب ہی معلوم ہوا ہے۔ مَیں تو اُس پرندے کی مانند ہوں جو فضائے بسیط میں بغیر کسی منزل اور نشان کے اُڑتا پھرے۔ اکیلا اور دُکھی۔ بغیر کسی منزل کے مجھے کونسی

راہ جاتا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ میں کیا کروں۔ بولو میں کیا کروں۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے کن ظلمات کو پار کرنا ہوگا۔ کونسی گہرائیوں میں چھلانگ لگانی پڑے گی بولو مجھے کونسے کانٹوں کو چننا ہوگا بولو...... بولو.... وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی اور میرا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی اور بے اختیار ہو کر رونے لگیں۔ تم نے مجھے ڈس لیا ہے۔ اسلم۔ تم نے..... تم نے۔ میں نے شاید ایک لمحے کے لیے اپنے دل میں اس کے لیے رحم محسوس کیا تھا، لیکن دوسرے لمحے میں وہی انسان تھا جو دوسروں کو کچلنے میں ہی لذّت پاتا ہو۔ میرا زہر ہی میرا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

"تم کسی بات میں پوری نہیں اترو گی۔ تم انتہائی خود پرست اور خود غرض لڑکی ہو" میں اس کی انا کو پوری طرح مجروح کرنا چاہتا تھا۔

"یہ غلط ہے" اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور لاچار سی میرے سامنے کھڑی رہی۔

"یہ غلط نہیں ہے۔ تم مجھے اس لیے نہیں ملتی رہی ہو کہ تم کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا۔ تم محض وقت کٹی کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ بنا کر میرے جذبات کو بھڑکاتی رہی ہو۔ اور جب میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ تم ایسی شرافت کا ڈھونگ رچاتی ہو جو تمہارے کردار میں کہیں بھی موجود نہیں۔ تم دوسروں سے کھیلنا چاہتی ہو۔

وہ ایک دم کرسی پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے سر جھکا لیا اور رونے لگی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے ان گنت گھروں کی روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ چھتوں پر ٹیلیویژن کے ایریل تھے۔ روشنیوں کے درمیان سمٹا ہوا اندھیرا تھا اور میں کسی مناسب لفظ کی تلاش میں تھا، جو ندرت کے نازک احساسات اور خیالات پر ایک تازیانہ بنکر لگے اور میں اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ سکوں۔ میں اس موقعہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے مہینوں کی تگ و دو کی قیمت وصول کرنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ وہ بے بس اور اکیلی تھی اور سر تا سر میرے جادو میں جکڑی ہوئی۔ جسے وہ محبّت کا نام دے رہی تھی۔ محبّت جس کا کوئی وجود نہیں۔ میرے سامنے بیٹھی لڑکی کا شاداب وجود میرے اس قدر نزدیک تھا۔ میری دسترس میں۔ میرا دل اچانک اسے اپنی گرفت میں لینے کے

یے مچل اُٹھا۔ اُس کا خوب صورت جسم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور پھر اس جسم کو عُریاں دیکھنے کی شدید ہوس میرے اندر پیدا ہوئی۔ میرا خُون تیزی سے میری رگوں میں دوڑنے لگا۔

"کیا میری شرافت، تمہارے میرے درمیان ایک دیوار ہے اور کیا اِس دیوار کے اس پار بھی تم میرے منتظر ہو گے؟ اگر مجھے اِس بات کا پُورا یقین ہو تو مَیں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولتی رہی اور مجھے لگا جیسے یہ آواز اُس کی اپنی نہ ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر بھی دُنیا خاموش تھی .... اُس کی آواز میں انجانے اندیشوں کا ارتعاش تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور مَیں اپنی کامیابی پر ہنس رہا تھا۔

مَیں بستر سے نیچے اُتر آیا۔ کھڑکی سے نظر آتا آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ اِکّا دُکّا تارے زیادہ واضح اور روشن نظر آرہے تھے۔ مَیں نے سگریٹ جلائی اور دُھوئیں کے گہرے مرغولے کو اُس کے مُنہ پر چھوڑ دیا۔

"نُدرت میرے اور تمہارے درمیان یہ اجنبی پن کیوں ہے" اُس وقت مجھے اپنے اندر کی بڑھتی ہوئی ہوس کو روکنا انتہائی مُشکل لگ رہا تھا۔

"اسلم تمہارا ذرا سا بھی غلط قدم مجھے توڑ کر رکھ دے گا۔ تم جانتے ہو۔ اچھّی طرح جانتے ہو۔ مَیں تمہارے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی، لیکن تمہاری باتوں کے جادُو نے مجھے بے بس کر دیا۔ اور اگر تم مجھے اب ڈس بھی لو تو مَیں اُف نہیں کروں گی، کچھ نہیں کروں گی اپنا بچاؤ بھی کر نہ سکوں گی۔" وہ بہت ہی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور اندھیرے میں بیٹھی وہ ایسی چڑیا کی مانند سہمی ہوئی تھی جو شکاری کی زد پر ہو۔

جب مَیں نے دروازہ بند کر کے اُس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ بدستور سر جھکائے رو رہی تھی۔ میرے تیز قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور کھڑی ہو گئی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے ہیں نے اگلا قدم اُٹھانے سے پہلے سوچا تھا "کیا ہُوا اگر نُدرت کا جسم نہ ہو۔ کوئی اور جسم ہو۔ جسموں میں کیا فرق ہے لیکن دُوسرے لمحے غصّے کی تیز لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں اتنے مہینوں اِس لڑکی کی خاطر اپنا سکون مٹا تا رہا ہوں۔ اور یہ لڑکی لذّتوں کی مٹھاس میں ریت

بنکر میرے تمام مزے کو کِرکرا کر تی رہی ہے۔

"یہ میرے اس کمرے میں آکر بھی اپنی حفاظت کا سوچتی ہے۔ میں نے میز کو زور سے نفرت بھری ٹھوکر ماری۔ یہ ٹھوکر نُدرت کی پاکیزگی اور شرافت کو تھی جس کی حیثیت میرے اندھے جذبات کے سامنے کچھ نہیں تھی۔"

"نُدرت خانم دُوسروں کے جذبات کو اُبھارنا اور پھر دُور کھڑے ہو کر دُوسروں کا تماشہ دیکھنا اتنا آسان نہیں۔ اس کی کچھ قیمت دینی پڑتی ہے۔"

"یہ تم ہو۔ یہ تم ہو جس کے لیے میں نے اتنی ذہنی اذیّت برداشت کی۔ اتنے دِنوں کرب اور عذاب میں مبتلا رہی"، وہ حیرانگی سے بولی۔

"میں شکست کا عادی نہیں ہوں نُدرت خانم۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ہارنا ہو گا اور وہ تم ہو نُدرت خانم تم۔ تُم کوئی نہیں ہو، صرف ایک جسم ہو جس کی خواہش مجھے تھی اور ہے۔ اور اب میں ہمیشہ کی طرح۔ دُوسرے جسموں کی طرح اِس کو بھی روند ڈالوں گا۔ اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ کہہ نہ سکو گی اور کیونکر کہو گی۔ میں اِس تپش کا عادی نہیں ہوں اور تمہیں اس کی قیمت دینی پڑے گی۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ اور وہ کچھ اور پیچھے ہٹ گئی"۔ قیمت کا تعیّن صرف تمہارے ہی اختیار میں نہیں ہے۔" اُس نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے ایک تھپّڑ میرے مُنہ پر دے مارا۔

اور پھر نہ جانے کیسے ایک وحشی کی طاقت سے میں نے اس کو دبوچ لیا۔ اور جب روشنی کو جلا کر میں نے اُس کو دیکھنا چاہا تو اُس نے اپنی نے اپنی بہتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور گھٹی گھٹی آواز میں کہنے لگی۔

"روشنی بُجھا دو خدا کے لیے روشنی بجھا دو۔" میں نے اُس پر ایک نظر ڈالی جو خواہش اور انتقام کی تپش سے دہک رہی تھی۔ پر یکایک نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ اُس برہنہ جسم کا تقدّس اور پاکیزگی مجھے ایسی لگی تھی جو میری پہنچ سے بہت دُور ہو۔ جو سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ ہو۔ جو شبنم کی مانند ہاتھوں کی پوروں سے اُوجھل ہو جانے والی ہو۔ میں وہاں کھڑا پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

"روشنی بجھا دو۔ خدا کے لیے روشنی بجھا دو۔ کھڑکی بند کر دو" اس کی آواز ایسے آ رہی تھی، جیسے کوئی ڈوبتا انسان مدد کے لیے پانی کی تہہ سے پکار رہا ہو۔ میں نے اُس کو آخری چرکا لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا تم اس جسم کے تقدّس کی حفاظت کرنا چاہتی تھی، لیکن اب جبکہ تم میری پہنچ سے اس قدر نزدیک ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔ بس میرا انتقام تھا جو میری مجروح اَنا کے سب زخم مندمل کر گیا۔ اُس کے ہاتھ ابھی تک اُس کے چہرے پر دھرے تھے۔ یہ کہتے ہوئے بھی میں جانتا تھا کہ اب کے بھی میں ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں اگر اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتا تو نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا اور اسے اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا اور پھر وہ چلی گئی تھی۔ اور میں دِنوں ہی اُس حسین مجسّمے کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ مجسمہ جو ہمیشہ میرے لاشعور کے پردے پر ٹھہرا رہتا تھا اور پھر مجھے لگا جیسے میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پر پچھلی رات جب راحیلہ کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی تو نُدرت، اپنی فتح پر ہنس رہی تھی۔ دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی اور اس کے چہرے پر دھرے دونوں ہاتھ آنسوؤں سے تر تھے۔

لب بے سوال

"میں تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ رحمان۔" اس نے میرے کھلے دروازے سے اندر آتے ہوئے کہا اور پھر میری گردن میں اپنے بازو ڈال دیئے۔

"لیکن میں رحمان نہیں تھا اور اس اجنبی لڑکی کو میں نے اس لمحے سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ایک دم خوفزدہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بازو اپنی گردن سے علیحدہ کرنے چاہے۔ لیکن اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

"میں رحمان نہیں ہوں خاتون" —— میں نے پورا زور لگاتے ہوئے کہا۔ "تم کبھی بھی رحمان نہیں بنو گے، لیکن اب میں تمہیں گھر سے باہر نہیں جانے دوں گی۔" وہ تیزی سے پلٹی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہولے سے مسکرا رہی تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں آنسو بھرے میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اب مجھے چھوڑ کر مت جانا، نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ تمہاری تلاش میں مجھے نہ جانے کہاں کہاں پھرنا پڑتا ہے۔ اور پھر میں بہت تھک جاتی ہوں۔ میں بے حد تھک چکی ہوں رحمان۔ اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" اور وہ ہولے ہولے رونے لگی۔ اس کا خوبصورت سراپا کانپ رہا تھا۔ جیسے اسے سردی لگ رہی ہو اور پھر وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ مجھے چھوڑ کے مت جانا مجھے —— اس کے لب شاید ہل رہے تھے۔

میں اپنے ایک کمرے والے گھر میں اکیلا پریشان کھڑا تھا۔ اور وہ میرے سامنے پڑی تھی۔

آنسوؤں کے قطرے ابھی تک اس کے زرد گالوں پر چمک رہے تھے۔ میرا دل اس کے لیے رحم اور ہمدردی سے بھر گیا۔ زندگی کی تلخیوں نے نہ جانے اس کی زندگی میں کس انداز سے زہر گھولا تھا کہ وہ یوں اس شخص کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہوئی۔ میرے گھر آ پہنچی تھی۔ وہ شخص یقیناً بے حد کٹھور ہوگا۔ جو یوں اس گڑیا جیسی خوب صورت لڑکی کو پامال کر کے نہ جانے کہاں چلا گیا۔ میں اس کے ساکت جسم کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

لیکن وہ لڑکی غیر تھی اور میں اس گھر میں اکیلا ہی تو رہتا تھا۔ میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور باہر آ گیا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے صحن کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ شاید وہ ہوش میں آنے پر خود ہی چلی جائے۔ نہ جانے وہ کون ہے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ آفس میں، میں سارا وقت پریشان رہا تھا۔ اس گھر میں میرا تمام اثاثہ تھا۔ جو میں ایک غیر اور نیم پاگل عورت کے حوالے کر کے آ گیا تھا۔ وہ تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں جو میں نے بڑی محنت اور جدّ و جہد کے بعد حاصل کی تھیں۔ میں وقت سے پہلے ہی گھر جانے کے لیے اٹھ گیا۔ مزید انتظار کرنا میرے بس میں نہ تھا۔

"کیا وہ لڑکی وہیں ہوگی ——— کیا معلوم وہ اب بھی وہیں بے ہوش پڑی ہو۔ یا میرا سب کچھ لے کر جا چکی ہو ——— میں بھی کتنا بیوقوف ہوں ——— انسانی ہمدردی، لعنت ہے ایسی ہمدردی پر جو خود کو لٹا دے ——— وسوسوں سے بوجھل دل لیے جب میں نے صحن کا دروازہ کھولا، تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

"شاید میں لُٹ چکا ہوں" ——— خوف سے میرے قدم وہیں جم گئے ——— نقصان کا بے پناہ احساس میرے سارے وجود کو کمزور کر گیا تھا۔

"ارے رحمان تم وہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ نا۔ میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔ مجھے بےحد بھوک لگی ہے ——— آؤ کھائیں" اور اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ——— وہ اُجلی اُجلی اور نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائے جا رہی تھی۔

"لیکن میں رحمان تو نہیں ہوں ——— میں نے دل میں اپنے آپ کو سمجھایا ——— وہ ایک پاگل لڑکی ہے ——— لیکن ہے تو خوبصورت ——— اور میں اس گھر میں اکیلا رہتا ہوں" ——— لیکن میں نے اسے بلایا تو نہیں۔ وہ خود ہی تو آئی ہے ——— میرے اندر خود اعتمادی کا ہلکا سا احساس ابھرا اور میں

اندر آ گیا ــــ لیکن پھر بھی ــــ اس کی آنکھیں کستہ زکھری ہوئی تھیں ــــ پرسکون اور مخلص، اُس نے ہر چیز کو قرینے سے سجا رکھا تھا۔ مَیں خاموش کھڑا تھا۔

"دیکھا رحمان میرا گھر، اچھا لگتا ہے نا ــــ کتنا پیارا سا گھر ہے ــــ تم آتے بھی تو زمانوں کے بعد ہو ۔ تمہاری دُوری مجھے جان سے مار دے گی ــــ لیکن چلو چھوڑو ــــ تم میری باتوں کا ہمیشہ کی طرح بُرا مناؤ گے اور پھر چلے جاؤ گے اور مَیں روتی رہ جاؤں گی ــــ مَیں رونا تو نہیں چاہتی ــــ مَیں تمہیں اب کچھ نہیں کہوں گی۔ تمہیں اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی ــــ مَیں صرف مُسکراؤں گی ــــ مجھے اپنے لَب سینے آ گئے ہیں جب میرے دل میں سوال اُٹھتے ہیں تو میرا سر شدید دَرد کرنے لگتا ہے اور مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے ــــ اور تم بھی ناخوش ہو جاتے ہو۔

ــــ لیکن دیکھو اس گھر میں اب ہم دُوسروں کے بغیر بڑے سُکھ سے رہیں گے ــــ ہماری بیٹی بھی ــــ اب صرف ہم ہیں اور سُکھ ہے۔ بس تم ایک دو خوبصورت چیزیں اور لے آؤ ــــ میں اس کو اتنا سنوار کر رکھوں گی کہ تم کو مجھ سے کبھی کوئی گلا نہ ہوگا" اس نے کھانا میز پر لگا دیا اور پھر ہم دونوں کھانے لگے ...... کھانا مزیدار تھا ــــ اور سب سے زیادہ اس کی خوشی سے بھرپور نظریں میرے دل کے اندر اتر رہی تھی ــــ وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائے جا رہی تھی ــــ "وہ شخص ضرور ظالم ہو گا جو اس کو ٹھکرا کر چلا گیا۔ مَیں نے اس کے گرم ہاتھوں کا لمس اپنے ــــ ہاتھ پر محسوس کرتے ہوئے سوچا ــــ اَن چاہا سا ایک خواب مجھے گھیر رہا تھا۔

"رحمان تم بار بار مجھ سے دُور کیوں چلے جاتے ہو۔ مَیں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ــــ روتے روتے میرا سَر دکھنے لگتا ہے" اور اس نے اپنے سَر کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔ اذیت کی لہریں اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے سارے وجود کو ڈبو رہی تھیں۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اس کو گرنے سے بچا کر اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ "مَیں رونا نہیں چاہتی ــــ مَیں تو تمہاری موجودگی میں خوش رہنا چاہتی ہوں، لیکن یہ اَن گِنت سوال ــــ رحمان تم سمجھتے کیوں نہیں ــــ کیوں تم میری محبت کو ہر بار ٹھکرا دیتے ہو ــــ مجھ پر رحم کرو ــــ رحم کرو ــــ رحم کرو ــــ" اور وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔

مَیں اس کی بے بسی سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا، لیکن مَیں فطری طور پر ایک شریف انسان تھا۔

وہ میرے بستر پر پڑی تھی اور میں خاموش پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہا ـــــ اس کے سفید خوبصورت ہاتھوں کو لمبے سیاہ بالوں کو اور اس کی بند آنکھوں کو ـــــ "مجھے ڈھونڈنا چاہیے ـــــ وہ جو کوئی بھی ہو۔ مجھے اسے سمجھانا چاہیے ـــــ کیا چاہت کے اس عظیم خزانے کو کوئی یوں بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ـــــ مجھے لگا اس شخص نے مجھے میرے حق سے محروم کر دیا ہے ـــــ کتنا اچھا ہوتا میں اس لڑکی کی راہ میں آیا ہوتا، لیکن وقت گزر چکا تھا ـــــ اب سوائے احساسِ محرومی کے میرے ہاتھ اور کیا آ سکتا تھا ـــــ میں غمزدہ ہو گیا ـــــ ایک غیر محسوس بوجھل احساس سے ـــــ میں نے جھک کر اس کے سرد ہاتھ کو آہستہ سے چھوا اور باہر نکل آیا ـــــ اس ٹھنڈک نے میرے اندر احساسِ تنہائی کو اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ وہ تنہا تھی۔ ـــــ ٹھکرائی ہوئی ـــــ

سامنے کوٹھی کے بڑے سے لان میں بکائن اور پوپلر کے ٹنڈ منڈ درخت دوپہر کی سرد دھوپ میں خاموش کھڑے تھے۔ شیشم کے درخت کی پھلیوں کا سنہرا پن دھوپ میں چمک رہا تھا ـــــ ـــــ صرف سوکھی سنہری پھلیاں ـــــ کوئی پتہ بھی تو نہیں ـــــ مجھے ایسے لگا یہ درخت نہیں بلکہ میرے گھر میں بستر پر پڑی بے ہوش لڑکی ہے۔ جس کا نام بھی میں نہیں جانتا تھا۔ ہوا چلنے پر ان پھلیوں میں عجیب سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے پراسرار روحیں کوئی نوحہ گا رہی ہوں اور آواز نہ در نہ بڑھتی جا رہی ہو ـــــ آم کے درخت بور سے لدے ہوتے تھے اور ان کی ہلکی سی خوشبو سب طرف پھیلتی جا رہی تھی ـــــ نوحہ اور خوشبو روح کی تنہائی اور جسم کی تنہائی ـــــ کتنی اداسی تھی ـــــ کوہو ـــــ کو ـــــ ہو ـــــ کوئل کی دکھی آواز گونجی

کوئل کس کی منتظر ہے ـــــ اور میں بھی تو کسی کا منتظر ہوں۔ کیا یہ لامتناہی انتظار کبھی ختم نہ ہو گا ـــــ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا دکھی دل اور بوجھل سوچیں ـــــ اور میں خوف کے باوجود بھی اسے گھر سے نہ نکال سکا۔ میں ہر روز اخبار کا ایک ایک کالم بہت غور سے پڑھتا ـــــ شاید گمشدہ لوگوں میں میرے مہمان کا بھی کوئی پتہ ہو ـــــ لیکن شاید رحمان کی طرح دوسرے گھر والوں نے بھی اسے دل سے بھلا دیا تھا ـــــ اب میں رحمان تھا ـــــ جو اس سے محبت کرتا تھا ـــــ جو اس کے محروم دل کو اپنی چاہت سے بھرنا چاہتا تھا ـــــ جو اس کی لٹی خوشیاں خریدنا چاہتا تھا۔

جو اس کی اذیت وہ بے ہوشی کے ذروں کا نشان مٹا دینا چاہتا تھا ـــــ میں نے اس کو اپنی استطاعت کے مطابق خوب صورت چیزیں خرید دی تھیں ـــــ میرا وہ گھر آباد اور روشن لگتا جس میں اس کی مترنم ہنسی ہوئے ہوئے گونجتی اور مجھے لگتا جیسے میں ہوا کے دوش پر اڑتا بہت اونچا اٹھ رہا ہوں اس کے خوبصورت بازو میری گردن میں حمائل ہوتے تو میں سب کچھ بھول جاتا ـــــ اس لیے کہ زندگی کے تپتے ریگزار میں یہی تو ایک چھوٹا سا نخلستان تھا۔ جس کی ٹھنڈک میں میں اپنے آپ کو ڈبو دینا چاہتا تھا۔ ـــــ میں اس کی آنکھوں کی محبت بھری گہرائیوں میں اپنا عکس دیکھتا، تو میں اپنے نام تک کو بھول جاتا ـــــ اور میرے ذہن میں رحمان رہ جاتا جس سے وہ بے انداز محبت کرتی تھی۔ میں تو اپنی نظروں میں بھی رحمان بن گیا تھا ـــــ وہ جو کوئی بھی تھی ـــــ مجھے بے حد اپنی سی لگتی ـــ ـــ ـــ

ـــــ پندرہ دن ہی تو گذرے تھے، لیکن مجھے لگتا نہ جانے کتنے برسوں سے ہم دونوں اکٹھے رہتے آئے ہیں ـــــ میں بھول چکا تھا کہ وہ پاگل ہے۔ کیونکہ کوئی بات بھی تو اس کی نشاندہی نہیں کرتی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ مجھے رحمان سمجھتی تھی ـــــ اور میں بھی تو اپنے آپ کو رحمان سمجھنے لگ گیا تھا اسکا اپنا رحمان۔

اس روز میں گنگناتا ہوا گھر آیا تھا ـــــ خشک دھرتی کی باس ـــــ پیپل کے بڑے بڑے پتے سڑکوں پر گہری سی آواز سے گر رہے تھے۔ سرد بوجھل ہوائیں میرے چاروں طرف چکر لگا رہی تھیں ـــــ جب میں نے صحن کا دروازہ کھولا تو وہ سامنے چپ چاپ کھڑی تھی ـــــ وہ آج مسکرا نہیں رہی تھی ـــــ اس کی آنکھوں میں میری پہچان بھی تو نہیں تھی۔

کیا ہوا میں نے اس کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھے جا رہی تھی ـــــ اور پھر وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

"میں کب سے یہاں ہوں ـــــ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا اور مجھے لگا جیسے میں گھنے سیاہ جنگل کی تنہائی میں ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح اکیلا رہ گیا ہوں ـــــ میری ٹانگیں میرے وجود کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں وہیں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیزیں میرے پاؤں کے پاس گر گئیں تھیں۔

"میں رحمان ہوں ـــــ کیونکہ تم پندرہ دنوں سے مجھے رحمان ہی تو کہتی آ رہی ہو ـــــ

کیا مجھ میں تمہیں اپنا رحمان نظر نہیں آ رہا ——— کیا میری آنکھوں میں تمہیں رحمان کی چاہت نظر نہیں آ رہی ؟

"میں جانتی ہوں تم رحمان نہیں ——— میں رحمان تک کبھی نہیں پہنچ سکتی ——— زندگی کی چاہتوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے سے سراب حقیقت نہیں بن جاتا ——— رحمان بھی ایک سراب ہے ——— اور میں اسے بھول چکی ہوں ——— میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں۔

پھر پچھلے پندرہ دنوں سے تم کیوں مجھے رحمان کہتی آئی ہو ——— یہاں تک کہ میں نے خود اپنے آپ کو رحمان سمجھنا شروع کر دیا ہے ——— میں نے پوری آواز سے چلا کر اس سے پوچھا ——— وہ خوفزدہ ہو کر دیوار سے جا لگی ——— میں اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا ——— "میں نے تمہارے دل کی محرومی کو ہٹانے کے لیے اپنے اندر چھپی ساری چاہت تم پر لٹا دی۔ میں نے ان پندرہ دنوں میں زندہ رہنا سیکھا ہے ——— میں نے تم سے محبت کرنی سیکھی ہے۔ تم نے اس گھر کو اپنا گھر بنایا ہے۔ دیکھو ——— کیا یہ ساری خوبصورتی تمہارے ہاتھ نے پیدا نہیں کی ——— کیا میری قمیض کے بٹن تمہارے ہاتھوں نے نہیں ٹانکے۔ کیا ان بوٹوں پر تم نے پالش نہیں کی۔ کیا میرے بالوں میں تم نے کنگھی نہیں کی تھی ——— میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ——— میں اسے پچھلے دنوں کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔" مجھے ہاتھ مت لگاؤ ——— مجھے ہاتھ مت لگاؤ ——— "

وہ ڈر کر دوسری طرف ہٹ گئی ——— اور میں نے اسے چھونے کی خواہش کے باوجود نہ چھوا۔ پھر ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دکھ اور محرومی کا کڑوا احساس میرے اندر بھر گیا ——— وہ اب بھی رو رہی تھی۔

" مجھے اب جانا چاہیے، وہ آہستہ سے بولی۔ اس نے اپنے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور اور میری طرف دیکھنے لگی ——— اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا ——— میرا سارا وجود بے جان ہو کر زمین کی طرف کھنچ رہا تھا۔

میں ——— میں ——— میں تو کوئی بھی نہیں ——— اگر میں بھی کسی رشتے سے اس دنیا سے بندھی ہوتی، تو کوئی تو مجھے پوچھنے آتا ——— کوئی تو میرا ہوتا ——— اس نے پلو پھر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا ———

"پھر تم کہاں جانا چاہتی ہو" ـــــ اُمید کی ننھی سی کرن میرے اندر جاگی ـــــ شاید ـ ـ
ـــــ شاید ـــــ

"مَیں اپنی بیٹی کے پاس جانا چاہتی ہوں ـــ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی ـــ" وہ بہت چھوٹی ہے ـــ صرف چھ ماہ کی ـــ ننھّی گڑیا سی۔ اس کی اُناّ میرے لیے پریشان ہوگی ـــ میرے دُودھ کے بغیر وہ بلک بلک کر رو رہی ہوگی" ـــ اس کی آنکھیں ماتا کی روشنی سے جگمگا اُٹھی تھیں۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر پاکیزہ سی مُسکراہٹ تھی ـــ لیکن اس کی آنکھوں میں ویرانی اور راکھ سی بھر گئی ـــ وہ بُجھ گئی تھیں ـــ اور یہ رحمان کون ہے"، مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے دل سے ایک دم وہ فاصلے پر چلی گئی ہو ـــ لیکن پھر بھی میرا دل اس کے چلے جانے کے تصوّر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ رحمان سے مجھے رقابت محسوس ہو رہی تھی"۔ رحمان میرا شوہر ہے ـــ وہ میری بچّی کا باپ ہے ـــ"

"کیا وہ کہیں چلا گیا ہے؟"

"وہ کہیں نہیں گیا ـــ وہ میرے تصوّر میں رہتا ہے میرے خیالوں میں بستا ہے"۔ ـــ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بولتی جا رہی تھی۔

"پھر تم اسے تلاش کرنے کیوں نکلتی ہو ـــ" مَیں بولا۔

"جو چیز گُم ہو جائے اسے تلاش ہی تو کیا جاتا ہے"، اس نے بغیر مجھے دیکھے جواب دیا۔

"کیا کبھی وہ تمہیں ملا ـــ مَیں نے طنز بھرے لہجے میں پُوچھا ـــ" ہاں جب کبھی اُسے کاروباری دوروں سے غیر مُلکی خوبصورت عورتوں سے اور بڑھیا شراب سے فرصت ملتی ہے تو وہ میرے پاس چلا آتا ہے۔ مَیں ہمیشہ اُس کی منتظر رہتی ہوں"۔

پھر واپس جانے کے لیے، کیونکہ دولت غیر عورت اور شراب تم سے زیادہ طاقتور ہیں ـــ ـــ ہیں نا ـــ وہ تمہیں ٹھکرا چکا ہے، لیکن تم اب بھی اس کا انتظار کرتی ہو۔ تم ان فاصلوں کو پاٹ دینا چاہتی ہو، جو اس کے تمہارے درمیان بڑھتے جاتے ہیں ـــ مَیں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا، تاکہ میرے الفاظ اس کے جاگتے ذہن میں اُتر جائیں ـــ "مَیں اور کر بھی کیا سکتی ہوں" ـــ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــ "تم بھی اسے بھُول سکتی ہو۔ تم

بھی زندگی کی رنگینیوں میں کھو سکتی ہو ــــــ تم میرے اس چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی ہو۔ پچھلے دنوں کی طرح تم میری گردن میں بازو ڈال کر مسکرا سکتی ہو۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔ میں اسکے ذہن میں اپنی چاہت کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔ میں بے بس ہوں۔ اور اپنی بے بسی پر قانع"

اس کی آنکھوں میں ایک دم نیا خوف جاگا اور وہ میری طرف دیکھنے لگی ــــــ میں اس کی آنکھوں کا سوال جان گیا تھا۔

ہاں میں جانتا تھا کہ تم بے بس ہو، اس لیے میں نے تمہاری بے بسی سے کوئی غلط فائدہ نہیں اُٹھایا، لیکن تم نے مجھے برباد کر ڈالا ــــــ اور اب تم جاگ کر میرے دل میں پھوٹتے اس خوبصورت جذبے کو مٹاتے دے رہی ہو ــــــ کتنا اچھا ہوتا جو تم سوئی رہتیں۔ تب میں ہمیشہ ہمیشہ تمہاری رفاقت میں خوش رہ سکتا تھا ــــــ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں نے اسے اپنی باہنوں میں لے لینا چاہتا تھا، لیکن اس نے سر جھکا لیا ــــ اور دوبارہ رونے لگی۔

"تم رو کیوں رہی ہو ــــــ میں تمہیں روک تو نہیں رہا۔ تم پر کوئی ظلم تو نہیں کر رہا" میرا غصہ پھر اپنے لُٹ جانے پر اُبھر رہا تھا

اس گھر میں میری ایک بچی ہے۔ وہ گھر میری ماں کا ہے۔ میں اپنے شوہر کے گھر تو نہیں رہتی وہاں رہ کر میں کرتی بھی کیا ــــــ اس بے آس انتظار نے مجھے پاگل بنا ڈالا تھا۔ اور پھر ماں مجھے اپنے گھر لے آئی۔ وہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ ان دونوں گھروں میں سے کوئی بھی میرا گھر نہیں ہے۔ میرے قدموں تلے کوئی زمین نہیں ہے۔ میرے شوہر کے ٹھکرانے پر سب ہی نے تو مجھے تج دیا ہے میرے ماں باپ اور بہن بھائی پچھلے تین ماہ سے یورپ کی سیر کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے میری بچی کو پالنے سے انکار کر دیا ہے میری بچی انکی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور پھر وہ صرف میری بچی ہے۔ میں تو سب کے ہوتے ہوئے اکیلی ہوں اور اس کا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ اب مجھے جانا چاہیے" وہ ایکدم کھڑی ہو گئی

میں وہاں کمرے میں بیٹھا اسے دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں اسے کس ناطے روکتا۔ ہم دونوں تو ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے تھے ــــــ میں بھاگ کر اس کی راہ میں کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے ــــــ میرا نام تو رحمان ہے ــــــ رحمان ہی ہے نا ــــ کیا تم مجھے یاد رکھو گی۔ کیا کبھی تمہاری یادوں میں پچھلے گذرے دن آئیں گے ــــ بولو ــــــ چپ نہ رہو ــــ مجھے

کوئی آس دلا کر جاؤ ——— یہ دروازہ ہر رات کھُلا رہے گا، تا کہ تم جب بھی تھک جاؤ ——— یہاں آکر آرام کرو۔" مسکرا دی ——— "میرا نام ——— میرا نام جان کر کیا کریں گے آپ۔" اس کی مُسکراہٹ ہمیشہ کی طرح اُجلی اور معصوم تھی۔

ہاں نام سے کیا ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں تمہارا نام جاننا چاہتا ہوں ——— میں دروازے کی کنڈی لگاتے ہوتے بولا۔

پاگل کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ پاگل خانے میں مجھے نمبر چوبیس کہتے تھے۔ لیکن میرا نام ——— وہ چپ چاپ کھڑی مجھے دیکھتی رہی ——— میں نے آہستہ سے دروازے کے پٹ کھول دیتے اور وہ بغیر پیچھے دیکھے آگے بڑھتی چلی گئی ——— میں کھلے پٹ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا ——— سامنے ایک ٹنڈ منڈ درخت پر ایک چڑیا سر نہوڑائے بیٹھی تھی اور سرد ہوا ویران سڑک پر سائیں سائیں کرتی نوحہ کر رہی تھی ———

وقت کی زنجیر مجھے اپنے ساتھ باندھے آگے بڑھ رہی تھی ——— اب میرا گھر پھر پہلے جیسا ویران تھا۔ اس میں کوئی چولہا نہیں جلتا تھا ——— حالانکہ سامنے کوٹھی کے لان میں بکائن کا درخت اُجلے سبز پتوں اور ننھے ننھے سفید اور جامنی رنگ کے پھولوں سے لد گیا۔ شیشم کے درخت کی سنہری پھلیاں پتوں کی ہریاول میں چھپ رہی تھیں۔ فضا نرم اور بھینی خوشبو سے بھر گئی تھی۔ سب طرف ایک پُراسرار خاموشی سے چھائی لگ رہی تھی ——— سامنے برآمدے کے ساتھ چمٹی بوگن بیلا سُرخ اور سفید پھولوں سے لد گئی تھی ———

میں سڑک پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ کیا مجھے اس کا انتظار تھا ——— نہیں ——— لیکن یادوں کا ایک ہیولا ہر وقت میرے ذہن کو جکڑے رکھتا۔ جس سے میں چھٹکارا پانے کے باوجود نہیں پا سکتا تھا۔ ——— شاید کوئی میری راہ میں آجائے، جس کا چہرہ اس سے ملتا ہو ——— شاید ——— تب میں اداس ہو کر ایک روز سٹیڈیم کے ایک کیفے میں شام کو جا بیٹھا تھا ——— نیم روشن اندھیرے ہال میں تیز انگلش دُھن بج رہی تھی اور چند نوجوان لڑکے لڑکیاں جسموں کو ہلاتے ہوئے ڈانس کر رہے تھے۔ میرے پاس کی کُرسیوں پر دو مرد میٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دُور کاؤنٹر پر ایک فوجی طرز کا نوجوان خاموش بیٹھا سر جھکائے

حساب کتاب کی فائل پر جھکا شاید کچھ گن رہا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ دور اندھیرے کونے میں وہ اور ایک نوجوان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل ایک دم اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چاہت تھی۔ جو مجھے اپنے دام میں پھنسا چکی تھی ـــــ اس کے ہونٹوں پر وہی معصوم مسکراہٹ تھی جو میرے دل کے اس قدر قریں رہی تھی۔

شاید یہ رحمان ہو ـــــ ہاں وہ یقیناً رحمان ہی ہوگا ـــــ اسے رحمان ہی ہونا چاہیے ـــــ یا کوئی اور ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ اس کی بے بسی کب تک بچی رہے گی۔ میرا سارا وجود۔ ایک کان بنکر اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہو ـــــ

"ڈارلنگ کچھ اور چاہیے" ـــــ مرد کی آواز میں لچرپن سا تھا۔ اور وہ اس کا ہاتھ تھامے بار بار اسے دبا رہا تھا ـــــ

"نہیں رحمان تمہارے ملنے سے زیادہ اور کس چیز کی خواہش کر سکتی ہوں ـــــ اس کی آواز میں غنودگی تھی اور خوشی بھی ـــــ

میں وہاں بیٹھا نہ جانے کس بات کا انتظار کر رہا تھا؛ حالانکہ میں جانتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی نہیں پہچانے گی۔ پھر بھی میرے دل میں آس تو تھی۔

جب وہ دونوں اُٹھ کر جانے لگے تو میں غمزدہ وہیں بیٹھا ٹھنڈی ہوتی کافی کا پیالہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈارلنگ ـــــ ڈارلنگ ـــــ

لیکن دروازے سے آتے ہوتے ایک اور نوجوان نے اس کے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ ڈارلنگ گاڑی میں بیٹھو میں ابھی آیا ـــــ وہ دونوں میری میز سے ذرا فاصلے پر آکر بیٹھ گئے۔

یار فرحان یہ مال کہاں سے مارا" ـــــ دوسرے نوجوان نے فرحان کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

" اللہ نے بھیجا ہے۔ دیکھو کیسا بڑھیا مال ہے۔ لیکن یار وہ مجھے رحمان کہتی ہے۔ نہ جانے رحمان کون تھا"

" شاید کسی تیرے جیسے رحمان کی ڈسی ہوئی ہو" دوسرا نوجوان زور سے ہنسا ـــــ "یہ ہاتھ کیسے لگی ـــــ کچھ بتاؤ بھی" "بس یار اس روز میں مزنگ چونگی پر نسبتاً اندھیری جگہ پہ گاڑی

کھڑی ٹکے ٹکے کباب کھا رہا تھا۔ اس نے جھانک کر میری طرف دیکھا اور بولی ــــ رحمان تم کہاں چھپ جاتے ہو ــــ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک گئی ہوں۔ اس کے بال بکھرے ہوتے تھے اور پاؤں گرد آلود ــــ شاید اس کی جُوتی کہیں رہ گئی تھی ــــ میں نے اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا۔ اِس نے میرے کندھے پر سَر رکھ کر بڑے سان سے کہا:

"رحمان تم ہمیشہ مجھے تھکا دیتے ہو ــــ اب مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی ــــ اور میں اسے گھر لے آیا۔

"کچھ بھی ہو۔ دیکھنے میں خوبصورت لگتی ہے۔ یار مزے ہیں تیرے تو"ــــ دوسرا نوجوان اشتہا بھرا قہقہہ لگا کر بولا۔

"تم بھی چلے آنا۔ کونسا ریزرو مال ہے" ــــ فرحان بڑی فراخدلی سے بولا اور باہر کو چلا گیا۔

بڑھیا مال، اور میرے ساتھ گزارے پندرہ دن، نوجوان کا اشتہا بھرا قہقہہ اور فرحان کی فراخدلی ــــ میرا سَر گھُوم رہا تھا۔ ــــ چھت میں ٹنکی ملگجی سی روشنیاں، تیز تیز میری نظروں کے سامنے گھومتی جا رہی تھیں۔ ساری کائنات ڈول رہی تھی اور اس دھرتی کے گھومتے پاتال میں مَیں ڈوب رہا تھا۔ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔

اپنی ذات کے دُکھ ــــ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشیں۔ حیات کے خارزار میں اپنی راہ بنانے کی جدّوجُہد ــــ اگر وقت تیزی سے نہ گزرے تو شاید ہم خود موت میں پناہ ڈھونڈنے لگیں۔ اس کمرے کی ویرانی میں لیٹے اچانک ہی وہ مجھے یاد آ جاتی ــــ تب مَیں جھنجھلا جاتا ــــ نہ جانے اس بڑھیا مال کے ساتھ ان نوجوانوں نے کیا سلوک کیا ہوگا ــــ اور ہوش میں آنے کے بعد اور کتنی لُٹ چکی ہوگی۔ کبھی کبھار مجھے اپنے بُدھوپن پر بھی غصّہ آتا تھا ــــ آخر مَیں کیوں وقت سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ مَیں اس کے جسم کو کیوں مقدّس سمجھتا رہا۔ کیوں مَیں اسے پامال نہ کر سکا ــــ لیکن دُوسرے لمحے اس کی آنکھوں کی جوت اور اس کی ہنسی کی معصومیت میرے دل کے اندر روشنی بنکر جاگ اُٹھتی۔ اس کے بازوؤں کا مَس کی

خواہش میں بے چین ہو اٹھتا ـــــ نہ جانے اب کہاں ہو گی ـــــ شاید رحمان نے اس کا دُکھ بانٹ لیا ہو ـــــ شاید اس کی بچی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہو ـــــ میں اپنی قمیص کے ٹوٹے بٹنوں کو دیکھتا اور خواہش کرتا کہ کوئی ہو جو بغیر میرے کہے ان کو ٹانک دے ـــــ لیکن کون ـــــ ایک ہیولا ـــــ ہمیشہ کی طرح کمرے کا اندھیرا اس کی آنکھوں کی جوت سے روشن ہو اٹھتا۔ اور میں خاموش بیٹھا رہتا ـــــ لیکن جب میں نے اس کو تیسری بار دیکھا تو وہ دو موریہ پُل کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ بال آپس میں جڑے ہوئے تھے اس کا سارا وجود گرد آلود تھا۔ جیسے وہ رحمان کو تلاش کرتے کرتے تھک کر بہت دُور نکل آئی ہو۔ اس کی خوبصورت آنکھیں بند تھیں ـــــ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوتے تھے۔ جیسے کسی جسمانی تکلیف کو دبانے کی کوشش کر رہی ہو ـــــ ہاں وہ وہی تھی ـــــ میں اس ہجوم میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ نوزائیدہ برہنہ بچی اس کے پاس لیٹی رُوئے جا رہی تھی۔ "بیچاری پگلی" ـــــ ہجوم اور بھی بڑھ رہا تھا۔ "دُنیا بڑی ظالم ہے۔ کوئی کسی پر ترس نہیں کھاتا ـــــ ایک بوڑھی عورت ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ـــــ ارے راستہ دو ـــــ بچّی کا دم گھٹ جاتے گا ـــــ وہ مر جائے گی" ـــــ "یہ کسی کی اولاد ہے" کوئی مرد غصّے سے بولا۔ مکھیاں بھنبھنا کر اس کے چہرے پر اُڑ رہی تھی۔ لیکن وہ خاموش لیٹی رہی۔ ...... شاید یہ ابھی اُسے کہے۔ رحمان تم کتنے دنوں بعد آئے ہو۔ اب میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی لیکن وہ تو بالکل ساکت لیٹی ہوئی تھی۔

"یہ اتنی ساکت کیوں ہے" ـــــ میں اور آگے بڑھ گیا ـــــ حالانکہ وہ نوزائیدہ بچی کوئی خوش گوار کہانی نہیں کہہ رہی تھی ـــــ اور بیتیا جذبہ تو بیت چکا تھا۔

بھلا کتنے ماہ ہوئے ہوں گے ـــــ میں ذہن میں حساب کر رہا تھا ـــــ پورا ایک سال ـــــ بڑھیا مال ـــــ کوئی ریزرو بھنوڑی ہے ـــــ تم بھی آجانا ـــــ" لوگوں کو اس کی روحانی اذیت کی خبر بھی کب تھی۔

میرا ذہن طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا ـــــ لوگوں کا شور ـــــ کچھ دُور کھڑے چند لڑکے آپس میں فحش مذاق کر رہے تھے۔

"مرے ہوئے انسان کو دیکھ کر بھی تم گندے مذاقوں سے باز نہیں آتے" ایک باریش بزرگ

نے انہیں ڈانٹا۔

"بابا اس میں میرا کیا قصور ـــــ میں قسم کھاتا ہوں، یہ بچی میری نہیں ہے" ایک لڑکا بڑی بے شرمی سے بولا۔ اس کے ساتھی پھر ہنسنے لگے۔

خدا سے ڈرو ـــ موت سب کو آئے گی ـــ کوئی نہیں بچے گا ـــ پیچھے سے کوئی آواز آئی۔

"ارے ڈرتی یہ جو اپنے گناہ آلود جسم کو لے کر یوں کئی ماہ سے یہاں پڑی ہوئی تھی۔ ہم کیوں ڈریں ـــ ہم نے کوئی گناہ و ناہ نہیں کیا" وہی لڑکا پھر بولا اور بھیڑ کو ہٹاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تو مجمع چو میں مٹ گیا۔ پگلی مر گئی۔ اپنی تلاش کو نامکمل چھوڑ کر۔ ایک رحمان کی تلاش میں نہ جانے کتنے رحمان اس کو برباد کر کے آگے بڑھ گئے" ـــ میرا دل پھر ڈوب رہا تھا جیسے مجھے سانس نہ آ رہی ہو ـــ جیسے کوئی میرا دل ہاتھوں سے پکڑے اسے مسل رہا ہو۔ جیسے وہ ابھی ابھی مجھے دہلیز میں اکیلا چھوڑ کر ساں ساں کرتی ہوا میں گم ہو گئی ہو۔

میں اس ہجوم کے درمیان خاموش کھڑا تھا ـــ اس عورت نے اس بچی کو ماں کے پھٹے پرانے دوپٹے میں لپیٹا اور ہجوم میں سے گھس کر کہیں چلی گئی۔

"ارے پگلی مر گئی" ـــ کسی بڑے گھر کی جان پڑتی ہے ـــ"

بیچاری رحمان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کھو گئی ۔ نہ جانے یہ رحمان کون تھا"

"ہو گا کوئی حرامزدہ ـــ لفنگا جو یوں اس کلی کو برباد کر کے آگے بڑھ گیا ـــ"

میں چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا ـــ لیکن میں اپنے سامنے پڑے بے حس گرد آلود وجود سے اپنا کونسا رشتہ بتاتا۔ میرا اور اس کا کوئی رشتہ تھا بھی کب ـــ آنکھوں میں آنسو سوئی کی نوک کی طرح چبھ رہے تھے، لیکن میں ان کو کیوں بہاتا ـــ اس کی باہوں کا لمس میرے سارے وجود پر ایک بار پھر چھا گیا، لیکن میں جانتا تھا یہ تازہ احساس بھی وقت کے بوجھ تلے دب کر مٹ گیا۔

اس کے لب بھینچے ہوئے تھے ـــ جیسے وہ رحمان کو پکارتے تھم گئے ہوں۔

میں یہاں کیوں کھڑا ہوں ـــ مجھے بھی دوسرے مردوں کی طرح خیال آرائی کرتے ہوئے

یہاں سے چلے جانا چاہیے، لیکن میرے قدم زمین میں سختی سے گڑے ہوئے لگ رہے تھے جیسے
مَیں یہاں سے ایک قدم بھی اُٹھا نہیں سکوں گا، لیکن مجھے جانا ہی تھا — مَیں نے لوگوں کے
ہجوم میں سے راستہ بنایا اور ایک طرف کو چل پڑا۔

ہاں میرا اور اس کا کیا ناطہ —— وہ مجھے کب پہچانتی تھی۔ بے چاری پگلی —— بے چاری
پگلی —— بے چاری پگلی —— " الفاظ کی بازگشت میرا تعاقب کرتی میرے پیچھے بڑھتی چلی آ
رہی تھی۔

"بے چاری پگلی"۔ مَیں زیرِ لب بولا اور آنسوؤں کے دو قطرے میرے گالوں کو بھگوتے زمین
میں جذب ہو گئے۔

شعارِ بے جاں

وائی۔ کے۔ اگر تم مجھ سے دس سال بڑی نہ ہوتیں، تو میں بھی اور دُوسرے بہت سارے لوگوں کی طرح تم کو دیکھتا۔ تم کو سَراہتا اور پھر اپنی ساتھی کی باتوں میں مگن ہو جاتا۔ اگر میں تم سے دس سال چھوٹا نہ ہوتا، تو تب تم لان کے گھنے کنج میں رُک کر اپنے دہکتے لبوں سے مجھے بھی پیار کرتیں اور اپنا بازو میری کمر میں ڈالے رات کے اندھیروں میں آہستہ آہستہ اپنے کمزور سے وجود سے لگائے گھومتی رہتیں۔ جیدی بھیّا، شیراز بھیّا کی طرح .....

یہ دس سال تمہارے اور میرے درمیان کھڑے ہیں اور میں ان کو مجبور نہیں کر سکتا۔ پچھلے گذرے سالوں میں اکثر ایسے ہوا ہے کہ جب تم انجانے میں ہی دل کے اندھیروں سے اُبھر کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہو تو میں جلن اور محرومی کی آگ میں جلتا اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تمہاری یاد میں کھو جاتا ہوں، تب میرے اندر کی محرومی اکثر آنسو بن کر میرے سامنے دُھند بن جاتی ہے۔ اور میں اس دُھند میں ڈوبا پھرتا رہتا ہوں .... پھرتا رہتا ہوں۔ یہ کیسی جلن ہے ۔

وائی۔ کے۔ کتنا اچھا ہوتا جو آج سے زمانوں پہلے تم ہمارے گھر آ کر نہ ٹھہرتیں۔ تم میری ماں کی رشتہ دار نہ ہوتیں، میرے لبوں پر مجروح سی ہنسی ہے۔ اور یہ ہنسی میرے لبوں پر آویزاں ہے۔ آج تم اپنی بیٹی کی اُنگلی پکڑے پورے چار سال بعد ہمارے گھر آئی ہو۔ تمہارا کمزور سا وجود بھی جاذبِ نظر ہو گیا ہے۔ تمہاری بڑی بڑی آنکھیں۔ یقیناً یہ تم ہی ہو۔ تمہاری

بچّی عرب اور پاکستان کے امتزاج کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ تمہاری یہ شادی۔ وائی۔ کے تم نے ہمیشہ دُوسروں کو چونکا دینے والے کام کیے ہیں۔ دُوسروں کو روند کر آگے بڑھنا تمہاری اپنی اَنا کی سب سے بڑی جیت تھی، کیونکہ تم دیکھتے میں اس قدر معمولی اور حقیر سی لگتی تھیں۔ اگر تمھارے چہرے پر تمہاری بھوری آنکھوں کی دلآویزی اور تمہارے ہونٹوں پر تمہارے قہقہوں کا ترنّم نہ ہوتا، تو شاید تمہارے دِل میں نہ جانے کتنی محرومیوں کے داغ ہوتے، لیکن تم جانتی تھیں کہ تمہارے سارے وجود کا جادُو تمہاری ان دو چیزوں سے ہی بنا ہے اور تم نے ان دونوں چیزوں کے جال میں نہ جانے کتنے لوگوں کو پھنسا کر بھٹکایا ہے۔ تم جو اب بھی ایک بچّی سی لگتی ہو۔

وائی۔ کے میں تمہیں بھولا نہیں تھا۔ اتنی چھوٹی سی ہستی کے لیے تو میرا دل بہت بڑا تھا، تمہیں بھُولنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ تم کو بڑا سمجھنا میرے بس سے باہر ہے۔ جیدی بھیّا نے جب تمہاری شادی کے بعد امّاں کے مجبور کرنے کے باوجود شادی سے انکار کر دیا تھا، تو مَیں سُن کر ہنسا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا مَیں ممّی کو بتادُوں اور پھر جیدی بھیّا کی شکست پر خوشیاں مناؤں کیونکہ مَیں تمہارے اور جیدی بھیّا کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مَیں بھی ان راتوں کا حصّہ دار تھا جب اکثر راتیں گئے تم اور جیدی بھیّا پھرتے رہتے تھے اور تمہاری ہنسی کا ساز میرے کانوں میں گونجتا رہتا تھا، لیکن مَیں تو صرف لڑکا تھا جو تم سے دس سال چھوٹا تھا۔ چند ماہ بعد ہی جیدی بھیّا تمہیں بھُول بھال کر شادی رچا کر خوش رہنے لگے تھے اور مَیں اکثر تنہائی میں سوچتا ہوں؛

تمہارا جادُو صرف مجھ پر ہی اتنا گہرا کیونکر اثر انداز ہوا ہے کہ مَیں تمہاری دُوری کے باوجود تمھیں بھُول نہیں سکا، سُنتے ہیں یہ زندگی کی پہلی خوبصُورتی بہت دیرپا ہوتی ہے، لیکن مَیں اکیلا ہی اس کا کیوں شکار ہوا۔ شاید مجھ میں تم سے دُور بھاگنے کی طاقت نہ تھی۔ شیراز بھیّا، جیدی بھیّا، اور میرے ڈیڈی، وائی کے، تمہاری فتح کے نقوش نہ جانے کس کس کے دل پر ثبت ہیں اور تمہاری اَن گنت فتوحات نے نہ جانے تمہیں کتنی طمانیت دی ہوگی۔ لیکن تمہیں کیا۔ تمہیں کبھی یاد آتا ہے کہ ان رنگینیوں میں میرے معصوم دل کا لہو بھی شامل ہے۔ اور مَیں تمہاری

اَن گنت کامیابیوں میں ایک موہوم نقطہ ہوں۔ آج پھر میں تمہیں دیکھ کر اُسی رنج اور خوشی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ تم میرے دروازے میں کھڑے ہو۔ تم نے آگے بڑھ کر اپنا بازو میری کمر میں ڈال دیا ہے۔ اور میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ہو۔ تمہاری مسکراہٹ۔ تم کہہ رہی ہو :

"سویٹ بوائے، تم ہمیشہ مجھے اتنا یاد آتے رہے ہو۔" میں تمہاری قربت میں ہمیشہ سے زیادہ پگھل رہا ہوں۔ کیونکہ یہ گزرے چار سال مجھے بہت کچھ سکھا گئے ہیں۔ جسم کے بھید، ہاں میں ان سے آگاہ ہوں، لیکن میں اس کیفیت کو کیا نام دوں۔ کیا میں خوش ہوں، کیا میں رنجیدہ ہوں۔ پورے چار سال۔ اور اس وقت تم میرے کس قدر قریب ہو، پچھلے ماہ کا دیکھنا بھی کوئی دیکھنا تھا۔

وائی۔ کے۔ تم کیسی ہو، میں نے لرزاں سی آواز میں پوچھا ہے۔ میں تمہارے چہرے کو دیکھ رہا ہوں، اس وقت میرا قد تم سے بڑا ہے۔ تم میرے مقابلے میں بالکل بچی سی لگ رہی ہو۔ لیکن میں تصوّر کے آئینے سے جھانکتا ہوں۔ اپنا تم سے دس سال چھوٹا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ جس میں تمہارے ساتھ کرکٹ کھیلنے پر خوشی کی اچھوتی سی کرن لرز رہی ہے۔ جو ہر روز تمہارے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر پوچھا کرتا تھا کہ وائی۔ کے، تم پھول لینا پسند کرو گی اور تم اپنی بھوری آنکھوں میں دنیا کا پیار سمیٹ کر کہا کرتی تھیں۔

"تم کتنے اچھے ہو فرید۔" اور مجھے نہ جانے ان لفظوں میں کون سا طلسم کدہ آباد نظر آتا تھا کہ میں ان کو سُن کر تا سرشار ہو جاتا تھا اور سیٹی کی تیز دھن میں بھاگتا تمہارے لیے سب سے خوبصورت پھول توڑ کر لایا کرتا تھا، اور اس وقت، تمہاری آنکھوں میں ویسی ہی چمک ہے، لیکن وہ لڑکا نہیں رہا، کیونکہ دل کے اندھیروں میں میری قسمت کے چند اُدھورے خیال اور محرومی کے لامتناہی سلسلے ہیں۔

"کیوں فرید میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہوں نا؟" تم میرے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جسم کے خطوط کو دیکھتی ہوئی مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ اور میرا دل کر رہا ہے کہ میں کسی رومن شہزادے کی طرح تمہارے سامنے جھک جاؤں اور اپنی ساری زندگی تمہارے قدموں پر

نچھاور کر دوں، لیکن تمہاری بچّی کے رونے کی آواز تمہیں سنائی دے رہی ہے اور تم ہمیشہ کی طرح مجھے میرے اندر قید چھوڑ کر اپنی بیٹی کی طرف بھاگ رہی ہو۔ ہاں وائی۔ کے۔ تم ہمیشہ اپنی طرف ہی بھاگتی رہی ہو۔ راہ میں آتے لوگوں کو روندتی ہوتی۔ اور میں تم سے کبھی نہ کہہ سکوں گا کہ وائی کے مجھے میرے جال سے چھڑاؤ۔ ایسا جال جو تمہارے خیالوں سے بنا ہوا ہے۔ میں اپنے اندر قید ہوں۔"

دُور سے تمہارے قہقہے گونج رہے ہیں۔ اور میں تم سے اور بھی دُور ہٹ گیا ہوں۔ تمہارے قہقہے ہر طرف گونج رہے ہیں۔ میرے اندر۔ میری رُوح میں۔ ساری کائنات میں۔ وائی کے بھلا میں تم کو اپنی کائنات کیوں سمجھ رہا ہوں، حالانکہ حقیقت کی تلخی میرے سامنے عیاں ہے.........

درخت شام کے بوجھ کو سہارے بڑے تھکے ہوئے اور غمگین لگ رہے ہیں اور یہ فضا اتنی اُداس کیوں ہے۔ میں تمہاری موجودگی کے باوجود مُسکرا نہیں سکتا، میرا دل اتنا اُداس کیوں ہے۔ وائی۔ کے۔ شاید تم مجھے ابھی بھی وہی بچّہ سمجھ رہی ہو، جس نے آج سے سالوں پہلے تمہارے گلے میں بازو ڈال کر پوچھا تھا:

"وائی کے۔ کیا ہم لوور نہیں ہیں۔ وائی کے۔ ہم ایک دُوسرے سے محبّت کرتے ہیں نا"

میری آواز میں میرے دل اور احساسات کی سچائی تھی۔ آج میں یہاں بیٹھا سوچ رہا ہوں۔ کیا میرے اُن چند لفظوں نے مجھے اپنے حصار کے اندر قید کر لیا ہے۔ کیا میں بھی اُنار کلی کی مانند اپنے سچے جذبات کی چار دیواری میں مقیّد سانس سانس مرتا نہیں رہا۔ ہاں قرنوں سے صدیوں سے میں اس زنداں میں قید ہوں۔ میں جانتا ہوں میری رہائی نہیں ہوگی، تم تو میری آواز کی پہنچ سے بہت دُور ہو، صرف ایک ننھی سی شعاع ہے، اگر وہ بھی بے جان سی، لیکن آج تک نہ جانے میں اِسی کرن کی طرف دیکھتا کیوں یہاں تک چلا آیا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی امیّد نہیں، لیکن اس وقت تم میرے گھر میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں، تمہارے بوائے کٹ بال تمہاری پیشانی تک آتے ہوتے تھے اور تمہاری بھُوری آنکھیں تمہارے چہرے پر ہمیشہ کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔

شاید وائی۔ کے تمہیں یاد ہو کہ تم نے میری بات سُن کر اپنا سَر اوپر اُٹھایا اور کچھ سوچتے ہوئے تم نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر میرے لبوں پر پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

" ہاں فرید ہم لَور زہیں اور پکّے لَور زہیں " اور میں تمہارے دو ہاتھوں میں جکڑا ہوا ایک دم ٹھنڈا ہو گیا تھا، کوئی اَن ہونی خوشی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، ایسا بوجھ جو مجھ سے برداشت نہ ہو سکے، اور پھر یکایک میں تپ اُٹھا تھا، گرمی شدید گرمی۔ خوف اور خوشی کی لپیٹ میں آیا ایک بچہ۔ اگر اس وقت میں اپنی خوشی تم پر ظاہر کرتا تو تم یقیناً حیران ہو جاتیں اور پھر تمہیں اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا لیا۔ ان آنسوؤں کی طرح جو اس وقت میری آنکھوں میں بھرے پڑے تھے۔ وائی۔ کے جب میں اس دن کے بارے میں سوچتا ہوں تو کرب اور دُکھ سے میرا گلا رندھ جاتا ہے۔ میں نے حیات کے اس قدر عظیم اور خوبصورت بوجھ کو بے خبری میں ہی اٹھا لیا تھا اور آج تک میں اسے اُٹھائے کسی منزل کی تلاش میں ہوں۔

میں نے تمہارے ہاتھوں کو آہستہ سے چوما تھا اور پھر جب میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو پھول زیادہ خوبصورت اور زیادہ بڑے لگے تھے، جیسے وہ پہلی بار مجھے نظر آتے ہوں۔ خوشی کے انوکھے بوجھ تلے دبا میں چپ چاپ کھڑا رہا، آج میں سوچتا ہوں میں ہمیشہ کی طرح کیوں ہنس نہیں سکا تھا۔ میں نے اس روز کرکٹ کے بیٹ اور بال کو ہاتھ بھی نہ لگایا، مجھے اپنا آپ ایکدم اس قدر اہم اور بڑا لگنے لگا تھا، اور میں اس بڑائی کو بہت سنجیدگی سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، میرا دل اَن کہی داستان سے بھرا پڑا تھا۔ میں ایک بار پھر تمہارے سامنے کھڑا تمہیں دیکھتا رہا اور جب تم نے مُسکرا کر میرا ہاتھ پکڑا تو میں پھر بھی مُسکرا نہ سکا۔ میں تمہارے کمرے سے نکل کر اپنے دوست کامران کے گھر چلا گیا۔ وہ اپنی البم میں ٹکٹ لگا رہا تھا، میں نے اسے سب کچھ بتا دینا چاہا تھا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسے کیا بتاؤں۔ میں نے آہستہ سے پُوچھا تھا۔

" کامی جب تم پکچر دیکھتے ہو تو تمہیں سب سے زیادہ کیا اچھا لگتا ہے "

اور کامی نے اپنی البم کو بند کر کے بڑے جوش سے کہا تھا۔

" آہا، کتنا مزا آتا ہے جب لڑائی ہوتی ہے، ہیرو کتنی پٹائی کرتا ہے " اور وہ ہوا میں زور

زور سے مُکّے چلانے لگا۔

"اور ہیرو ہیروئن کی باتیں"، میں نے آہستہ سے کہا۔

"یار سب فضول، مجھے تو پکچر میں بس لڑائی والے پارٹ اچھے لگتے ہیں"۔

"کامی کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے"، میں اپنے بوجھ کو جلد سے جلد اتار دینا چاہتا تھا۔ مجھے اپنا آپ اس سے بڑا اور اونچا لگ رہا تھا۔

"ہاں، مجھے اپنی ممّی سے بہت محبت ہے، مجھے اپنی بہن گڑیا اچھی لگتی ہے، مجھے ننھا مشغل اچھا لگتا ہے"۔ اس نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا تھا اور زمین پر پڑی ٹکٹوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ پھر ہم دونوں کومکس پڑھتے رہے، مجھے کامران ایک دم بے وقوف اور بدھو لگ رہا تھا، بھلا یہ کیا جانتا ہے، کچھ بھی نہیں۔ وائی۔ کے۔ بات تو یہ ہے کہ تمہاری موجودگی نے وقت سے کہیں پہلے مجھے میری ذات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگر تم ہمارے گھر نہ آتیں تو میں بھی کامران کی طرح بچّہ ہی رہتا اور کومکس پڑھنے میں مزہ لیتا۔ میری اپنی چھوٹی سی دُنیا ہوتی، جس میں کومکس ہوتے۔ بیٹ اور بال ہوتا، اور پھر پریوں کی کہانیاں، لیکن اِس وقت کامران کے سامنے مجھے اپنا وجود بہت اُونچا اور پُراسرار لگ رہا تھا۔

ان دنوں میں بہت خوش رہتا تھا۔ اور اکثر دبے قدموں تمہاری کھڑکی سے لگا پردوں سے تمہیں جھانکنے کی کوشش کرتا، مجھے لگتا تھا تم میری ہو، بس میری۔ میں اسکول سے آکر تمہارے گرد ہی تو رہتا تھا۔ تمہارے کام کر کے مجھے بیحد خوشی ہوتی تھی۔

ایک روز ممّا نے ڈانٹ کر کہا تھا "فرید میں نے تمہیں کبھی پڑھتے نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھو وائی۔ کے۔ کے گرد چکر لگاتے رہتے ہو" اس روز ممّا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کلب نہیں جا سکی تھیں اور اپنے بڑے سے بیڈ پر لیٹی کسی شہزادی کی مانند خوبصورت اور باوقار لگ رہی تھیں۔ میں نے ممّا کے پاس کھڑے ہو کر تمہیں دیکھا۔ تم ہنس رہی تھیں اور تم مجھے ممّا سے بھی زیادہ دل کش لگی تھیں، حالانکہ میرے ممّا کی خوبصورتی کا سارے خاندان میں شہرہ تھا، لیکن میں ممّا کے بیڈ پر بیٹھا صرف تمہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے احساسات کی شدّت کا تو اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں تو بس خوش تھا، بیحد خوش.....

تم نے ہنس کر کہا تھا۔" فری ڈیئر، مَیں بھی تو فرید سے بہت پیار کرتی ہوں" اور تم نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنی گردن میں ڈال لیے۔" سویٹ گڈے۔ جاؤ جا کر پڑھو۔ نہیں تو مَمّا خفا ہو جائیں گی۔" اور تم میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور میں تمہارے بارے میں سوچتا کمرے سے چلا گیا، کمرے کے باہر سردیوں کی نرم دُھوپ سبز لان میں بکھری ہوتی تھی اور سَرو کے لانبے درخت ساکت کھڑے تھے اور مَیں بے حد اطمینان سے تمہارے بارے میں سوچتا جا رہا تھا، لیکن یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ تمہارا پیار بھی اس ٹوفیوں کے ڈبے کی مانند بے حقیقت تھا جو اکثر تم کالج سے واپسی پر میرے لیے لایا کرتی تھیں، کیونکہ تم مجھے محض ایک بچہ سمجھتی تھیں جو ایک خوبصورت چیز کے لیے مچل گیا تھا؛ حالانکہ وائی۔ کے زندگی میں کبھی بھی تمہیں اتنا تو کسی نے بھی پسند نہیں کیا ہوگا، چاہے وہ تم سے کتنی بھی محبت کرتا ہو۔ تمہاری ہر بات مجھے اچھی لگتی تھی۔ تمہارے لبوں کا خم، تمہاری آنکھوں کی شرارت بھری چمک تمہارا چھوٹا سا متناسب وجود جو مجھے لگتا تھا کہ ان دنوں بھی میری بانہوں میں سما جائے گا۔ اور مَیں تمہیں لے کر کہیں بھی جا سکوں گا، بغیر تھکے ہوئے۔ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر سکوں گا۔ اُونچا، بہت اُونچا۔ اور اس وقت تم اپنی بچّی کے ساتھ باہر لان میں پھر رہی ہو، یہ تم ہو وائی۔ کے، یہ تمہیں تو ہو، جس کو مَیں نے ایک روز کھو دیا تھا، آسمان کی وسعتیں تو کہیں نہیں ہیں......

مَیں تو بس آنکھیں بند کیے تمہارے گرد چکّر لگا رہا تھا، اور تم نہایت لاپرواہی سے اپنے بالوں کو جھٹک کر جیدی بھیّا سے باتوں میں مصروف ہو جاتی تھیں، یا شیراز بھائی کے ساتھ ان کی گاڑی میں لمبی سیر کو نکل جاتیں؛ اور مَیں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تمہاری راہ دیکھتا، مَیں نے ان دنوں تمہاری تصویر بنانے کی کوشش میں پنسل اسکیچ بنانے سیکھے تھے۔ مَیں تمہارا ویسا ہی مکمل اسکیچ بنانا چاہتا تھا، جتنا میرے دل کے اندر تھا۔ مَیں اکثر رات کو اکیلا بیٹھا اپنے کمرے میں تمہاری شبیہہ کو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا رہتا، اور چکور تیز آواز میں چاندنی میں اپنے پَر پھڑپھڑاتا درختوں کے اُوپر سے گزر جاتا، اور میں زیادہ شدّت سے تمہارے سحر میں قید سفید کاغذ پر لائنیں کھینچنے لگتا، لیکن ہر لائن مجھے اُدھوری اور نامکمل لگتی،

میرے ہاتھ میرے دل کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، تب میں جھنجھلا جاتا، اور تمہارے بارے میں سوچنے لگتا۔ اور تمہارے بازو میرے سارے وجود پر چھا جاتے اور پھر نہ جانے مَیں کہاں کھو جاتا، کھونا میرا مقدر جو تھا۔

کئی روز کی تگ و دَو کے بعد مَیں نے تمہارا اسکیچ مکمل کر ہی لیا اور مَیں تمہیں چونکانے کے لیے اس کو چھپا چھپا کر رکھتا تھا۔ اُن دِنوں وہ سفید کاغذ اور ان پر کھینچی لکیریں ہی تو میرا سب سے قیمتی سرمایہ تھیں، میرے اپنے دل کی طرح۔

مَیں بے چینی سے رات کا انتظار کر رہا تھا، چاند کا نامکمل وجود لان میں بہت اُوپر ایستادہ تھا اور شیشم کے درخت ملگجے اندھیرے میں ڈوبے کھڑے تھے۔ نومبر کی پہلی سَرد ہوا، ہولے ہولے میرے چاروں طرف اُڑ رہی تھی۔ مَیں دَبے قدموں سے برآمدوں میں چلتا ایک نئی اور انوکھی دُنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، ایسے جزیرے کی طرف جس میں صرف تم تھیں، اور مجھے تمہیں کا کھوج نکالنا تھا۔ میرا دل زور زور سے میرے پہلو میں اُچھل رہا تھا، لیکن تم اپنے کمرے میں نہیں تھیں بے ترتیب کتابیں۔ انگلش رسالے، تمہارے بستر کی گرمی، مَیں وہاں کھڑا ہر طرف تمھاری موجودگی محسوس کر رہا تھا۔

"وائی۔ کے!" مَیں نے آہستہ سے تمہیں آواز دی۔ وائی۔ کے اور جب انتظار کے باوجود بھی تم نہ آئیں، تو مَیں نے باہر نِکل کر تمہیں دیکھا۔ درختوں کے جُھنڈ کے پاس تم کھڑی تھیں، لیکن اکیلی نہیں تمہارے ساتھ شیراز بھائی تھے، مجھے لگا جیسے کوئی تیز نوکدار بھالا میرے دل میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ مَیں نے اپنی چیخ مشکل سے روکی تھی اور تمہارے کمرے میں آکر مَیں نے اتنی کاوش سے بنایا ہوا اسکیچ پھاڑ ڈالا تھا۔ مَیں شیراز بھیّا کو بھی پُرزے پُرزے کر کے اُڑا دینا چاہتا تھا، لیکن میرے پاؤں بوجھل تھے۔ مَیں کیوں رنجیدہ تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ مَیں چیخ چیخ کر روؤں۔ میری سب سے قیمتی متاع گُم ہوگئی تھی۔

مَیں تم سے ناراض ہوگیا تھا۔ مَیں نے اگلی صُبح تمہارے کمرے میں پھُول نہیں سجاتے تھے۔ مَیں تو ساری دُنیا سے ناراض تھا، شیراز بھائی سے۔ جیدی سے اور مَیں نے سوچا تھا، کتنا اچھا ہو جو مَیں چپکے سے مر جاؤں۔

میں ساری رات آنکھیں کھولے اندھیرے کو دیکھتا رہا تھا۔ میں نے پہلے تو کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ تم کتنا وقت جیدی بھیا کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے میں لگاتی ہو۔ اور تم شیراز بھائی کے ساتھ اتنی لمبی لمبی ڈرائیو پر کیوں جاتی ہو۔ شاید اس لیے کہ میں تو اپنے اندر مقید ہو گیا تھا۔ لیکن اس لمحے مجھے لگا تھا جیسے تم نے میرے مُنہ پر بھرپور طمانچہ مارا ہو، میرے چھوٹے سے وجود کو روند ڈالا ہو۔ مٹا دیا ہو، اور جب میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تو مجھے اپنی آنکھوں کے آنسو سنبھالنے مشکل ہو رہے تھے۔

"تمہارا جی تو ٹھیک ہے نا" مما نے میری سُرخ آنکھیں دیکھتے ہوئے پوچھا، اور تم نے کالج کیلئے ناشتہ دان میں ٹوسٹ رکھتے ہوئے میری طرف سرسری نظر سے دیکھا تھا۔

"مما ٹھیک ہوں" میری آواز دُکھ سے بھاری تھی۔ "ارے کاکو!" مما نے نوکر کو آواز دی۔ "جاؤ چھوٹے صاحب کو کمرے میں لٹا آؤ، اور دیکھو ڈاکٹر کو فون کر دینا کہ آکر دیکھ جائیں" کمرے سے جانے سے پہلے میں نے تمہاری طرف دیکھا تھا، لیکن تم اسی طرح ناشتہ کرتی رہی تھیں۔ تم نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ شاید تم اپنے رات کے حسین خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ خواب کے جزیروں میں کوئی راہ نہیں ہوتی۔ وائی۔ کے۔ اس روز اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے میں لیٹا سارا دن تمہارے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ میرا ذہن پورا بیدار نہیں تھا۔ اور آنسو میرے کانوں میں بھر گئے تھے، میرا دل کانٹے کی طرح میرے پہلو میں چبھ رہا تھا۔ اور جب میں جاگا تو ملگجا اندھیرا روز کی طرح میرے سب طرف بچھا ہوا تھا۔ درختوں کے اوپر سفید بادلوں کے ہنس تیر رہے تھے۔ اور ہوا تمہارے بال چھو رہی تھی۔ تم نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر جیدی سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

تو وائی۔ کے۔ تم نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ کہ میں تم سے اور صرف تم سے ناراض ہوں۔ میں نے آج تمہارے ساتھ کرکٹ نہیں کھیلی۔ میرا دل اور بھی رنجیدہ ہو گیا، اور بھی دُکھی اور بوجھل۔ اپنے نظر انداز کیے جانے کی جلن۔ میرا دل میری اَن کہی اور ناپختہ داستان سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کیے۔ چھن چھن شیشہ ٹوٹ کر سب طرف بکھر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن میرے ٹوٹے جذبات سے بھرا پڑا تھا۔ جیسے

میں لفظوں کا روپ نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے لگتا ہے تم کوئی بھی نہیں تھیں۔ بس ایک ہیولا تھیں جو میری اپنی تخلیق تھا، اور اس ہیولے میں میرا اپنا آپ مٹ گیا تھا۔ میرا ذہن بوجھل تھا۔ اور میرا دل بھاری پتھر کی مانند مجھے کچل رہا تھا، اور پھر میں اپنے کمرے میں اکیلا کھڑا چیخ چیخ کر رونے لگا تھا۔

وائی۔کے تم کو پتہ ہوگا کہ تمہاری ایک تصویر میرے پاس تھی اور وہ تصویر مجسّم بنکر میرے حواسوں پر چھائی رہتی تھی کھیل کے میدان میں، کاپیوں کے کاغذوں میں بلیک بورڈ کے حروف میں۔ یاسمین خرم کیا یہ محبّت تھی۔ یاسمین خرم میں تو ایک بچہ تھا۔ جو تمہارے جیسے قیمتی کھلونے سے کھیلنا نہیں جانتا تھا۔ اور میں اس کے لیے کسی کو کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا، میں کیا کہتا۔ اور کتنے ہی دنوں بعد جب میں بستر پر لیٹا اپنے سب طرف پھیلی خاموشی سے ہراساں ہو رہا تھا اور اپنے اتنے دنوں کے کمزور وجود کو سنبھالے تکیوں کا سہارا لیے ہوتے تھا۔ میں نے اپنے دروازے کے اندر آتے تمہیں دیکھا تھا، اور ایک بار پھر میں اسی اذیّت دہ تصور میں گھر گیا تھا، اور نمکین آنسو میرے گالوں سے رِستے میری قمیص پر گرنے لگے، ان کا ذائقہ میری زبان پر بھی اُتر آیا تھا۔

تم نے میرے پاس بیٹھتے ہوتے میرے گرد اپنے بازو ڈال دیئے تھے اور پیار سے کہا تھا:

"فیدی میں تمہارے بغیر بہت اُداس رہی ہوں، اب جلدی سے اچھے ہو جاؤ نا، میں نے کرکٹ کا نیا گیند خرید لیا ہے۔ اور دیکھو ہم دونوں اکٹھے جا کر نئے کومکس خریدیں گے۔" وائی کے اب میں سمجھتا ہوں کہ تم دُوسروں سے کھیلنے کا فن جانتی تھیں۔

میں نے چاہا تھا کہ میں تمہارے بازو ہٹا دُوں، اور مُنہ پھیر کر بیٹھ جاؤں۔ لیکن پھر نہ جانے کیسے میں تمہارے کندھے پر سَر رکھے بے تحاشہ رونے لگا تھا۔

میں جان گیا تھا کہ تم سے دوستی توڑ کر میں خوش نہیں رہ سکتا، میں اتنے تنہا دنوں میں تمہارے اس چھوٹے سے وجود کی خواہش میں ہی تو بیمار رہا تھا۔ تمہاری آنکھوں کی شرارت بھری چمک کے کھو جانے کا دُکھ ہی تو مجھے نڈھال کر گیا تھا۔ یہ میری اپنی دُنیا تھی جس کی

خوشی میں نے تم سے مُستعار لی تھی۔

پھر تم میرے پاس بیٹھی، مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں، تمہاری ہنسی صرف میرے لیے تھی، میں نے کھڑکی سے باہر خزاں کی پہلی ہوا کو محسوس کیا، درختوں کے زرد پتے باہر کے چکنے فرش پر پھسل رہے تھے۔ اور برآمدوں میں منی پلانٹ کی بیل پر کئی زرد پتے سر نیہوڑائے غمزدہ سے لگ رہے تھے۔

میں اس اُداس ماحول میں بھی تمہاری موجودگی سے خوش تھا۔ اور تمہارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑے مجھے اپنا آپ ہمیشہ سے زیادہ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا اندرونی دُکھ اس وقت خزاں زدہ پتے کی مانند مجھ سے ٹوٹ کر کہیں گم ہو گیا تھا۔

اگر وقتی دُکھ دبے قدموں ہماری طرف بڑھتے ہوئے ہماری ناکامیوں کا مداوا ہوتے تو میں کبھی غمزدہ نہ ہوتا۔ میں نے نہ جانے کس طرح حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا میں یکایک اپنے سے کئی گُنا بڑا ہو گیا تھا۔ ہر کام کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو اُدھورا سا پاتا۔ میں اب بھی پینسل اسکیچ بناتا تھا لیکن ان میں تمہارا اسکیچ نہیں تھا۔ کیا فائدہ، تم میرے دل کے نہاں خانے میں ہی تو تھیں، تم جو بھی تھیں جیسی بھی تھیں، بس مجھے اچھی لگتی تھیں۔

اس روز میں ایک نیا کومکس لایا تھا، اور تمہارے ساتھ مل کر پڑھنا چاہتا تھا، اور پھر تمہارے قہقہے، تمہارے مزیدار ریماکس۔ وائی۔ کے تم تو کالج میں پڑھتی تھیں پھر بھی تمکو کومکس اچھے لگتے تھے، لیکن اب مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہاری اپنی پسند نہیں تھے بلکہ تم صرف میرے لیے انکو پڑھتی تھیں تمہیں دوسروں کو اپنے بس میں کرنا خوب آتا ہے۔ میں تیز سیٹی بجاتا تمہارے کمرے کیطرف گیا تھا۔ تمہارا کمرہ بند تھا، لیکن شاید تم اس کی چٹخنی لگانا بھول گئی تھیں، کیونکہ جب میں نے اسے ذرا زور سے دھکیلا تو وہ کھُل گیا اور پھر تم کود کر اپنے بستر سے نکلی تھیں۔

تمہارے بال بکھرے ہوئے تھے، تمہارے چہرے پر رنگ سا تھا، شرارت کا رنگ، مسکراہٹ کا رنگ۔

تم نے اپنے بالوں کو ہاتھ سے سُلجھاتے ہوتے ایک بازو میری کمر میں ڈال دیا — اور جُھک کر میری گردن پر بوسہ لے لیا تھا۔

اور مَیں نے آنکھیں بند کر کے سوچا تھا، زندگی کتنی پیار کیے جانے کے قابل ہے، اور مجھے لگا تھا جیسے کائنات کا کوئی چھپا راز مجھ پر منکشف ہو گیا ہو، ازلی محبت کا راز۔ تمہارا وجود ہمیشہ ہی میرے لیے ایک پُراسرار جذبہ بن جاتا تھا۔

اور جب مَیں نے آنکھیں کھولیں، تو وہاں چارپائی کی پائینتی ایک نوجوان کھڑا تھا۔

"دیکھو فریدیہ ہیں میرے کلاس فیلو۔ مجاہد کاظمی"، تم نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تھے اور روشنی کمرے میں گھس آئی تھی۔ باہر درختوں کے اُوپر آسمان شفّاف نیلا اور اُجلا اجلا تھا۔

مَیں نے اس نوجوان کو دیکھا۔ میری اَنا ایک دفعہ پھر مجروح ہوئی۔ میرے دل میں پہلے کی طرح درد کا ایک ننھا سا کانٹا چبھ گیا تھا، لیکن ابھی ابھی تمہارے ہونٹوں کا لمس میرے وجود سے پیوست تھا۔ مَیں خوش تھا۔ اور سامنے کھڑا نوجوان اپنی نظر کی عینک کے پیچھے سے آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ مَیں بھی مُسکرا پڑا، مَیں نے مُسکرانا سیکھ لیا تھا۔

"فریدیہ ہیں مجاہد کاظمی۔ میری کلاس کے سب سے لائق لڑکے۔ اور فرید آج تک یہ ہمیشہ اپنی کلاس میں اوّل آتے رہے ہیں"

مَیں نے مجاہد کاظمی کے وجود کو ذہن سے بُھلانے کی کوشش کی۔ تم نے اس پر مجھے ترجیح دی تھی۔ مَیں کیوں خوش نہ ہوتا۔

"دیکھو فیدی، مَیں اور مجاہد پڑھ رہے ہیں۔ مَیں ذرا اپنا کام پورا کر لوں، پھر ہم دونوں کرکٹ کھیلیں گے"، تم نے میز سے اُٹھا کر کئی ٹافیاں میری طرف بڑھا دیں۔ مَیں نے چُپکے سے ٹافیاں لے لی تھیں۔ اور کومکس کو پھاڑ کر باہر برآمدے میں ایک کونے میں ڈال دیا تھا......

اَب مَیں سوچتا ہوں۔ میرا سارا کرب اِس لیے تھا کہ مَیں تمہیں صرف اپنے لیے سمجھنا چاہتا تھا، لیکن تمہارے دُوسرے دوست میرے وجود کی نفی کر دیتے۔ مَیں تو تمہارے وجود کے لمس میں کھو گیا تھا۔

لیکن یہ تو مجھے بعد میں احساس ہوا کہ تمہاری ساری خوبصورتی جو تمہارا ہتھیار تھی صرف

مجروح کرنا جانتی تھی تم نے مجھے ہی نہیں بلکہ مجاہد کاظمی کو بھی ناکارہ بنا دیا تھا۔ وائی۔ کے تم واقعی اتنی ہی تشنہ رہتی تھیں یا ہم سب محض تمہارے کھلونے تھے جن سے جی بھر جانے کے بعد تم ان کو ایک طرف ڈال دیا کرتی تھیں۔

اس روز تم جیدی بھیا کے ساتھ نہ جانے کہاں گئی تھیں اور میں کرکٹ کا بال لینے سڑک پر گیا تھا، تو مجاہد کاظمی وہاں کھڑا تھا۔

وہ خوش نہیں تھا۔ وائی۔ کے شاید تم دُوسروں کے دُکھ سے ہی سُکھ حاصل کرتی تھیں۔

وہ خوش نہیں تھا، کیونکہ اُس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"ہیلو ینگ بوائے" اس نے مجھے دیکھ کر زبردستی مُسکرانے کی کوشش کی، کیا مس خرم گھر ہیں" اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے اور مضطرب سا کھڑا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ میں اپنا بیٹ پورے زور سے اس کے سر پر دے ماروں، لیکن نہ جانے اس کے کس انداز نے مجھے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور پھر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کو اپنی ٹکٹوں کا البم دکھاؤں اور اپنا خریدا ہوا کومکس اسے پڑھنے کے لیے دے دُوں۔ اور پھر لیکن وہ کرسی پر بیٹھا دھیمی دُھن میں سیٹی بجاتا رہا تھا۔ اور اس کے پاؤں ہل رہے تھے، اور پھر نہ جانے کیوں میں اس سے تمہاری باتیں کرنے لگا۔ پھر میں نے پوچھا تھا "مجاہد صاحب کیا آپ وائی۔ کے سے محبّت کرتے ہیں" "کون وائی۔ کے" اس نے چونک کر پوچھا۔

"یاسمین خرم، ہم سب اس کو وائی۔ کے کہتے ہیں" میں نے اسے بتایا، گھر میں اس کا یہی نام ہے" وہ میری طرف بہت غور سے دیکھنے لگا" فرید میاں، کیا تم جانتے ہو، محبّت کیا ہوتی ہے؟" اُس نے کُرسی پر آگے میری طرف جُھک کر پُوچھا تھا۔ اس کی آواز میں ایک اسرار تھا، جیسے وہ تمہارا ذکر کرنے پر اسی انداز سے متجسّس ہو جس طرح میں کسی پَری یا شہزادی کے ذکر پر ہو جایا کرتا تھا۔ جب تم ہمارے گھر نہیں آئی تھیں محبّت، میں نے سوچا، تم سے میرا شدید لگاؤ اور کیا تھا۔ میں اس کا لہجہ اور انداز دیکھ کر ہنس پڑا" ہاں، مجاہد صاحب میں جانتا ہوں، میں تو بہت کچھ جانتا ہوں، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بھی وائی۔ کے

سے محبت کرتے ہیں۔" وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"فرید میاں تم چھوٹے ہو ابھی، تم کیونکر جان سکتے ہو کہ یاسمین خرم میں کیا جادو ہے۔ اور اس سے محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔" وہ مجھ سے باتیں نہیں کر رہا تھا، وہ اپنے خیالات کو زبان دے رہا تھا۔ وہ تو شاید میری موجودگی سے بھی آگاہ نہیں تھا، میں بھی تو تمہارے جادو کا اسیر تھا۔ میں جانتا ہوں، میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، میں نے پکچروں میں دیکھا ہے۔

میں اس کی سوچتی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔

"فرید میاں، کیا تم جانتے ہو کہ جب میں نے یاسمین خرم کو کالج میں دیکھا تو میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بھلا اتنی چھوٹی سی چیز کی طرف دیکھنا کوئی ضروری تو نہیں ہوتا۔ اور پھر ایک روز تمہاری وائی۔ کے نے اپنی گاڑی کا پٹ کھول کر مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا، اور اس وقت سے لیکر آج تک میں وہاں بیٹھا ہوں اور صرف اس کی ہنسی کے ترنم، اُس کی بھوری آنکھوں کی چمک اور بالوں کے جادو میں کھو گیا ہوں۔ میرا اپنا آپ گم ہو گیا، میرا مستقبل، میرا سارا پڑھائی کا کیرئیر۔ میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، لیکن وہ مجھ سے خفا ہو گئی ہے، شاید اب اسے اپنی کلاس کا صغیر ملک اچھا لگتا ہے۔" وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گیا۔ اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر منت بھرے لہجے میں بولا:

"فرید میاں، اس سے میرا ذکر کرنا، میرے لیے اُس کے دل میں جگہ بنانا۔ میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔" اس نے کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ بوجھل قدموں سے فرش پر ہلکی ہلکی ٹھوکریں لگاتا چلا گیا۔ دُور سڑک پر اس کا ہیولا مجھے نظر آ تا رہا تھا۔ اور میں اپنے گیٹ پر کھڑا جو گیا پھولوں کی مدھم خوشبو کو سونگھتا اور ان کو آنسوؤں کی طرح بے آواز گرتا دیکھتا رہا تھا۔ یہ میرا اپنا غم تھا کہ تم جو بھی ہو، کیوں دُوسروں کے لیے بھی ہو۔ وائی۔ کے۔ تم یقیناً ظالم ہو، اگر ظالم نہ ہوتیں، تو اس کا ذکر سُننے پر یہ جواب نہ دیتیں۔

"بھئی یہ مجاہد کاظمی بہت بور انسان ہے۔ اس کا ذہن کتابوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔" اور تم نے ہنس کر ریکارڈ پلیئر کو آن کر دیا تھا اور میرے بازو تھامے ٹوسٹ کرنے لگی تھیں اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا۔

" فرید سویٹ اس وقت میں تم سے اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجاہد بور ہے۔ بالکل بور ہے۔ اور تم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور اب میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری وہ ہنسی تمہاری اپنی فتح کا شادیانہ تھا۔ تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ جس فتح کی تم متمنّی ہو وہ مجاہد کاظمی کے ٹوٹے پندار میں تمہیں مل گئی تھی، تمہارے جانے کے بعد میں نے اُس کہانی کے ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ کہانی کچھ اس طرح بنی ہوگی، کیونکہ باقی کہانیوں کو تو میں نے اپنے سامنے بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔

اس نے تمہیں اس روز دیکھا ہوگا جب تم اپنے کمزور سے جسم کو لاپرواہی سے ڈھیلے سے کرتے میں چھپاتے کالج گئی تھیں۔ اس نے تمہیں دیکھا اور نظرانداز کر دیا ہوگا۔ اس نے یاسمین خرم کو نظرانداز کر دیا تھا جو ایک ایمبیسڈر کی بیٹی تھی۔ جس کے گھر کے ہر فرد کے پاس الگ الگ گاڑی ہوتی تھی۔

وائی۔ کے۔ میں زور زور سے قہقہے لگانا چاہتا ہوں، کیونکہ مجاہد کاظمی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کمزور سی لڑکی جو ایک روز اس کی راہ میں آئی اور اس نے اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے سب سے خوبصورت جذبے کو پائمال کرتی ہوئی اس پر ہنسے گی۔ اور کوشش کے باوجود بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔

یاسمین خرّم تم نے سوچا ہوگا کہ مجاہد کاظمی کی لیاقت کو اس کے بہترین پڑھائی کے کیریئر کو دُوسروں کی نظروں میں کم کرنے کے لیے تم ایک ہی حربہ استعمال کر سکتی ہو کہ اس کو اپنے خیالوں میں گُم کر دو، اور پھر وہ گُم ہو گیا۔ اس کا بہترین کیریئر گُم ہو گیا۔ وہ تمہاری آنکھوں کے سحر میں کھو گیا۔ تم اس کو لے کر خالی کلاس رُوم میں بیٹھی رہتیں۔ اور ہزاروں نظروں کے باوجود تم اس کو اپنی گاڑی میں لیے گھومتی رہتیں۔

ایک روز تم مجھے بھی اپنے ساتھ ایک پارٹی میں لے گئی تھیں۔ وہ فائنل ایئر کی الوداعی پارٹی تھی۔

کرسیوں، میزوں کو ترتیب سے رکھتے۔ اور گلدانوں میں پھول سجاتے تم نے سر کو اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سوُرج کی روشن کرنیں رَوِش کے دونوں طرف سفید گلاب کی جھاڑیوں

پر پڑ رہی تھیں۔ کالج کے وسیع لان شام کی خاموشی میں بڑے گھمبیر اور سنجیدہ لگ رہے تھے۔ رنگین آنچل، دمکتے چہرے، مترنم ہنسی۔ لڑکیاں اور لڑکے۔ تم نے تھک کر ایک کرسی کا سہارا لیا اور کھڑی ہو گئیں۔ "مس یاسمین"۔ مسٹر حمید جو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے، تمہارے پاس آکر تمہیں دیکھتے ہوئے تم سے مخاطب تھے۔ "یس سر"۔ تم نے خوشدلی سے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔

"مس یاسمین میں بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا، لیکن وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ خیر، میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجاہد کاظمی ہمارے کالج کا ایک بہترین طالب علم تھا۔ آپ کے ملنے سے پہلے اس سے مجھے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، لیکن اس نے ہمیں بے حد مایوس کیا ہے۔ اور اس کی ذمہ دار آپ ہیں"۔ مسٹر حمید نے اپنی عینک اُتار دی، اُس کو صاف کیا اور پھر آنکھوں پر لگا لیا۔ وہ بیحد پریشان تھے۔

تم ان کو دیکھتی رہی تھیں اور پھر تم نے انتہائی غصے سے کہا تھا "سر میں اتنا پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے"۔ تمہاری آواز کانپ رہی تھی، تم نے مجھے اور بھی اپنے نزدیک کر لیا تھا "مس خرم۔ مجاہد کاظمی میرا شاگرد ہے اور مجھے عزیز ہے"۔ مسٹر حمید اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مسٹر حمید، مجاہد کاظمی میرا دوست ہے اور مجھے عزیز ہے"۔ یہ کہہ کر تم تیزی سے دُور کھڑی لڑکیوں میں شامل ہو گئی تھیں۔ اور میں اکیلا غمزدہ ہو گیا تھا۔ "کتنا اچھا ہوتا جو یہ لڑکی ہمارے کالج میں نہ آتی"۔ مسٹر حمید نے زور سے زمین پہ ٹھوکا اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔

چائے کی کھنکتی پیالیاں۔ لڑکیوں کے جوان قہقہے اور رات کی خنکی کا جادو۔ یہ سب آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کالج کے سامنے کی سڑک سنسان تھی۔ بڑے بڑے درخت رات کی خوبصورتی سے مسحور چپ سادھے کھڑے تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشوں سے مڑ کر دیکھا، عمارت کی پیشانی پر بلب ٹمٹما رہا تھا۔ اور تم مسٹر حمید کو اکیلے کھڑے دیکھ کر مسکرا پڑی تھیں اور ان کے پاس اپنی گاڑی روکتے ہوئے تم نے کہا تھا۔

"آئیے سر۔ آپ کو گھر پہنچا دوں"۔ مسٹر حمید نے تمہیں دیکھا نفرت سے مُنہ سکیڑا اور بغیر جواب دیئے آگے چل پڑے۔

"بیچارہ پروفیسر بہت دُکھی جان پڑتا ہے، تم تیزی سے موٹر کو اس کے پاس سے لے گئیں، اور گرد کی ہلکی چادر میں مسٹر حمید کا وجود معدوم ہو گیا۔ تم نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

وائی۔کے، میں نے تمہیں پکارا، میں تم سے نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ شاید رات کا جادو مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ شاید میرا چھوٹا سا دل تمہاری قربت سے ہمیشہ کی طرح دھڑک رہا تھا۔ تم نے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وائی۔کے تم کس طرح جانتی تھیں کہ میں اس وقت یہی چاہتا تھا۔

"وائی۔کے کیا تم اتنے سارے لوگوں سے بیک وقت محبت کرتی ہو" میں نے تمھاری آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تمہارا چہرہ ایک دم تن گیا۔ اور تمہارے ہونٹ سختی سے بند ہو گئے "فرید سویٹ، ایک دن میں تمہیں بتاؤں گی۔ سب کچھ بتاؤں گی، ابھی تم بہت چھوٹے ہو، تم مجھے سمجھ نہیں سکو گے"

تم نہ جانے اس وقت ہی کیوں مجھے میرے چھوٹے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ جب میں سب وقتوں سے زیادہ تمہارے وجود اور اپنے دل کی موجودگی کا احساس کرنے لگا تھا۔ جب میں نے اپنے اندر ایک پورے مرد کو انگڑائی لے کر بیدار ہوتے دیکھا۔ لیکن یہ دس سال وائی۔کے تم میرے اس پورے چہرے پر ایک ننھا سا چہرہ سجا دیتیں اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ میں بہت چھوٹا ہوں اور تمہیں سمجھ نہیں سکتا تمہارے اسرار جان نہیں سکتا، یہاں تک کہ تمہیں حیدی، شیراز اور مجاہد کی طرح چاہ نہیں سکتا۔

سیاہ سڑکیں، خاموش درخت خاموشی سے گاڑی کے پیچھے کی طرف بھاگتے رہے، اور میں صرف اس بازو کی تپش میں تمہارے ساتھ لگا آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا تھا۔ اس سے زیادہ دُنیا حسین نہیں ہو سکتی تھی۔

"وائی۔کے تم کتنی اچھی ہو" میں نے تمہارے بیڈ روم کے پاس کھڑے ہو کر تمہیں کہا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں۔ میں بیحد خوش تھا، کیونکہ ساری راہ میں تمہارے اس قدر قریب رہا تھا۔

مَیں خوش ہی رہتا، لیکن اس روز مَیں بیحد رنجیدہ ہوگیا تھا، جب مما تمہارے کمرے میں کھڑی تم پر خفا ہو رہی تھیں اور تم بیحد لاپرواہی سے اپنے بالوں کو جھٹک کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس شام مَیں تمہارے لیے سویٹ پی کے پھولوں کا گلدستہ ہاتھوں میں پکڑے تمہیں اپنے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے بلانے آ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مما کی تیز آواز سنائی دی وہ کہہ رہی تھیں :

"یاسمین خرم تم، میرا شوہر اور تمہارے جیسی کمزور سی لڑکی کے دام کا اسیر ہو جائے۔ وہ ایسا نہیں ہے، لیکن تم اس قدر زہریلی ہو، اس بات کی مجھے خبر نہیں تھی" مما کی آواز میں نفرت تھی۔

اور تم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا" دیکھو فری آپا۔ مَیں حقیر اور کمزور سی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہوں" اور تم ہنستے ہی جا رہی تھیں۔ اس روز پہلی بار تم مجھے بُری لگی تھیں کیونکہ تم میری مما کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ مَیں نے اپنے ہاتھ میں لائے ہوئے پھولوں کو برآمدے کی منڈیر پر رکھ دیا اور تیز تیز چلتا باہر آ گیا، ایک اور صدمہ ایک اور دھچکا۔ اس وقت مَیں نے تمہیں بُرا سمجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ تم میری مما کے سامنے گستاخی سے بول رہی تھیں اور تمہاری آواز میں طنز اور اپنی جیت کا نشہ تھا۔ تم نے میری مما کا غرور بھی توڑ دیا تھا۔

یاسمین خُرم تم اصل میں مجھے تم سے نفرت کرنی چاہیے تھی، مجھے تمہارے خیال تک کو دل سے نکال دینا چاہیے تھا کیونکہ تم محبت کرنے کے قابل ہی کب تھیں، لیکن مَیں بقول تمہارے چھوٹا سا ہی تو تھا، اور زندگی کے نشیب و فراز اور دُکھ دَرد کے اصل مفہوم سے آگاہ نہیں تھا۔ مما نے سوچا ہوگا تم کس طرح ان کے شاندار سراپے کو گہنا سکتی ہو۔ مما کے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری طرف کیونکر توجہ دے سکتا ہے۔ لیکن اس وقت تم ان کی خود پسندی اور غرور پہ تازیانہ بنی ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ تم ان کو روند رہی تھیں، مما کو تو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ مَیں جو محض اُن کا ننھا ہوں جیدی اور شیراز بھیا۔ سب تمہارے خیالات اور تصور کے تانوں بانوں میں جکڑے، تمہارے گرد پھڑپھڑا رہے ہیں۔ مما بیچاری۔

اور جب مَیں نے سُنا کہ تم ہوسٹل جا رہی ہو، تو مجھے مما کی بے عزتی۔ انکی روتی آنکھیں اور

دُکھ۔ سب چیزیں اور باتیں بھول گئیں۔ اور میں نئے خوف میں جکڑا تمہارے کمرے کے باہر اندھیرے میں کھڑا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنی ساری خوبصورت چیزیں تمہیں دے کر جانے سے روک لوں۔ انگریز ایکٹرسوں کی نیم عُریاں تصویریں، کومکس، بیٹ اور گیند اور کہانیوں کی خوبصورت کتابیں .... پھر نہ جانے کس وقت آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے اور برآمدے کے کناروں سے بوندیں ٹپکنے لگیں، جیسے جلترنگ کا ایک سُر کبھی کبھار بج اُٹھتا ہو۔ اور میں اندھیرے اور بارش کی آواز سے خوفزدہ ہونے کے باوجود وہاں کھڑا رہا تھا۔ مجھے تمہارے چلے جانے کا غم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ہر روز کس کے لیے پھول لے کر جایا کروں گا۔ کون میرے وجود کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لگایا کرے گا۔ تم ایک شہزادی تھیں جسکو حالات کا جن اپنے قابو میں کر کے اپنے محل کی طرف اُڑنے والا تھا۔ وائی۔ کے۔ کیا میں کبھی تمہیں رہائی دلانے والا شہزادہ بھی تھا پھر نہ جانے کس طرح ہمت کر کے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیونکہ اپنے دُکھ کی چبھن مجھ سے اور زیادہ برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تمہارے ساتھ لگ کر زور زور سے رونا چاہتا تھا۔ تمہارے دروازہ کھولنے پر تم مجھے نیند بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی تھیں اور میں اندر آکر تمہارے ہاتھوں کو چُومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"وائی۔ کے، مت جاؤ، مت جاؤ۔ میری ساری چیزیں لے لو، میرے کومکس، میری اَلبم، اور میرے جمع کیے ہوتے پیسے۔" تم نیند بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور مُسکرا رہی تھیں۔ پھر میرا دل چاہا کہ میں تمہارا چہرہ اپنے نزدیک کر لوں اور تمہاری بھوری بھوری آنکھوں کو دیکھتا رہوں، لیکن اس وقت مجھے یہ خیال اچانک ہی آگیا کہ میں تم سے دس سال چھوٹا ہوں۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ اس بات کو نہ مانوں۔ تم نے دروازہ بند کر لیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لیے چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئیں اور میں سحرزدہ تمہیں دیکھنے لگا تھا۔

"فریدہ ڈیئر، میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" تم نے آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کی، تمہارے وجود کی گرمی میرے دل کو تیز کر رہی تھی۔

"نہیں وائی۔ کے تم مجھے یاد نہیں کرو گی، کیونکہ میں تم سے دس سال چھوٹا ہوں، تم مجھے یاد نہیں رکھو گی کیونکہ میں جیدی اور شیراز بھیا کی طرح نہیں ہوں۔ میں تو صرف میں ہوں۔

جو کبھی بھی رات کے وقت تمہارے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں اکیلا نہیں گیا۔ تم مجھ سے کیونکر محبّت کر سکتی ہو"۔ زمانوں کے چھپائے راز میری زبان پر آ گئے تھے، تم اچھل کر کھڑی ہو گئیں اور حیرانی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

"تم شریر لڑکے۔ تم میری جاسُوسی کرتے رہتے تھے"۔ تم نے غصّے سے کہا، لیکن پھر تم مُسکرا رہی تھیں۔

اور مَیں ڈر گیا کہ شاید اسی وقت تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ اور مجھے کمرے سے نکال دو یا پھر ہوسٹل چلی جاؤ۔ تمہارے چلے جانے کا خیال مجھے بے جان کر گیا"۔ لیکن وائی۔ کے میں نے آج تک کسی کو بھی نہیں بتایا تھا، مماّ تک کو بھی نہیں"۔ مَیں نے مِنّت بھرے لہجے میں کہا، تم آہستہ آہستہ مجھ تک آ گئی تھیں اور تم نے میرے چہرے پر جُھکتے ہوئے کہا تھا۔

" فرید دیکھو اگر تم نے کِسی سے ان باتوں کا ذکر کیا، تو میں تم سے کبھی بھی نہیں بولوں گی"۔ میری زندگی کا خوبصُورت لمحہ تمہارے ہونٹوں پر لرز رہا تھا۔ اور مَیں منتظر تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور تمہارے سانس کی تپش میرے چہرے پر پڑتی رہی تھی۔ اور مَیں نے تمہارے دونوں بازو پکڑ کر اپنے گرد لپیٹ لیے تھے، اور تمہارے گاؤن سے آتی کسی خُوشبو کو سونگھتا روتا رہا تھا، اَن دیکھا دُکھ میرے وجود میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

وائی۔ کے، مَیں تم سے دس سال چھوٹا تھا، اور آج بھی دس سال چھوٹا ہی ہوں، لیکن اس رات کا خوف اور دُکھ آج تک میرے اندر رُکا ہوا ہے اور مَیں اس سے نجات حاصل نہیں کر سکا، تمہارے چلے جانے کا دُکھ، تمہیں نہ دیکھنے کا دُکھ، یا شاید وہ آنے والے سالوں کے دُکھوں کا پَرتو تھا۔ نہ جانے میرا دل اِن سارے جذبوں سے کیونکر آگاہ ہو گیا تھا یقیناً یہ تم ہی تھیں۔

اور پھر تم ہوسٹل چلی گئیں، اور مماّ نے تمہارے کمرے میں پڑی ہوئی کتنی چیزوں کو زمین پر پٹختے ہوئے انتہائی غصّے اور نفرت سے کہا تھا۔

وہ حقیر سے وجود والی لڑکی، وہ حقیر سی لڑکی"۔ مما بھلا تمہارے جادُو کو کیونکر جان سکتی تھیں، اُنھوں نے اس گلدان کو بھی توڑ دیا تھا جس میں تمہارے لیے پھول سجایا کرتا تھا۔ اُنھوں نے

ان کاغذوں کو پُرزے پُرزے کر دیا تھا، جو تمہاری پڑھائی کی میز پر پڑے تھے۔ اور اُنہی کاغذوں کے نیچے سے تمہارے کلاس فیلو صغیر کی تصویر پڑی تھی، جس کی پُشت پر تمہارا نام لکھا ہوا تھا، جو اس نے نہ جانے محبّت کے کس جذبے کے تحت تمھیں دی ہوگی۔ یقیناً صغیر نے تصویر دیتے وقت سوچا ہوگا کہ تم اسے بہت حفاظت سے رکھوگی، لیکن وہ ردّی کاغذوں کے بوجھ تلے دَبی کیا خبر کب سے پڑی ہوئی تھی۔ مَیں نے اس تصویر کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور باہر نکل آیا۔ تمہارے کمرے کے سامنے کا لان بیحد اُداس تھا۔ مَیں نے سویٹ پی کے پودوں سے ایک ایک کر سارے پھُول نوچ ڈالے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مَیں سب چیزوں کو توڑ ڈالوں جھنڈ میں کوئل کوک رہی تھی۔ مَیں نے زور سے ایک پتھّر اُٹھا کر کنج میں مارا۔ اور زمین پر ٹھوکریں مارتا ہوا گیٹ کی طرف چل پڑا۔ مجھے لگا جیسے تم زور زور سے ہنس رہی ہو۔ ہم سب کا تمسخر اُڑا رہی ہو۔ مَیں دوڑتا دوڑتا بہت نکل آیا تھا۔

لیکن میرے دل میں تمہاری گونج تھی۔ وائی۔ کے تمہاری دُوری کا دُکھ آج بھی کم نہیں ہوا۔ اور اس وقت مَیں تنہا یادوں کے خارزاروں سے گزر رہا ہوں۔ میرا دل آج تمھیں دیکھ کر پھر مجروح ہو رہا ہے۔ وائی۔ کے کیا یہ تم ہو۔ وائی۔ کے لیکن مَیں جانتا ہوں میرے آنسو تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

ہوسٹل کے وسیع لان شام کی سُرمئی فضا میں چھُپ تھے، اور گھاس کا سبزہ سویا ہوا لگ رہا تھا، مَیں نے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے پیچھے دیکھا۔ دُور سڑک پر گاڑیاں بھاگی جا رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر چند بچّے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ میرا دل قدم قدم پر اُچھل رہا تھا۔ معلوم ہے وائی۔ کے مَیں کتنے دنوں سے تمہارے ہوسٹل جانے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ مَیں نے اپنا جیب خرچ سنبھال کر رکھا تھا، تاکہ مَیں تمہیں کوک پلا سکوں... آئس کریم کھلا سکوں اور تمہارے ساتھ کسی پکچر ہاؤس کے اندھیرے میں بیٹھ کر تمہارا ہاتھ پکڑ سکوں۔ مَیں جانتا تھا کہ جیدی اور شیراز بھیّا تمہیں ملنے جاتے تھے، کیونکہ تمہارے ہوسٹل میں کسی کا بھی کسی کو ملنے آنا منع نہیں تھا۔ وہ انتہائی ماڈرن ہوسٹل تھا، جہاں لڑکیاں اپنی ذمّہ دار خود تھیں۔ وہاں ہوسٹل کے بڑے گیٹ کے باہر

سڑک کے کنارے گاڑیوں میں بیٹھیں وہ کوک پیتی اور ہلکے ہلکے قہقہے لگاتی تھیں۔ مَیں نے اپنا دُرد اکیلے ہی برداشت کیا تھا۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جو میرے دُرد کو جان سکتا اور مجھ سے ہمدردی کر سکتا۔ مَیں شدت سے اپنے بڑے ہونے کا انتظار کرتا، تاکہ جیدی اور شیراز بھیّا کی طرح تمہاری نظروں میں آسکوں، لیکن وائی۔ کے حالات کے بہاؤ پر کس کا بس ہے، کیونکہ جب مَیں بڑا ہوا تو تم یہاں سے دُور جا چکی تھیں اور تمہارے وجود کی سنگین تصویر مضبوط کیلوں سے میرے ذہن کی سفید دیوار پر آویزاں تھی اور یہی میری متاع رہ گئی تھی۔

اس روز مَیں کتنے دنوں بعد تمہارے ہوسٹل گیا تھا۔ مَیں تمہیں دیکھنے، تم سے باتیں کرنے کی شدید خواہش کو دبا نہیں سکا تھا اور جب اس سہانی دوپہر میں ہوسٹل کے برآمدے میں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا تھا، تو تم جیدی بھیّا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستی ہوئی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور مَیں ایک سُتون کی اُوٹ میں چُھپ گیا تھا، وزیٹنگ روم کا دروازہ تمہارے بعد ایک لحظہ کو ہلتا رہا اور پھر ساکن ہو گیا، میرے تیز تیز دُھڑکتے دل کی طرح۔ مجھے نہیں معلوم کہ مَیں واپس کس طرح آیا تھا۔

وائی۔ کے اب مَیں سوچتا ہوں۔ مَیں معصوم ہوتے ہوئے بھی معصوم نہیں رہا تھا۔ اس لیے کہ تم دُوسروں کی سب سے اچھی چیزیں چھین لینے کی عادی تھیں۔ اگر تم یُوں اپنے بازو میرے گرد وقت بے وقت نہ ڈالا کرتیں، تو مَیں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی راحتوں سے محبت کرتا۔ کامران کی طرح بُدھو بنکر ہنس سکتا۔ اور اتنی شدت سے اپنے بڑے ہونے کا انتظار نہ کرتا۔

مَیں نے اس رات پہلی بار جانا تھا کہ تم تک پہنچنا اور تم کو پانا دونوں ہی ناممکن باتیں تھیں۔ میری اور تمہاری راہ ایک تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل میں مجھے بڑی بڑی باتیں سوچنے کی عادت جو پڑ گئی تھی۔ اپنے گیٹ کے اندر داخل ہو کر مَیں نے اپنے اِرد گرد دیکھنے کی کوشش کی، لیکن گھر کے سناٹے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ویرانی، ویرانی کا لامتناہی اِحساس۔ میرے مُنہ میں خشکی تھی اور گرد کا مزہ تھا، اور مَیں انتہائی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

مَیں ڈیڈی کے کمرے میں چلا گیا اور زندگی میں پہلی بار شراب کی بوتل کو ہاتھ لگایا تھا۔ اور جب اس تلخ سیال مادے کے گھونٹ میرے اندر گئے تو مجھے لگا جیسے مَیں آگ

کے اُلاؤ میں جل رہا ہوں، چیخ رہا ہوں، مر رہا ہوں، مَیں مر رہا تھا۔ دُکھ اور خوف سے میری چیخیں نکل گئیں اور مَیں اونچی آواز میں شاید رونے لگا تھا، کیونکہ میری آواز سُنکر میرا نوکر دوڑا آیا، اس نے حیران ہو کر خالی گلاس اور بوتل کو دیکھا۔

"چھوٹے صاحب پہلے پہل اس طرح نہیں پیا کرتے۔ تھوڑی شراب اور زیادہ سوڈا ڈالا کرتے ہیں اور پھر بہت آہستہ آہستہ پیتے ہیں" اس نے دُوسرے گلاس میں سوڈا اور شراب ڈالا اور آہستہ آہستہ گھونٹ پینے لگا۔ مَیں نے اس کے گلے میں اپنے بازو ڈال دیئے اور رونے لگا۔ مجھے اُلکائیاں آرہی تھیں۔ اور مَیں نے سوچا۔ مَیں مر رہا ہوں۔ اچھا ہے۔ اچھا ہی تو ہے۔ یہ میرا اندر اُٹھتا دَرد بڑا جانگسل ہے..... دردناک عذاب۔

مَیں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنے سارے روپے اس کو دے ڈالے، "یہ لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیں، لے جاؤ" مَیں چلایا۔ وہ کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اور پھر وہ مجھے غسل خانے میں لے گیا۔

"چھوٹے صاحب آپ اپنے حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کر دیں، نہیں تو آپ کی طبیعت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ پہلی بار ایسے ہی ہوتا ہے" وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔

قے کے بعد میرا سارا وجود خالی خالی اور اُجاڑ سا ہو گیا۔ جیسے دُنیا کوئی ویرانہ ہو اور مَیں اکیلا چیخیں مارتا پھر رہا ہوں۔ دائی۔ کے اتنے سالوں بعد بھی مَیں اکیلا ہی چیخ رہا ہوں۔

مَیں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ہے۔ مَیں پورا مرد ہوں۔ میرا چہرہ، لیکن ان تمام باتوں سے اب کیا فائدہ۔ مَیں تمھیں پکڑ نہیں سکتا۔ مَیں نے تمہاری یادوں اور نام سے وابستہ سارے آنسو بہا دیئے ہیں۔ اس وقت تو مَیں کلب جاؤں گا اور پھر ٹوئسٹ کے تیز دائروں میں گھومتے ہوئے اپنی ساتھی لڑکی کے بالوں کی خوشبو سونگھنے کی کوشش کروں گا، لیکن مَیں چاہنے کے باوجود باہر نہیں جا رہا۔ میرا جسم سراپا کان بنکر تمہاری آواز سُننے کی کوشش کر رہا ہے لان میں ٹڈے چرچرا رہے ہیں۔ اور گھنی باڑ میں اِکّا دُکّا جگنو چمک رہے ہیں۔ اور آسمان پر جگنوؤں کی بارات ہے۔ اور مَیں آج بھی برسوں پہلے کے دُکھ کو اپنے اندر جاگتے محسوس کر رہا ہوں حالانکہ پچھلے ماہ ہی تو ایبٹ آباد میں مَیں تمہیں ملا تھا۔ عرصے کے بعد۔

میں چھٹیاں گذارنے سہیلہ باجی کے گھر آیا ہوا تھا۔ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا اکیلی سڑکوں پر گھومتا میں خوش تھا، کیونکہ تمہارا خیال میرے لاشعور میں چلا گیا تھا۔ آخر کو وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ میں نے بھی خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ تم گیٹ کے سامنے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے کھڑی تھیں۔ سامنے پہاڑی کی اوٹ میں بادل جمع ہو رہے تھے اور دور تک سڑک کے دوسری طرف مکی کے کھیتوں کی پیلی ہریاول تھی۔ اندر تمہارے لان میں سیب۔ انار اور ناشپاتی کے درختوں پر پھول کھل رہے تھے۔

"ارے فرید" تم نے مسرت بھری چیخ ماری تھی۔ اور جب مڑ کر دیکھا تو میرا دل ایکدم ساکت سا ہو گیا تھا۔ وائی۔ کے میں زیرلب بولا، اور جب میں باڑہ کے جنگلے کے ساتھ گھوڑے کی باگ کو باندھ کر تمہاری طرف بڑھا تو مجھے لگا جیسے وقت وہیں کھڑا ہے جہاں آج سے برسوں پہلے تھا۔ اور میں آج بھی تم سے دس سال چھوٹا ہوں۔

"کب سے یہاں ہو؟" تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنائیت سے دبایا اور میرا دل چاہا کہ میں آگے بڑھ کر تمہیں اپنے بازوؤں میں اٹھا لوں، اور بھاگتا ہوا چلا جاؤں۔ بھاگتا ہی جاؤں۔

میں نے تمہاری بات کا جواب دینا چاہا لیکن میں سر جھکائے تمہارے ساتھ چلتا تمہارے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ تم نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی تھیں اور مجھے لگا میں وقت کو پھلانگ کر پیچھے کو دوڑ رہا ہوں۔" ارے فیدی، تم اب تک ویسے ہی ہو؟" تم نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا، اور مجھے لگا جیسے میرا وجود معدوم ہوتا جا رہا ہو، لیکن میں نے اپنے جذبات کو سختی سے اپنے اندر روکا۔

مجھے بولنا چاہیے۔ میں نے مسکرا کر تمہاری طرف دیکھا، میں بڑا ہو گیا تھا اور پھر میں جذباتی شدت پر قابو پانا سیکھ چکا تھا۔ کوئی کب تک سبق نہ سیکھے گا۔

لان کے ننھے سے فوارے سے پانی کے قطرے سورج کی روشنی میں موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور ایک خوبصورت سیاہ چڑیا، سیب کے شگوفوں کو اپنی چونچ سے نوچ رہی تھی۔

تم نے میرے گھر والوں کا حال پوچھا تھا۔ جیدی بھیا کی شادی کا، شیراز بھیا کی کامیابی کا،

مما اور ڈیڈی کے بارے میں بھی تم بڑے پیار سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور پھر تم اپنی شادی کا البم لے آئیں۔ بہت سے لوگوں کے درمیان کھڑی تم اپنے سفید لباس میں ایک پری لگ رہی تھیں اور تمہاری شادی کا بہت بڑا کیک سب کے درمیان پڑا تھا۔ تمہارا دولہا۔ ہاں میں جانتا تھا، تم نے ایک اُردنی ایمبیڈر سے شادی کی تھی، تمھاری شادی بہت دنوں تک ہمارے گھر میں گفتگو کا موضوع بنی رہی تھی۔

اب میں جانتا ہوں کہ تم سب کو چونکانے میں لذت لیتی تھیں۔ ہمیں تمہاری ایک نزدیکی کزن نے بتایا تھا کہ تم اس کو ایک پارٹی میں ملی تھیں اور اس پارٹی کی میزبان بھی تم ہی تھیں۔ کیونکہ اپنے گھر میں تم اکیلی ہی تو رہ گئی تھیں اور پھر اگلے روز اسی ایمبیڈر نے شادی کی پیشکش کی تھی، ان دنوں یہ بات کتنی افسانوی لگتی تھی۔ الف لیلوی قصّے کہانیوں جیسی۔

تمہاری شادی کا سُن کر میں ہمیشہ کی طرح غمگین ہو گیا، اور ساری رات میں نے ایک کلب میں گذار دی تھی۔ چیختے چلاتے رنگوں والی دیواروں کے اندر سے روشنی کی گہری دُھندلی شعاعیں نکل رہی تھیں اور میں والہانہ انداز میں ڈانس کرتا رہا تھا۔ پردوں کے پیچھے سے، کونوں کے اندھیروں سے سُرکی لہریں بڑھ کر ہمارے سب طرف گھیرا ڈال رہی تھیں، اپنے لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر میں نے کئی ساتھی بدلے اور پھر نڈھال ہو کر صوفے پر گر گیا تھا۔ میں نے رنگین تصویروں کے اندر جھانکتے تمہارے چہرے میں کوئی تبدیلی ڈھونڈنی چاہی لیکن وہ ویسا ہی تھا۔ ویسا ہی جب تم کو میں نے ہوسٹل کے بڑے گیٹ سے اندر آتے وقت دیکھا تھا، میرے دل کا دَرد بھی وہیں تھا۔

”وائی۔ کے کیا تم واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہو یا ہمیشہ کی طرح اس کا پندار تمہارے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا“، میں نے سیدھا تمہاری آنکھوں میں دیکھا۔ میں خوش ہو رہا تھا، کیونکہ میں نے تمہیں تمہارے سامنے عُریاں کر دیا تھا۔

تم میری بات سُن کر بے تحاشہ ہنسنے لگی تھیں اور تم نے تصویروں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تھا:

”شریر لڑکے۔ تم بہت باتیں بنانے لگے ہو“، تم نے آہستہ سے میرے سر پر ایک چپت

لگائی تھی اور پھر تمہارے چہرے کی ساری رونق بجھ سی گئی۔ تم میری طرف دیکھ رہی تھیں، لیکن تمہارا سنجیدہ چہرا تمہارا اپنا نہیں لگ رہا تھا۔

"فریدہ ایک روز میں نے کہا کہ میں تمھیں بتاؤں گی، شاید وہ وقت آگیا ہے۔ اب تم میری بات سمجھ سکو گے۔ مجھے کئی بار خود احساس ہوتا تھا کہ میں دوسروں کے جذبات سے کھیل کر ان کو رنجیدہ کر کے عجیب خوشی محسوس کرتی ہوں۔ شاید اس لیے کہ بہت عرصہ بہت سے لوگوں نے میرے کمزور سے وجود کو نظر انداز کیے رکھا تھا، میری اپنی بہنوں نے۔ مردوں نے جو ہمارے گھر آتے تھے۔ اور پھر مجھ میں ایک زہر بھر گیا۔ میرے اس انتقامی جذبے کا شکار سب سے پہلے میری اپنی بہن ہوئی، کیونکہ اس نے ہمیشہ مجھے میرے کمزور وجود کا طعنہ دیا تھا۔ وہ میرا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ اور پھر میں نے اس حقیر سے وجود کے ساتھ اُسے شکست دی تھی، اور اس کے شوہر کو پوری قوت کو سے اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اور دل بھر کر ہنسی تھی، مجھے اپنے آپ کو منوانے کا طریقہ آگیا تھا۔ اور اپنی برتری کی لذّت نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ اور شادی میں بھی میں نے اپنی ذات کا چونکا دینے والا ثبوت دیا تھا۔ میں صرف خواب نہیں دیکھتی ان کی تعبیر کو پورا کرنا جانتی ہوں لیکن پیارے لڑکے میں نے تمہیں تو کبھی اپنے انتقام کا نشانہ نہیں بنایا۔ تم کیوں رنجیدہ لگ رہے ہو" لیکن میں جانتا تھا تم سب کچھ جانتی ہو جو میرے اندر ہے۔ تم چمکتی آنکھوں اور جذبات سے سُرخ چہرے کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ تم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور میں نے اس کو پکڑ کر آہستہ سے چوما تھا اور چھوڑ دیا تھا، اس سے زیادہ اور میں کیا کر سکتا تھا

"وائی۔ کے کیا تمہیں پرانی چاہتیں یاد نہیں آتیں۔ کیا وہ سب لوگ اور ان کے جذبات محض کھلونے تھے جن سے تم کھیلتی رہی تھیں" میں نے تم سے پوچھا تھا۔

"تم بہت زیادہ سوچتے ہو فریدہ۔ اتنا نہیں سوچا کرتے" تم پھر مسکرا رہی تھیں۔

"اچھا۔ وائی۔ کے میں سوچنا چھوڑ دوں گا۔ تمہارے متعلق بھی میں تمہارا شکر گذار ہوں وائی۔ کے۔ ہاں تم ایسی فاتح تھیں جو اُجاڑوں کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتے" تم نے میری پاس کھڑے ہو کر ہمیشہ کی طرح اپنا بازو میرے گرد ڈال دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں بہت فاصلے پر کھڑے تھے۔ یہ فاصلے نہ جانے عمر کے تھے یا جذبات کے۔

"سویٹ بے بی" تم نے حسبِ عادت میری گال پر ہلکے سے چپت لگائی اور میں ہنسنے لگا تھا۔ لیکن میری ہنسی کی آواز میرے اندر اس طرح گونج رہی ہے، جیسے بیکراں سناٹوں میں کسی بھٹکی ہوئی رُوح کی چیخ۔

میں یادوں کے اندھیروں میں گم ہزار راہوں کے باوجود کسی راہ پر بھی چلنا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر تم کبھی کبھار زیادہ ہی یاد آؤ، تو ڈیڈی کے کمرے سے تھوڑی سی شراب لے کر پینے لگتا ہوں۔ یا کسی کلب میں جا کر ناچ کے تیز تیز چکروں میں خود کو بھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔

وائی۔ کے تمہاری ایک بڑی سی تصویر میرے بکس میں سب سے نیچے پڑی ہے اور جب کبھی میں اسے نکال کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔

نہ جانے تمہاری فتح کی داستان کب شروع ہوئی تھی اور کب ختم ہو گی، لیکن ہو سکتا ہے زندگی کے کسی کنارے پر جب تم زندگی کی مٹھاس سے اُوبھ جاؤ، تو میں تمہیں یاد آؤں۔ میں جو تم سے دس سال چھوٹا ہوں۔

وُہ

مَیں اور آفاقی بحث کر رہے تھے۔ محبّت پر بحث۔ اِس جذبے کی سچائی پر بحث۔ اس کی ضرورت پر بحث۔

"مرد محبّت کرنی چاہتا ہے، لیکن اس لیے ایک مشترکہ اساس کی ضرورت ہے۔" مَیں نے آفاقی سے بڑی قطعیت سے کہا۔

"کیا عورت اور مرد ہونا مشترکہ اساس نہیں۔" آفاقی مُسکرایا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔" مَیں سوچتے ہوئے بولا۔

"تمہاری باتوں میں تضاد ہے۔" آفاقی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"مَیں اس سے محبت کرتا ہوں، لیکن ویسی محبّت نہیں جیسی کہ تم سمجھتے ہو۔" مَیں گذری یادوں میں کھو رہا تھا۔

"مَیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔" آفاقی کو میری بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ مَیں نے کیفے کی دُھواں دھار فضا میں اپنے مُنہ میں بھرا ہوا دُھواں اس کے مُنہ پر بکھیرتے ہوئے سرگوشی سے کہا۔ "ویسے اس کو پوری طرح سمجھنا۔ اس کی ذات کے عذاب کو جاننا۔ جس پر اس نے اپنے آپ کو لٹکا رکھا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی فتح ہے۔"

"تم اپنے اندر سے اُلجھ گئے ہو۔" آفاقی کی مسکراہٹ ویسی ہی شریر تھی۔ اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی ٹھنڈی چائے کی پیالی کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اور اس آئینہ خانہ کا دروازہ جھولتا ہوا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس آئینہ خانہ میں ہم سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ اپنے ہی تصوّرات میں غلطاں۔ اپنے ہی گرد گھومتے ہوئے۔ سحر زدہ اور درماندہ، اپنی شکستوں کو چھپاتے ہوئے اپنے عذابوں کو سہارتے ہوئے۔

اس روز بھی ایک ادبی میٹنگ تھی اور غزالہ رشید نے اپنا ایک تنقیدی مضمون پڑھا تھا۔ سگریٹوں کے دھوئیں سے بوجھل فضا میں اس کی آواز ہماری سوچوں اور ذہن کو اور بھی بوجھل بنا رہی تھی۔ ایک جوان عورت کی موجودگی ہمیں غیر مطمئن طور سے اطمینان دے رہی تھی۔ زیادہ تر لوگ لمبی بحث کے بعد چلے گئے تھے۔ لیکن میں آفاقی اور غزالہ رشید وہاں بیٹھے کمرے کی کھڑکیوں کے باہر رات کو اُترتا ہوا دیکھتے رہے۔ اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا جلتا ہوا سگریٹ لے کر ایک لمبا کش لگایا اور اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا۔ میں اس کی بے باکی پر حیران تھا۔ اس کا چہرہ غیر جذباتی طور پر ساکت تھا۔ مجھے لگا جیسے اسے کسی سنگ تراش نے بڑی محنت سے خوبصورت بنایا ہو، لیکن اس میں بھرپور نسوانی کشش ڈالنی بھول گیا ہو۔

تم خوب لکھتے ہو۔ تمہاری ایک غزل شاید میں نے کسی رسالے میں پڑھی تھی۔ اور پھر اس نے وہ ساری غزل مجھے سُنا دی۔ رات سامنے کے گھنے درخت کو اپنی چُنری میں چھپائے مجھے بڑی پیاری لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی۔ پھر باقی لوگ بھی چلے گئے۔ میں اور آفاقی اُٹھ کر اس کے ساتھ باہر آ گئے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ٹریفک کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ اور جنوری کی تخ ہوا خالی سڑکوں پر رینگتی کھوکھوں کے تختوں تلے اور دُکانوں کے تھڑوں سے لپٹ لپٹ کر بہت تنہا اور اُداس لگ رہی تھی۔ غزالہ رشید کی طرح۔

"آپ کہاں جائیں گی؟" میں نے ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ میرا ہوٹل تو دُور ہے۔" اس نے سگریٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے کو پاؤں تلے مسلتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

ہم تینوں چلتے جا رہے تھے۔

"کہاں ہے آپ کا ہوٹل۔ ہم آپ کو وہاں تک چھوڑ آئیں۔" سردی میرے جسم کو چیرتی ہوئی گذر رہی تھی۔

"چلیے میں آپ کے ساتھ چلوں" اس نے بالکل عام انداز میں کہا۔ آفاقی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر کی طرف جانیوالے راستے پر مڑ گیا۔

عزالہ رشید اور میں ..... رات اور تنہائی ..... کیا ایسا ممکن ہے۔ میں عجیب سوچوں میں اُلجھ رہا تھا۔ ہمارے گرد رات کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا دل ایک دم جاگ کر تیز تیز دھڑک رہا ہو، لیکن اس کا چہرہ تو اتنا غیر جذباتی تھا۔ پھر ..... پھر ..... کتنی عجیب لڑکی ہے۔

"شاید آپ نہیں جانتیں کہ میں اکیلا رہتا ہوں" میں بولا۔

"لڑکے پاگل مت بنو۔ مجھے تم پر اور اپنے پر بھروسہ ہے"

اس نے سارا دُھواں میرے مُنہ پر چھوڑتے ہوتے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے رہتے ہو۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا"

لیکن مجھے لگا جیسے ہوا نرم پَروں سے میرے چاروں طرف رقص کرنے لگ گئی ہو۔ اور آسمان کی سیاہ نیلاہٹ میں رنگ گھُل رہے ہوں ..... میرے گال دہکنے لگے۔ کیا یہ فرق ڈالنے والی بات نہ تھی۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر اپنے جوتے اُتارے اور بستر پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

اچھا تو پیارے لڑکے تم آج کی رات زمین پر سونے سے بُرا تو نہیں مناؤ گے۔ مجھے زمین پر سونا اچھا نہیں لگتا۔ اس نے نیا سگریٹ مُنہ میں دبالیا۔ میں نے اپنے اندر مایوسی کی سرد لہر کو اپنے سارے وجود کے اندر سنسناکر اُٹھتے محسوس کیا تھا۔ میں نے لائٹر سے اس کا سگریٹ سُلگایا اور جلدی سے باہر آگیا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی محض فریب، لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹے میرے تنگ کمرے میں چکر لگانے لگے۔ چاند ایک تنہا بادل کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اور ہوا تھم گئی تھی۔

صبح عزالہ رشید میرے جاگنے سے پہلے ہی جا چکی تھی۔

مجھ پر ایک نامعلوم سی اُداسی طاری تھی۔ اور شرمندگی بھی۔ اپنے نظر انداز کیے جانے پر،

غزالہ رشید اور اکیلا کمرہ ..... اور میں ہولے سے ہنس دیا۔ اور اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

"ہوں" آفاقی اندر آ کر ذومعنی انداز میں مُسکرایا۔ میں آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ آفاقی مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا آخر" آفاقی کے لہجے میں تشویش تھی۔ "کچھ بھی نہیں یار"

میں نے اُٹھ کر سگریٹ کو زور سے پاؤں تلے مَسلتے ہوئے کہا۔

"بڑی پارسا بنتی ہے ـــــ بدصُورت عورت"

آفاقی ایک ساعت کو رکا اور پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"بے چارہ ٹھکرایا ہوا نوجوان" وہ ہنستا جا رہا تھا۔

"بکواس بند کرو۔ سوچو تو وہ اکیلی میرے کمرے میں تھی۔ مجھے اپنے آپ پر بے حد غصّہ آ رہا ہے"

میں نے سگریٹ کو دو ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ جیسے وہ غزالہ رشید ہو۔

"آؤ باہر چلیں" آفاقی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"عجیب لڑکی ہے یہ غزالہ رشید بھی"

"محض بناوٹ" میں غصّے سے بولا۔

"ہم مرد ذرا ذرا سی بات کے بڑے بڑے مطلب بھی تو نکالنے لگتے ہیں"

"اسلیے کہ ہم اپنے عشق میں خود مبتلا ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں یہ پوری کائنات صرف ہمارے تصرّف کے لیے بنی ہو۔ عورت کے معاملے میں تو ہم ذرا زیادہ ہی خود پرست ہیں"

"پھر وہ میرے کمرے میں اکیلی کیوں آئی تھی" میں نفرت سے بولا۔

"تمہاری خود پرستی کے خول کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے اور اب تم اس خول کے ٹوٹ جانے پر تلملا رہے ہو" آفاقی بھی تیزی سے بولا۔

"بدصُورت عورت" میں اپنے اندر اس احساس کو اُٹھتے محسوس کر کے بولا جو مجھے میری اپنی ننگی کا احساس دلا رہی تھی۔

آفاقی ایک بار پھر زور سے ہنسنے لگا.....

چند دنوں بعد فلمی کہانی کے سلسلے میں جب میں راحت خاں کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو غزالہ رشید سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"کیسے ہو سویٹ بوائے۔ بہت دنوں سے نظر نہیں آئے۔ چلو اچھا ہوا۔ آج تم مجھے مل گئے۔ میں ابھی ابھی تمہاری غزل پڑھ رہی تھی۔ اور تم مجھے یاد آ رہے تھے۔ تم اپنی طرح کی ہی خوبصورت غزلیں لکھ رہے ہو۔ ایک روز تم ملک کے نامور شاعر بنو گے۔ لوگوں سے مت ڈرنا اور نہ ہی ان سے مرعوب ہونا۔ وقت ساعتوں کے بڑھاپے پر استوار ہے۔ لیکن فن وقت سے بھی عظیم تر ہے۔ اپنے آپ کو پہچانو۔ اسی میں تمہاری بقا ہے۔ خوبصورت لوگ اور خوب صورت شعر مجھے بے حد پسند ہیں۔ جیسے تم" اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ جو باتوں کی تیزی کے باوجود غیر جذباتی لگ رہا تھا۔ ایک دم زندہ ہو گیا جیسے نیند سے بیدار ہوا اٹھا ہو۔ وہ اپنی عمر سے کہیں کم دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں احساس ہو رہا تھا کہ وہ بولنا چاہتی ہے۔ اپنے اندر کی تنہائی سے خائف اور اپنے سے خوفزدہ۔ شاید وہ... اکیلی بھٹک رہی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر، اور میں پچھلے دنوں اس کو دل ہی دل میں گندی گالیاں دیتا رہا تھا۔ ایک دم اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا۔ میں نے اس کی ہنستی آنکھوں میں جھانکا تو ایک لمحے کے لیے میں نے اس سیاہ سائے کو دیکھا جو صرف اکیلے اور ویران دلوں پر ہی سایہ کیے رہتا ہے۔ کتنی تنہائی تھی اس کی آنکھوں میں۔ میں اس میں اپنی سوچ کی گرمی منتقل کرنا چاہتا تھا... لیکن جب راحت خان اندر آئے، تو میں نے اس کے ہاتھ کو سرد ہوتے محسوس کیا اور پھر میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ میں ایک بار پھر غصے اور ندامت سے کھول اُٹھا تھا۔

"غزالہ کیا اپنے مہمان کی خاطر نہیں کرو گی"، راحت خان بولے اور میں راحت خاں سے باتوں میں اُلجھا غزالہ کے سرد ہوتے ہاتھ کو کوئی مفہوم دینے کی کوشش میں بار بار اُلجھ رہا تھا۔

غزالہ جب واپس آئی تو اس نے ٹرے میں دو پیگ رکھے ہوتے تھے۔

"سویٹ بوائے پیتے تو ضرور ہو گے" اس نے پیگ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا...

"ہاں جب مُفت مل جاتے" میں نے جواب دیا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔

"کیوں راحت خان آپ پیئں گے"

شریر لڑکی تم جانتی ہو کہ میں نہیں پیتا۔ اپنی خواہش کی لاٹھی میرے کندھے پر مت رکھو۔ راحت خان کی آنکھیں کسی نرم رو جذبے سے پُر تھیں۔ پھر ہم تینوں مسکرانے لگے۔

میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا "غزالہ رشید آپ مجسمے کی طرح خوبصورت ہیں۔ آپ اس بات کا بُرا تو نہیں منائیں گی"۔

"نہیں میں کسی بات کا بُرا نہیں مناتی"۔ وہ ایک دم اُداس ہو گئی تھی۔

"ہاں آپ بہت اچھی ہیں۔ میں آپ پر ایک خوبصورت سی غزل کہوں گا۔

"وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی"۔ اور ہاں! جب میں اُداس ہوں گی تو تمہاری غزل گنگنایا کروں گی۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر ساکت اور بے جان ہو گئی تھیں۔ راحت خان کے چہرے پر فکرمندی سی تھی۔

"غزالہ رشید کیا آپ میرے ساتھ باہر جانا پسند کریں گی"۔ . . . میں گھبرا رہا تھا۔

"ہاں ـــ ہاں ـــ شاید وہ کسی گہری سوچ میں تھی اور اس کے چہرے پر بھر اکیلے پن کا دُکھ تحریر ہو رہا تھا۔ پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہمارے سامنے صاف ستھری سرمئی سڑکوں کے کنارے رنگین پھول تھے اور سورج کی دودھیا نیلاہٹ میں ٹھنڈ سی گھلی لگ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اس وسیع خاموشی کے لینڈ سکیپ میں ہم دو مجسمے ہوں جو وقت کی دسترس سے بلند ہو چکے ہوں۔ ہم چلتے جا رہے تھے۔ غیر محسوس لمحوں میں پرواز کرتے۔ اس تمام خوبصورت احساس کے باوجود میں جانتا تھا، کہ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔

ہوٹل کی نیم تاریک راہداری میں کھڑے میں نے واپس مڑنا چاہا تھا۔ کیا فائدہ ـــ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا، لیکن پھر نہ جانے کیوں میں نے دروازے پر دستک دے ڈالی تھی، حالانکہ اسے میں نے ہمیشہ مختلف مردوں کی توجہ کا مرکز پایا تھا۔ آجاؤ ـــ اور میں اندر چلا گیا۔

غزالہ رشید کا سانولا چہرہ اور بھی گہرا سانولا لگ رہا تھا اور وہاں اس کے بستر کے پاس راحت خان چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا "میں جا رہا ہوں۔ تم اب کچھ دیر اس پاگل لڑکی کے پاس بیٹھو۔ راحت خان نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور

چلے گئے۔
کمرے میں سب طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر چیز بے ترتیب اور الجھی سی تھی۔ پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔
"یہ لڑکی اپنے اندر کے کرب کو کوئی الفاظ کیوں نہیں دیتی تاکہ ..." شاید - لیکن میں اس کو جاننے کا کب تھا۔
"بیٹھو لڑکے"۔ اس کے اندر کی اُداسی نے اس کی آواز کو بوجھل بنا ڈالا۔ میں نے روشنی کرنی چاہی، تو وہ جلدی سے بولی :
"روشنی مت کرو۔ مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی"۔ آواز کی اُداسی گہری ہو گئی تھی۔
"لیکن روشنی تو زندگی کی علامت ہے"۔
"ہاں بشرطیکہ انسان کے اندر بھی روشنی ہو۔ اور جب اندر روشنی نظر نہ آئے، تو اندھیروں سے پیار ہو جاتا ہے"۔ میں نے سگریٹ لائٹر جلاتے ہوئے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کی پوریں زرد ہو رہی تھیں۔
"عزالہ رشید انسان کو روشنی اس اندر اور باہر کھنچے ہوئے پردوں کے اُس پار نہیں مل سکتی"۔ مجھے اس بے ترتیبی کے درمیان بیٹھی ہوئی وہ ایک ننھی سی بچّی لگ رہی تھی جو اپنوں سے بچھڑ کر بڑا بننے کی کوشش میں آنسو بہا رہی ہو۔
"روشنی کی تلاش ضروری ہے میری دوست"۔ میں نہ جانے جذباتی کیوں ہو رہا تھا۔
"روشنی اور محبت۔ خوشیاں اور چاہتیں۔ یہ سب کچھ بار بار ہماری راہ میں آتی ہیں لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ ساری خوبصورتی یا تو ہمارے حصّے کی نہیں ہوتی، یا ہم ان تک پہنچنے میں دیر لگا دیتے ہیں"۔ وہ شاید رو رہی تھی۔
"تلاش میں کیا حرج ہے"۔ میں اُٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں نے باہر کی روشنی میں مُڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ سگریٹ کے گہرے دُھوئیں میں لپٹی اپنی عمر سے کہیں بڑی لگ رہی تھی۔
میں پھر افسردہ ہو رہا تھا۔
"عزالہ رشید باہر زندگی کی گہماگہمی ہے۔ آؤ میں تمہیں اس کمرے کی اُداسی سے کہیں لے جاؤں"۔

میں نے سامنے سوئمنگ پول کی جالیوں پر لپٹے سُرخ پھولوں کو دیکھ کر کہا :

"نہیں اندر اور باہر کہیں بھی امان نہیں ہے۔ میرے پاؤں درماندہ ہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ میرے اندر کی تلاش کا کوئی کنارا نہیں۔"

"زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ شاید میری موجودگی سے بھی آگاہ نہیں تھی۔ اس کے لب بھنچ گئے اور آنسو اس کی سُتے ہوئے گالوں پر بہنے لگے۔ پھر ہم دونوں وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ میں کبھی کبھار سر اُٹھا کر کھڑکی سے آتی روشنی کو دیکھ لیتا۔ میں اس بوجھل ماحول سے بھاگ جانا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے لگ رہا تھا جیسے اس کے بہائے ہوئے آنسو چپکے چپکے میرے دل میں اکٹھے ہو کر مجھے ڈبو رہے ہوں۔ اور میں کم از کم غزالہ رشید کے سانولے وجود اور مٹیالے آنسوؤں میں ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے کوئی نئی غزل سناؤ۔" وہ نیم وا آنکھوں سے بولی۔

"غزالہ رشید ابھی مجھے تمہاری محبت میں ڈوب کر اصلی غزل کہنی ہے۔"

"شاید وہ غزل تم کبھی نہ کہہ سکو۔" اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"شاید۔" میں نے دل میں اپنے آپ کو کہا۔

اور جب میں نے اس کی باتوں کے سحر سے اپنے آپ کو نکالا تو پردوں کے پار مکمل اندھیرا تھا۔ ہوٹل کی راہداری سنسان تھی اور درختوں کی شاخوں میں جلتے ہوئے بلب بڑے بے جان لگ رہے تھے۔ وہ وہیں کھڑی مجھے جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے سڑک پر چلتے ہوئے مُڑ کر دیکھا۔ اس کی سگریٹ کا شعلہ مجھے نظر آ رہا تھا۔ اور جنوری کی ٹھنڈی ہوا بھی میرے اندر کی گرمی اور طمانیت کو کم نہیں کر سکی تھی۔ میں نے زور سے سیٹی بجائی اور تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے کو بڑھ گیا۔

سرمئی بادلوں کے اس پار نیلے پربتوں کی چوٹیوں پر سفید برف بے آواز لہروں سے گر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میرے لمبے کوٹ کو دامن سے پکڑے پھٹ پھٹا رہی تھی۔ اور میں چلا جا رہا تھا۔ لمبی سنسان سڑک پر ہوا ننھے ننھے چکر دل میں گھومتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شاید وہ میرا ساتھ دینا چاہ رہی تھی۔ میں غمزدہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل پہلو میں بوجھل سا ہو رہا تھا۔ مجھے اس بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر آرام کر لینا چاہیے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ پتھر جو بارش کے تند ریلے کے ساتھ

بہتا اتنی دُور تک چلا آیا تھا۔ میں بھی غزالہ رشید کی تیز و تُند شخصیّت کے بےخود سر ریلے کے ساتھ بہتا سُنسان سڑکوں پر چلا جا رہا تھا؛ حالانکہ جس روز میں نے اس کو راحت خان کے بازوؤں میں سمٹے ہوئے پایا تھا، تو میں نے اپنے آپ پر ہزار نفرین بھیجی تھی۔ راحت خان جو سفید بالوں والا ایک بوڑھا مرد تھا اور میں جو اپنی وجاہت سے خود بھی مرعوب تھا، لیکن پھر بھی راحت خان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور غزالہ رشید کی آنکھیں بھی سرخ تھیں —— میرے مُنہ میں مٹی جیسا ذائقہ بھر گیا۔"

راحت خان نے پہلے کی طرح میرے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور چلا گیا —— ہم دونوں چُپ چاپ ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ میری آنکھیں سُلگ رہی تھیں

غزالہ رشید نے ایک گیلے رومال سے پان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالا اور ایک چھوٹی سی شیشی میں سے سفید سا سفوف نکال کر اس پر ڈالا۔ میں اس سفوف کو پہچانتا تھا۔ میں ہمیشہ سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"یہ لڑکی اپنی ذات کے الجھاؤ میں اس قدر کیوں الجھی پڑی ہے:" یہ کیا چاہتی ہے۔ کیا میں اسے کچھ نہیں دے سکتا۔ میں مرد کیوں نہیں بن سکتا۔ جس کی تلاش اس کی آنکھوں کو اداس کیے رکھتی ہے، لیکن یہ سب کچھ پوچھنے کا میرا کیا حق تھا۔ چند ملاقاتیں اتنی اہم تو نہیں ہوتیں۔

"کیا تم نے میرے لیے غزل کہی؟" وہ جیسے ہولے ہولے نیند سے بیدار ہو رہی ہے۔ اس کی بے جان آنکھوں میں سویا ہوا افسوں جاگ رہا تھا۔ اس کے ساکت چہرے پر زندگی کروٹ لے رہی ہو —— کیا خبر یہ راحت خان کی رفاقت کا شدید احساس تھا یا میرا۔ "بیٹھو سویٹ بوائے تم میرے دوست ہو اور مجھے اچھے لگتے ہو۔ میں تمہارے فن کی قدر کرتی ہوں اور اس بات پر فخر کرتی ہوں کہ تم مجھے ملنے آتے ہو۔ یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے اور پھر وہ ہولے ہولے کچھ گنگنانے لگی۔ اس کی مدّھم آواز ہوا کا ارتعاش لگ رہی تھی، جو فضا میں لگی ہوئی ننھی منی گھنٹیوں میں سے دبے پاؤں گذر رہی ہو۔ کمرے کی دُھندلاہٹ کا افسوں۔ اس کی مترنم آواز کا افسوں اور میرے دل کے اندر پیدا میرے اپنے فن کا افسوں۔ وہ میری ہی غزل گا رہی تھی۔ اور میں اس تمام افسوں میں گھرا ہوا بھی خوش نہیں تھا، کیونکہ راحت خان کا سفید بالوں والا سر مجھے یاد آ رہا

تھا۔ تم اتنے چُپ کیوں ہو۔ وہ میرے پاس کھڑی ہوگئی۔

" اور تم اتنی غمگین کیوں ہو۔ تم یہ سفوف کیوں کھاتی ہو۔ تم شراب کیوں پیتی ہو۔ تم اکیلی ہوٹلوں میں کیوں رہتی ہو۔ تم بوڑھے مرد کے کندھے سے لگی صرف آنسو ہی کیوں بہاتی ہو۔ میں اس کو زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے اندر سوال بھرے پڑے تھے۔ میں آج اس کو مکمل طور پر جان لینا چاہتا تھا۔ میں اس کے اندر کھنچے ہوئے تمام پردے اتار دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے وجود کے پُراسرار سے اندھیروں اور اُلجھنوں سے خائف ہو رہا تھا۔ میں اس خیال سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ جو میرے ذہن کی تہوں سے چمٹا ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔ اجنبی اور غیر سی۔ کیا ان سارے سوالوں کے پوچھنے کا میرا حق تھا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

" ہاں .... میں یہ ساری باتیں کیوں کرتی ہوں ... کیوں کرتی ہوں یہ باتیں۔ آج سے پہلے کسی نے بھی تو مجھ سے نہیں پوچھا ..... پھر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ شاید میں ایک مہربان چہرے کی تلاش کر رہی ہوں۔ وہ چہرہ جو بچپن میں میری بند آنکھوں پر جھکا میرے بال سنوارا کرتا تھا۔ جو کمرے کے اندھیروں میں میرے دل کا حوصلہ تھا۔ جو کالج کی تنہائی میں میرا ساتھی تھا۔ جس کا تصوّر مجھے چاندنی کی طرح ٹھنڈک دینے لگتا تھا ـــــ جس سے مجھے عشق تھا ـــــ سُنا تم نے اس چہرے سے عشق تھا مجھے۔ پُرسکون جیسے چاند کے گرد ہالے میں ایک سکون اور نُور ہوتا ہے۔ ایسا سکوت جو برسات کے سیاہ اور گھمبیر بادلوں کی سیاہی میں ہوتا ہے۔ جو محبت کی سچائی میں اور زبان سے ادا کیے گئے میٹھے لفظوں میں ہوتا ہے۔ مجھے اس سے عشق تھا"

" وہ کون تھا" میں اس کے لہجے میں چھپی گہری محبت کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ مجھے چبھا، وہ کوئی بھی نہیں تھا اور سب کچھ تھا۔ اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور زور زور سے کش لینے لگی اور مجھے لگا جیسے میرے اندر سے اس سے عشق کا لاوا کھول کر میرے سارے وجود کو جلا رہا ہو۔ بھسم کر رہا ہو۔ اور یہ سرکش سوچ کہ وہ چہرہ میرا چہرہ بن جاتے، تو کتنا اچھا ہو۔ جس سے اسے عشق ہے جو اس کے ساکت چہرے اور مٹیالی سوچوں سے بھری آنکھوں میں چھپا رہتا ہے۔ جس کو ڈھونڈنے کے لیے اس کی انگلیوں کی پوریں زرد ہو رہی ہیں۔ اس وقت میں وہاں بیٹھا اس شدید احساس اور خواہش میں جکڑا ہوا تھا۔ میں اس بات کی تکمیل

کے لیے انتہائی حد تک بھی جانے کے لیے تیار تھا ـــ ۔۔۔ میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا...!"

"وہ کون تھا؟" میری آواز میں اس شخص سے رقابت کا رنگ بالکل عیاں تھا میں نے اسے زور زور سے جھنجھوڑ ڈالا ـــ "بتاؤ وہ کون تھا؟" میری انگلیاں اس کے کندھوں میں گڑی لگ رہی تھیں۔

غزالہ رشید کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بھرے ہوئے گدلے تالاب کی مانند۔

"وہ میرا باپ تھا۔ اور جیسے میں ایکدم اپنے اندر باہر سے بالکل خالی ہو گیا تھا ـــ میں نے اس کے کندھے چھوڑ دیئے اور اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی زندگی کی کہانی بننے کی کوشش کرنے لگا..... لیکن پھر بھی اس کہانی پر مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اکیلی تھی۔ اور کہانیاں تو قدم قدم پر بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ کیا خبر یہ بات محض فریب ہو۔ دُوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے۔

وہ اُٹھی اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگی ـــ "بہت دن ہو گئے ہیں۔ اب مجھے چلے جانا چاہیے۔" وہ بولی اس کے قدم ایسے اُٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ کوسوں کا سفر طے کر کے آ رہی ہو۔ بھٹکی ہوئی معصوم بچّی ـــ

میں نے اُٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے..... اس کے ہاتھ سرد اور سخت تھے۔ احتجاج کرتے ہوئے۔ میں نے جلدی سے انھیں چھوڑ دیا۔ پھر ہم دونوں چیزیں سمیٹنے لگے۔ ادھورے مضامین کے پلندے۔ مختلف لوگوں کی طرف سے دی گئی کتابیں۔ ٹوٹی ہوئی پنسلیں اور نامکمل خطوط اس کے گرد ہر چیز ادُھوری۔ غمزدہ اور اُداس لگ رہی تھی۔

وہ جب کاؤنٹر پر بل دینے کے لیے رُکی، تو اس نے بغیر میری طرف دیکھے ہوئے کہا تھا۔ "میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں، تم یہ بل دے دو...... ایکبار پھر میں اس کے بارے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ وہ کیا تھی، میں اس کا کون تھا۔ جو وہ اتنی قطعیت سے بل دینے کا کہہ رہی تھی۔ میں نے بل چکانے کے بعد اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پتھریلا اور بے جان تھا۔ اور تب میں نے دل میں کہا تھا کہ میں دوبارہ غزالہ رشید

کو اپنی راہ میں نہیں آنے دُوں گا۔

لیکن میں اس کے ہر خط کا جواب دیتا رہا تھا، جس میں ادب کی رفتار پر گفتگو کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا تھا۔ بہت دنوں بعد اس نے ایک خط میں لکھا تھا "مائی ڈیئر بوائے! تمہاری صلاحیتیں اتنی بلند ہیں کہ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ انہیں بڑے سے سکرین پر پینٹ کر کے مری کے سب سے اونچے پہاڑ پر لٹکا دُوں۔ یہاں آؤ تو میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں۔" خط پڑھ کر میں مُسکرایا تھا۔ اپنے ہونے کے احساس کا گہرا نشہ تمام راہ مجھے مدہوش کیے رہا تھا۔ یا شاید میں غزالہ رشید کے زیادہ ہی زیر اثر آ گیا تھا...... اس کی باتیں۔ اس کا وجود...... میں اسے بھول نہیں سکا تھا۔ میری انتہائی خوبصورت غزلیں اس سے متاثر ہو کر ہی تو کہی گئی تھیں۔ گہری دھند اور بادلوں نے سُورج کی تابانی کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ دُور سے پہاڑ بڑے سیاہ دھبوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں نے غزالہ رشید کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں ابھی تک اپنے دل کو گزرے جذبات سے پُر محسوس کر رہا تھا۔ وہ محبّت کے جذبات نہیں تھے۔ بس میں اس کے بارے میں سوچتا ہی رہا تھا۔ شاید وہ اس کے ٹوٹے وجود سے ہمدردی کے جذبات تھے۔ جو انسان کے لاشعور میں چھپے رہتے ہیں۔ پھر اچانک بارش دُھند کی صوُرت میں گرنے لگی —— اندھیرے میں ایک لمبی راہداری سے گزر کر جب میں ڈرائینگ رُوم میں داخل ہوا، تو میں نے اس عورت کو دیکھا جو مجھے اندر تک لے کر آئی تھی۔ اس کا بوڑھا خوبصورت چہرہ ماتا اور شفقت سے پُر تھا۔

"تم غزالہ کے دوست ہو" وہ پیار سے بولیں۔

"جی، اور غزالہ نے مجھے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ میں لاہور سے آیا ہوں"

"غزالہ گھر نہیں ہے۔ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔" اس کا بوڑھا چہرہ تأسف اور رنج سے زرد سا ہو گیا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔

"لیکن اس نے تو ——" میں نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"بیٹے میں اس کی سوتیلی ماں ہوں نا، اس لیے اسے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ لوگ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ اُسے ہوٹلوں میں رہنے سے نہیں روک سکتی....

میں اُسے کسی بات سے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ میں اس کی ٹوٹی شخصیت کو جوڑنے کی کوشش نہیں کر سکتی۔"

"وہ ایسی کیوں ہے؟" میں نے آخر کار اپنے ذہن کے اندر اُلجھے سوال کو پوچھ ہی ڈالا کیونکہ اس سوال کا جواب مجھے کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔

"وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔ یہاں تک کہ میری اور میری بیٹی کی ذات بھی اُس کی محبت کی دُھند میں گم ہوگئی..... میں اُس مرد سے شاید نہ ہارتی، جو میرا شوہر تھا..... لیکن غزالہ سے ہارنا میرے مقدّر میں لکھا تھا۔ اور جب اُس کا باپ نہ رہا تو ہم تینوں ہی برابر ہو گئے۔ لیکن وہ اس برابری کو قبول نہ کر سکی میں نے اس سے محبت کرنی چاہی تھی۔ میں نے اُسے اور راحیلہ کو ایک ہی سمجھنا چاہا تھا۔ .... لیکن اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا..... وہ اُس ہاتھ کو کیسے پکڑ لیتی جو اُس کے باپ کی محبت کا دعویٰ دار بنتا تھا..... وہ ایسی کسی چیز کو بھی قبول نہیں کر سکتی تھی جس پر ذرا بھی شک ہوتا کہ اُس کی ذات کے علاوہ بھی اس کا باپ کسی اور چیز کو پسند کرتا تھا اُس نے اُن چیزوں کو بھی توڑ ڈالا جو بے جان تھیں، اپنے سمیت۔ لیکن انسان کو زندہ رہنے کے لیے چند اصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ کسی اصُول کو نہیں مانتی.... تم اگر اُس کے دوست ہو تو اسے سمجھانا اسے واپس آنا چاہیے..... یہ راہیں بھٹکا تو سکتی ہیں۔ منزل تک لے جا نہیں سکتیں ....آج کی رات ہی تو وہ بارہ بجے آتی تھی..... جب میں نے اُسے ٹوکا تو وہ اپنی چیزیں اٹھا کر اُسی وقت چلی گئی۔

میں ہمیشہ اُس کی منتظر رہوں گی۔ کیونکہ وہ اس شخص کو پیاری تھی جو مجھے عزیز تھا..... وہ چپ ہوگئیں۔ یہ شاید بارش کے قطروں کی آواز تھی جو کھڑکی کے شیشے پر گر رہے تھے یا اُن آنسوؤں کی آواز جو اُس بوڑھے اور غمزدہ گالوں پر بہہ رہے تھے۔ جن کو وہ اپنے پلّو سے پونچھ رہی تھیں۔

ہوٹل کا ایڈریس لے کر جب میں باہر آیا تو بارش کی پھوار نے مجھے بھگو دیا تھا، لیکن میں گڈمڈ سوچوں میں گھرا آگے بڑھتا گیا۔ سوچیں جن میں میرے اپنے جذبوں کا ماتم بھی تھا۔ اس محبت کا ماتم بھی تھا جو غزالہ رشید سے بچھڑ گئی..... اس خوبصورت رُوح کے برباد ہونے کا بھی سوگ تھا جو غزالہ کی ذات میں سے کبھی کبھار جھانکتی تھی۔ ہوٹل کے بیرے کے ساتھ ساتھ میں نے بھی دروازے پر دستک دی تھی.... لیکن دروازہ بند ہی رہا.... بیرے نے کہا.... بابوجی

اب شاید بی بی پانچ چھ روز تک کسی سے نہ ملیں۔ دروازہ اُن کی مرضی پر ہی کھلے گا۔ آپ کب تک انتظار کریں گے.... انتظار سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" کیا وہ پہلے بھی یہاں آتی ہیں....؟" میں نے پوچھا.....

جی ہاں..... جب دل زیادہ پریشان ہوتا ہے تو آجاتی ہیں..... باپ کے مرنے کے بعد تو پریشان ہی رہتی ہیں جی..... اُس نے دروازے کی طرف دیکھا..... جی انہیں اپنے باپ سے شدید محبّت تھی اور وہ آگے چل پڑا..... میں وہاں اکیلا کھڑا تھا..... میں نے بھی جانے سے پہلے آخری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا..... وہ کھلے دروازے میں سُرخ آنکھوں اور بکھرے بالوں سے کھڑی تھی..... ایسے لگ رہا تھا جیسے باہر کی دُھند اور اندر کے آنسوؤں نے اُس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔

میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا..... اندر ہمیشہ کی طرح اندھیرا تھا اور ڈھیروں ہی خط قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ محبت نامے جو مختلف لوگوں نے اُسے لکھے تھے.. خوبصورت باتیں... باتیں جو دل کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہیں، جو لبوں پر ہنسی اور آنکھوں میں چمک بن کر پھُوٹ بہتی ہیں۔ اُن کو وہ پڑھ پڑھ کر پھاڑتی جارہی تھی۔ میں خاموش اس کے پاس بیٹھا تھا۔ کبھی کبھار وہ کوئی خط مجھے بھی دے دیتی جس کو میں مدّھم روشنی میں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ وہ سب ایسے لوگوں کے خطوط تھے جو اُس سے مرعوب تھے۔ اس سے محبت کرتے تھے جن کو اس نے غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا۔ اُن میں میرے بھی خطوط تھے۔ "اور سب سے بڑی دکھ کی بات تو یہ ہے میرے دوست کہ ان سارے لفظوں کے ڈھیر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جو اس شخص نے لکھا ہو جو مجھے پیارا تھا..... جن کو پڑھ کر میں ان کو لبوں سے لگا سکوں...؟" اُس نے بہت سارے خطوط کو اُٹھا کر اُوپر اُچھال دیا..... اور وہ خزاں کے زرد پتّوں کی مانند اس کے رنج کی ویران سڑک پر بکھر گئے۔

میرا اپنا جذبہ ایک بار پھر مٹی کا ذائقہ بنکر میرے وجود میں بکھر گیا تھا..... میں ایک لفظ بولے بغیر وہاں بیٹھا رہا تھا..... اور جب میں باہر آیا تو میں نے اپنے آنے کا جواز اپنے ذہن میں ڈھونڈنا چاہا تھا..... میں کسی چیز کا سہارا چاہتا تھا جس کو پکڑ کر میں یہاں سے واپس جا

سکوں.... تاکہ میرے دل کے اندر بھری ویرانی مجھے نگل نہ سکے، لیکن میں بے مقصد ہی سڑکوں پر پھرتا رہا تھا..... اور ٹھنڈی ہوا میرے دامن کو پکڑے پھڑپھڑاتی رہی تھی..... اور سنسان سڑک پر ہوا ننھے ننھے چکروں میں گھومتی آگے بڑھ رہی تھی..... میں واپس چلا آیا تھا۔

اور پھر میں نے لوگوں سے سُنا کہ اُس نے راحت خان سے شادی کرلی ہے۔ اور اس کے پتھر کے بُت کی طرح بے جان چہرے پر بڑی بھرپور نسوانی کشش پیدا ہوگئی ہے....

جم خانہ کلب کے باہر گاڑی کے کھُلے پٹ پر ہاتھ رکھے پورے چاند کی دُودھیا نیلاہٹ میں
مَیں نے سڑک کے سینے پر ایک پیسے کو پڑے دیکھا ہے۔ وہ حقیر سا سِکّہ اندھیرے کی نسبت بہت
روشن اور واضح ہے۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے چھنتی چاند کی ترچھی کرنوں کی زد میں پڑا معصوم
اور حیران بچّے کی طرح جان پڑتا ہے۔ اِس پیسے میں اور مجھ میں ایک تعلق، ایک نسبت ہے،
لیکن پھر بھی یہ پیسہ اس سے مختلف ہے، جو آج سے زمانوں پہلے مجھے ملا تھا۔

اگر مایُوسی اور دُکھ کی باتیں بھُول سکتیں تو میں بھی کبھی اس سرد رات کی تنہائی میں کھڑا اس
پیسے کی کہانی نہ دُہراتا۔ وہ پیسہ جو میری زندگی کی راہوں میں کہیں نہ کہیں آن ٹپکتا ہے۔ اور ہٹیلے
بالک کی طرح میری یادوں سے لگا کھڑا مجھے ہمیشہ ہمیشہ تکے جاتا ہے۔

میری سوچ کی لَو، میرے دل کے کرب میں مدہم مدھم جلے جاتی ہے اور ننھی منّی خواہشوں
کے سائے ماضی کے کونوں کھدروں سے جھانکتے مجھے وہ سب یاد دلاتے ہیں۔ جنکو بیتے
ایک زمانہ ہو گیا ہے۔

اچھے وقت کے انتظار میں مَیں سالوں تڑپا ہوں اب جبکہ زندگی کی راحتیں اور آسودگیاں
میرے قدموں میں ہیں مجھے وہ گرد آلود پیسہ دکھائی دیتا ہے، ایک سنگِ میل کی طرح۔

بی بی کہا کرتی تھیں اگر خواہش کرنے سے سب کچھ مل جاتا تو میں بھی ایک خوبصورت
گھر بناتی جس کے کمروں کا فرش پختہ ہوتا جس کے صحن میں خوبصورت پھولوں کے گملے ہوتے

اور زندگی کی وہ تمام سہولتیں جو ہمیں میسر نہیں تھیں۔ شاید بی بی نے یہ چھوٹا سا خواب نواب زادہ ریاست علی کے بہت بڑے گھر کو دیکھ کر بنایا تھا۔ جہاں وہ ان کی لڑکیوں کو پڑھانے جاتی تھی۔ انسان خواب بھی اپنی ہمت کے بل پر ہی دیکھتا ہے۔ بی بی میں اگر ہمت ہوتی تو وہ زیادہ بڑا اور خوبصورت خواب دیکھتی اور پھر اسے پورا کرنے کے لیے اپنی تمام طاقتیں لگا دیتی، لیکن وہ تو شاید اس دکھ سے بھی آشنا نہیں تھی جو اس وقت بھی میرے خون میں زہر بن کر دوڑ جاتا تھا۔ اور میں سسک اٹھتا۔ کچی کوٹھڑی کے کونے میں گاڑے گولک کے بھرنے کا انتظار کرنے لگتا، جب ڈھیر سارے پیسوں سے میں بھی ایک بڑا سا مکان خریدنے کی امید میں کبھی کبھی ملنے والے پیسوں کو اس میں ڈالتا رہتا۔

مسٹر رستم کلب میں اکیلے بیٹھے پیتے رہتے ہیں۔ سفید ابروں کے نیچے آنکھیں بجھی سی ہیں۔ ایک دن انھوں نے اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"خوبصورت لمحے واپس نہیں آتے وقت ایسے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر نکل جاتا ہے جہاں زندگی کے پر اسرار اندھیرے اسے اپنے میں مدغم کر لیتے ہیں اور صرف ماتم کرنے والوں کی طرح ہم ان خوشیوں اور راحتوں کو یاد کرتے رہ جاتے ہیں جو کبھی ہمارے حصے میں آتی تھیں۔"

لیکن میں کونسی خوشیوں کو یاد کروں۔ کون سی راحتوں کا ماتم کروں؟ اگر بڑوں بڑی آسودگیاں ہمارے بس میں ہوتیں تو کبھی ہم بے اطمینانی کا شکار نہ ہوتے جو دھاگے سے بندھی تلوار کیطرح ہمیشہ ہمارے سروں پر جھولتی رہتی تھی۔ بی بی کو اگر اس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا جو میرا دل اپنے دوستوں میں محسوس کرتا تو بی بی ضرور رو پڑتی۔ میرے ہاتھ اچھے کپڑوں کے لمس کے لیے پھڑپھڑاتے، لیکن میں ان کو روکے رکھتا اور بھری سردیوں میں بھی ایک قمیض میں گذار دیتا۔ ہمارے پاس استطاعت ہی کہاں تھی جو دوسرا فالتو کپڑا خریدا جا سکتا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں مہینوں ہی بغیر جوتے کے سکول گیا تھا اور راستے کے کنکروں نے میرے پاؤں زخمی کر دیئے تھے۔ خون بہتا رہتا۔ یہاں تک کہ مٹی کی موٹی تہہ خون میں مل کر زخم پر جم جاتی اور خون بہنا رک جاتا۔ ہماری غربت نے ہمارے اندر ایک ایسی خود غرضی کو پیدا کر دیا تھا جو صرف اپنے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ دوسروں کو مار کر — دوسروں کے حصوں کو دبا کر، دوسروں کی

مسٹر توں کو لوٹ کر۔ بی بی ہیں اگر سب کو سلیقے سے سنبھالنے کی طاقت ہوتی تو مجھے بھی اپنے بڑوں سے محبت ہوتی اور نفرت کا وہ جذبہ پیدا نہ ہوتا جو ان کی خود غرضیوں نے میرے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اور شاید بی بی بھی اس بے چارگی سے نہ مرتی، پر یہ بے چارگی تو ازل سے ہماری قسمت کا حصّہ بنکر آئی تھی۔ ہمیں تو ایک ایک پیسے کے لیے امید و بیم کے بھنور میں گھومنا پڑتا تھا۔ بی بی کے چہرے کی وہ تمازت مجھے آجتک یاد ہے، جب ایک دن ایک پیسہ پانے پر میں نے دیکھی تھی۔ اس روز بارش زوروں پر تھی اور بڑے بھیا کام سے واپس نہیں آئے تھے۔ دِیے کا تیل ختم ہونے والا تھا اور بی بی پیسوں کے لیے پریشان تھی۔ ایک بھی پیسہ نہیں تھا اور تیل نہیں آسکتا تھا۔ رات بادلوں کی اوٹ سے نیچے اُتر رہی تھی۔ بی بی کچھ روز پہلے ایک پیسہ کہیں رکھ کر بھُول گئی تھی۔ بی بی کا حافظہ کمزور ہوگا؛ ورنہ ہمارے گھر میں ایک پیسہ بھولنے والی بات نہ تھی دیے کی مدھم لو کو ہاتھ کی اوٹ سے بچاتے ہوتے اس نے سب کونوں کھدروں کو دیکھ ڈالا سب کتابوں کے وَرق اُلٹ ڈالے، لیکن پیسہ نہ ملا۔ بی بی اُداس ہوکر کمرے کی دہلیز پر کھڑی بادلوں کو جُھکے دیکھتی رہی اور پھر جب طاق پر پڑے دِیے کی روشنی ہوا کے جھونکے سے لہرا کر کونے میں پڑے صندوق پر پڑی تو وہ گمشدہ پیسہ تھوڑا سا جھانکتا ہوا صندوق کے نیچے پڑا تھا۔ کسی شریر بچے کی طرح ہماری پریشانی سے لُطف اندوز ہوتا ہوا۔ بی بی پیسہ مِل گیا میں زور سے چِلایا۔ بی بی نے جب باہر کے اندھیرے سے مُنہ موڑ کر دِیے کی روشنی میں اندر دیکھا، تو اس کے چہرے پر پُرسکون خوشی تھی آج بھی سالوں کے فاصلے سے تیرتی اسی خوشی کو مَیں محسوس کرسکتا ہوں، جو اس پیسے نے بی بی کو بخشی تھی۔

مسٹر رستم کے جانے کے بعد کمرہ زیادہ سُنسان اور ویران ہوگیا۔ پردوں کے پیچھے چاند تھا اور آتشدان میں شعلے رقص کرتے ہوتے دیوانہ وار۔ اور پھر بہت اذیت کے ساتھ تمام مایوسیاں اور بے چارگیاں جنکو مَیں وقت کی ریت میں دفن کر چکا تھا، میری رُوح پر کسی بوجھ کی مانند اُترنے لگیں جن کے نیچے مَیں ہمیشہ ہانپنے لگتا ہوں۔

دوپہر کے بعد بی بی اپنے کپڑوں کو دھوتی اور انہیں گیلا گیلا ہی اِستری کر کے پہن لیتی۔ اگر بی بی کے پاس دُوسرا جوڑا ہوتا تو مَیں بھی شاید خوشی کی اس کِرن کو اس کے چہرے پر دیکھ لیتا۔

جو کلب میں عورتوں کی چال میں غرور اور ان کی باتوں میں خود اعتمادی بن کر جھلک اُٹھتی ہے۔
ان کو دیکھ کر مجھے اپنی بہنیں یاد آتی ہیں جنکو دیکھے ایک لمبا عرصہ ہو گیا ہے۔ بی بی جب دُھلے کپڑوں کو اِستری کرتی تو اس کے چہرے پر ایک تھکاوٹ کا سایہ چھایا رہتا۔ اور اس کی آنکھیں خیال اور سوچوں میں ڈوبی کہیں نیچے زمین کی گہرائیوں میں دیکھنے لگتیں۔ وہ مسلسل ایک ہی جگہ پر اِستری کیے جاتی، تو مَیں گھبرا اُٹھتا۔ میری اس گھبراہٹ کی وجہ بی بی کے خیالات نہیں تھے، بلکہ وہ باقرخانی اور چائے کا پیالہ تھا، جو ہر روز میری ماں کو اور مجھے نواب ریاست علی کے ہاں سے ملتا تھا۔ مَیں اس پیالے کے انتظار میں صبح سے بے چین ہوا اُٹھتا اور اس وقت کا منتظر رہتا جب مَیں بی بی کے ساتھ لمبی لمبی لائنوں کو پھلانگتا۔ نیچی چھتوں والے ریلوے کوارٹروں کی بستی سے گذرتا نواب ریاست علی کی محل نما حویلی میں گھس کر اندھیری اور تنگ سیڑھیوں کو پار کرتا اور پر کھلی چھت پر پہنچ جاتا۔

بی بی کے برتاؤ میں ہمیشہ ایک رکھ رکھاؤ کا انداز تھا۔ اس کے دُھلے کپڑوں اور قناعت پسند نظروں نے کبھی اس پیالے کو نہیں دیکھا، جسے مَیں بی بی کے حُکم کے انتظار میں تکے جاتا۔ اگر نواب ریاست علی کی لڑکیاں مجھے دیکھ لیتیں تو میں جھینپ کر جلدی سے اپنی ٹوٹی سِلیٹ کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگ جاتا۔ بڑی محنت سے حاصل کی ہوئی سفید پوشی نے محلّے میں ہمارا خاصا بھرم بنا رکھا تھا۔ اس بستی میں بی بی سب سے زیادہ پڑھی لکھی عورت تھی لوگ اس کی شرافت اور محنت کی قسم کھاتے تھے۔

لیکن یہ تو پہلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ بدلتے وقت نے اخلاقی اقدار بھی بدل ڈالی ہیں۔ لوگ پرکھ کے لیے شرافت اور اخلاق کو کسوٹی نہیں بناتے۔ اب تو بڑھیا سُوٹ، شہر کی چاردیواری سے باہر بنگلہ اور گاڑی زندگی کے معیار ہیں۔ جو اس ترازو میں پورا نہیں اُترتا، اُسے سَر اُٹھا کر چلنے کا حق نہیں۔ ان تمام راحتوں کو حاصل کرنے کے لیے مَیں نے بھاری قیمت چکائی ہے۔ ایسی قیمت جو دل کو خالی اور لبوں کو سکھا دیتی ہے ..... لیکن اس کے عوض کلب میں ہنڈولوں میں ڈولتی روشنی۔ نرم فرش اور دمے لچھا در کرتی راتوں کا حِصّہ دار بن چکا ہوں۔ کہیں کسی گہرائی کی کھوج نہیں، کوئی انوکھی جستجو نہیں۔ سب سطح پر اُبھرا ہوا اور واضح ہے۔ سب

راحتیں مکمل ہیں پر پھر بھی کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ اگر آج بی بی زندہ ہوتی تو میں اس کے کندھے سے لگا وہ تمام آنسو بہا دیتا جو میں نے اس دن سے نہیں بہاتے جب میں نے اپنی چھوٹی سی دنیا سے باہر قدم رکھا تھا جب میں نے دو کچی کوٹھڑیوں اور صحن سے نفرت کی تھی اور اس سفید پوشی سے بھی جو بی بی کو ہر روز وہی پرانا جوڑا دھونے پر مجبور کرتی۔ بسا اوقات وہ گیلا جوڑا نہ سوکھتا، تو میری بڑی بہن اسے ہلورے دے دے کر سکھاتی۔

میری ان تمام سوچوں کا سرا اس بڑے پیسے سے اُلجھا ہوا ہے جسے میں تین دن سے مسلسل نواب ریاست علی کے کوٹھے پر پڑے دیکھتا رہا تھا۔ میری گاڑی کے اگلے پہیے کے پاس بھی ایک پیسہ پڑا ہے جسے اٹھانے کے لیے میرا ہاتھ نہیں جھکیں گے۔ اس پیسے کے اور میرے درمیان ایک زمانہ کھڑا ہے۔ ایک زمانہ جس کے الاؤ میں میری زخمی خواہشیں سُلگتی تمنائیں اور دبی آرزوئیں خاکستر ہو کر نئے سویرے میں طلوع ہوں گی۔ اس نئے سویرے کی روشنی میں گھرا میں اپنے گرد پھیلی نئی دُنیا کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ دُنیا جو اس نئے چمکیلے پیسے کی طرح جاذب نظر ہے۔ پر اس پیسے پر گرد کی کوئی تہہ نہیں۔ معلوم نہیں یہ پیسہ کس کی جیب سے گرا ہے۔ کون اس کا مالک ہے۔ لیکن میں اس نئے پیسے کے متعلق تین دن سوچتا رہا تھا۔ رات کو بی بی کے ساتھ سوتے میں خواب میں اس کو اپنے گرد ناچتے دیکھا۔ اور صبح اپنے دل میں پختہ ارادہ کرتا کہ آج میں سب کی نظریں بچا کر اسے ضرور اُٹھا لوں گا۔ ایسا کرنے کے لیے میرا ذہن کشمکش میں اُلجھ جاتا۔ میں سوچتا یہ لوگ کتنے امیر ہیں۔ ان کے بچوں کی نظر میں پیسے کی کوئی وقعت نہیں کسی نے اسے اٹھانا نہیں چاہا۔ کسی نے اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

ان کی ہماری زندگی میں کتنا بُعد تھا۔

وہ پیسہ ان کی نظر میں ویسا ہی بے حقیقت تھا جتنا کہ میں۔ تبھی تو میں نے اس پیسے میں اور اپنے آپ میں ایک تعلق استوار کر رکھا ہے۔ وہ تین دن میرے حافظے کو تین سلاخیں بنکر داغ گئے ہیں میرا دل اسے وہیں پڑے دیکھ کر دھڑک اُٹھتا۔ میں اسے بے بہا ہیرا سمجھ کر اپنی مُٹھی میں، چھپا لینے کے لیے بیتاب تھا۔ خون تیزی سے میرے گالوں پر چھا جاتا۔ اور تپش سے میرا جسم جلنے لگتا۔ میں نیچے جا کر نل سے مُنہ لگا کر گلاسوں پانی پی جاتا اور اندھیری

سیڑھیوں کی نمی میں کھڑا اپنے دل کی تیز دھڑکن سنتا رہتا۔ میں بھی امیر بننا چاہتا تھا۔ اتنا امیر کہ ایک گرا ہوا پیسہ مجھے جھکنے پر مجبور نہ کرے اور میں بھی نواب ریاست علی کے بچوں کی طرح بڑی لاپروائی سے اس کے پاس سے گذر جاؤں ٹھوکر مار کر بے اعتنائی کے ساتھ۔

میری یہ خواہش میرے کمزور دل میں زمانوں اسی طرح پڑی پڑی ٹھٹھرتی رہی ہے جس طرح یہ ننھا چمکیلا پیسہ سڑک پر۔

باہر کی نسبت اندر گرمی ہے۔ فرش پر چلتے ویٹر کے بے آواز قدموں کی گونج ہے۔ بوتلوں سے اُڑتے کارک ہیں۔ جھاگ اڑاتا سوڈا ہے۔ خمار آلود آنکھیں ہیں، مصنوعی قہقہوں کی تپش ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں بھی گھونٹ گھونٹ اس شراب کو پیتے ہوئے جو شعلوں کی روشنی میں اور زیادہ سُرخ لگ رہی تھی۔ اَدھ کھلے پٹ سے آتی ہوئی ہوا کو اپنے چہرے پر محسوس کرتا رہا تھا۔ پھر جب میں نے پردوں کو ہٹا کر باہر دیکھا۔ بوڑھے درختوں کے درمیان بوڑھے سائے کانپ رہے تھے، جیسے وہ چاندکی جواں سالی کے احساس سے ناقابلِ برداشت حد تک خوش ہوں۔ ماضی کی یادوں میں گھرا میں خوشی کے ان لمحات کو ڈھونڈتا رہا جن کو نئی زندگی نے جنم دیا ہے ان نئی خوشیوں کے میلے میں گھری گذرے وقت کی وہ تنہا گھڑی میرے لیے ایک جاوداں لمحہ بنکر رُوح کے اندر رقصاں ہے، وہ خوشی جو اکیلی اور انوکھی تھی۔ جب میں نے اس بڑے پیسے کو جیب میں چھپا لیا۔ خوف اور سکون کے ملے جُلے جذبات سے میں کانپ رہا تھا۔ میں نے نواب ریاست علی کے بچوں کی طرف غور سے دیکھا کوئی میری عزیز ترین متاع کو چھیننے کے لیے نہ آیا۔ اسی وقت اپنی کم مائیگی اور پیسے کی حیثیت گہرا گھاؤ بنکر مجھے تڑپا گئی۔

میری زندگی میں آنیوالی تمام جدوجہد کا آغاز اس پیسے نے ہی تو کیا تھا۔ پیسہ جو مجھے نئی زندگی کا رہبر نظر آتا ہے ایسی زندگی جس کی راہ بھوک افلاس اور مجبوری کے ہزاروں جانگداز لمحوں میں قید ہے۔ ان لمحوں کے بیچ سے جھانکتا میرا اپنا چہرہ ہے۔ وہ چہرہ جو میرے وجود سے وابستہ اس ماضی کا حصّہ بن چکا ہے، جسے میں کبھی یاد کرنا نہیں چاہتا۔

اَبا کی زندگی میں ہم ان کے وجود سے بے خبر سے تھے وہ کبھی ایک جگہ ٹک کر نہ رہتے جب ایک دو ماہ بعد وہ گھر آتے، تو ہمارے گھر میں ایک جمود سا چھا جاتا۔ ہم سب بُجھے بُجھے

ان کے جانے کا انتظار کرتے۔ بی بی کا دبا ہوا غصہ ہم پر برسنے لگتا۔ بات بے بات ڈانٹ سننی پڑتی۔ بی بی کی زبانی سُنا تھا ابا خاصا کماتے ہیں، لیکن اس خاصے پن میں ہمارا حصّہ بہت محدود تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان دنوں جب ابا گھر آتے بی بی باورچی خانہ میں زیادہ مصروف رہتی اور ہمیں بھی کبھی کبھی لذیذ سالن کا مزہ چکھنے کو مل جاتا۔ اس سے زیادہ کم از کم میں تو کچھ نہیں جانتا۔ پتہ نہیں بی بی اس زندگی سے کیسے مطمئن تھی اور اس نے ابا کے خلاف کبھی کیوں احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس کا دل شاید ایسی گیلی لکڑی تھا جو بھڑک کر جلنا نہیں جانتی تھی جو خود بھی زندگی کی حدّت سے محروم رہتی ہے اور دوسروں کو بھی رکھتی ہے۔ بڑے بھیّا میں ابا کی عادتیں زیادہ تھیں۔ اس لیے ابا کہیں پردیس ہی میں چل بسے اور کافی دنوں بعد ہمیں اطلاع ملی تو ہمارے گھر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ بس بی بی کے چہرے سے ہنسی چھن گئی اور اس کی سوچیں بڑھ گئی تھیں۔ ہمّت کا وہ بند ٹوٹ گیا جو ابا کی زندگی میں بی بی نہ جانے کیوں محسوس کرتی رہتی تھیں۔ کئی باتیں آج تک میری سمجھ میں نہیں آئیں اور بی بی بھی نہیں ہے جو مجھے کچھ بتا سکتی۔ بھیّا اب گھر پر حاکم تھے انہوں نے بی بی کو کسی کے گھر جا کر پڑھانے سے منع کر دیا۔ اس طرح ان کی عزّت پر حرف آتا تھا۔ جس عزّت کی حفاظت ابا نہ کر سکے، اس کی پاسبانی کا بھیّا نے ذمّہ اٹھایا، تو خود داری کے اس احساس سے بھی بی بی کو تہی کر دیا جو اس وقت میری نظروں میں بی بی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا بی بی چپکے سے سب باتیں برداشت کر لیتی جیسے بغاوت کرنا جانتی ہی نہ ہو بی بی تو ازلی عورت تھی۔ اگر بی بی بغاوت کر سکتی تو بھیّا حاکم نہ بن بیٹھتے۔ بی بی راتوں کو مجھے اکثر اپنے ساتھ لگائے رونے لگتی۔ گھر کی کشمکش دیکھ کر وہی پیسہ ناچتا تھرکتا میرے سامنے آجاتا۔ اور میں آنکھیں بند کیے پیسوں کے ڈھیر پر چلتا اونچا ہی اونچا اٹھتا جاتا، یہاں تک کہ نیلا آسمان میرے سر پر ٹیک جاتا اور میں سکون کے ساتھ اِن پیسوں کے نیچے لوگوں کو لڑتے مرتے دیکھ کر خوش ہوتا۔ پھر کوٹھڑی کا اندھیرا مجھے چبھنے لگتا اور بی بی کا سرد جسم آنسو بنکر مجھے اپنے ساتھ لپیٹ لیتا۔ میری نفرت اس گھر سے بڑھتی جا رہی تھی جہاں ایک پیسہ بھی بغیر ایک بلبے تھکا دینے والے انتظار کے میرے ہاتھ نہ آتا۔ وہ گھر تو ایسا الاؤ تھا جہاں بی بی کی خاموش بے چارگی، بہنوں کی عمریں اور بھائی کی خود غرضی نے

سب کو جلا ڈالا تھا، اگر بھیا اس ایک اکنی کے لیے مجھے یوں بے تحاشا نہ مارتے کہ آج بھی اس کی یاد میرے جسم میں ٹیسوں کو پیدا کر دیتی ہے، تو شاید میں بھی انہی حالات کو سہار لیتا اور بی بی کو اکیلا نہ چھوڑتا اس روز بھیا نے مجھے بازار سے کچھ لانے کو بھیجا تھا۔ تو بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے وہ اکنی خرچ کر ڈالی تھی اور رات تک بستی کی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا تھا۔ مجھ میں بھیا کی مار کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ ان کی خشمگیں آنکھیں میرے سامنے گھوم رہی تھیں جب رات خاصی گہری ہو گئی تو میں دبے قدموں نیچی دیوار کو پھاند کر بی بی کی چارپائی کی طرف بڑھی، لیکن بھیا کے مضبوط ہاتھ نے مجھے پکڑ لیا۔ بات اس مار کی نہیں جو میری ہڈیوں تک کو زخمی کر گئی تھی۔ یہ بات تو بی بی کی اس بیچارگی کی ہے جو آگے بڑھ کر مجھے بچا نہ سکی۔ میں نے اپنی چیخوں کے درمیان اسے دیے کی روشنی میں روتے دیکھا تھا۔ اگر وہ کبھی اُٹھنے کی کوشش کرتی، تو بھیا کہتے، بیٹھی رہو بی بی۔ تمہارے لاڈ نے اسے آوارہ بنا دیا ہے۔ میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس گھر میں یہ رہ سکتا ہے یا میں ـــــ یہ چند لفظوں کی بات تھی جو بھیا کے زور زور سے چیختے گلے سے نکل تھی۔ میں نے اسی وقت رونا بند کر دیا۔ میرا اور بھیا کا کیا ناطہ تھا۔ شاید ابا کے بعد ہمارے گھر کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ اگلی صبح میں نے اپنے تمام رشتے اس گھر سے توڑ ڈالے اور اکیلا اتنی بڑی دُنیا میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے نکل آیا۔ میں جانتا ہوں بی بی نے سال ہا سال میری راہ دیکھی ہو گی۔ سال ہا سال اس کی آنکھیں میرے لیے روتی ہوں گی اور جب موت کے سرد ہاتھوں میں اس کی رُوح لرز رہی ہو گی تو اس نے میرا نام لیا ہو گا، لیکن یہی گذرے سال ہا سال اس کے اور میرے درمیان ایک رکاوٹ بنکر کھڑے ہیں۔

میں پیسوں کے ڈھیر پر بیٹھا نئے آسمان کو اپنے سر پر ٹکائے ہوئے ہوں اور میرے بہن بھائی اس کے نیچے کھڑے سسک رہے ہیں۔ نئی لذتوں سے مسرور میں اپنے آپ کا خود پجاری بن چکا ہوں۔ میرا اپنا آپ جس کے سامنے کوئی رشتہ کوئی ناطہ بڑا نہیں۔ لیکن پھر کیوں یہ پیسہ مجھے گذری کہانیاں یاد دلا رہا ہے۔

آج کلب کے ہال کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے میں نے مس کلثوم عابدی کے جسم

سے اٹھتی خوشبو کی تیز لپیٹ کو اپنے نتھنوں میں گھستے محسوس کیا تو مس کلثوم عابدی قہقہہ مار کر ہنس دی تھی۔ پھر ہم جام تھامے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ایک دوسرے کے متعلق بڑی خوب صورت باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی خوش ذوقی کو سراہا تھا۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں کو احساس تھا کہ ان باتوں میں سچائی اور بناوٹ کا کتنا حصّہ ہے پھر بھی ہم ایک دوسرے سے مسحور ہو رہے تھے۔ سوچی سمجھی اخلاقی اقدار کے تحت جنکو وقت کے بڑھاپے نے استوار نہیں کیا بلکہ نئے وقت نے بنایا ہے۔ نئے وقت کے ٹکسال میں پرانے سکوں کی قدر نہیں۔ اسی لیے تو میں نے بھی گذرے وقت کو بھلا دیا ہے۔ گھسی چپلوں اور بوسیدہ کوٹ کے ساتھ جب میں نے ایم۔ اے کر لیا، تو تب بھی میں اتنا ہی بے بضاعت تھا جتنا ایک زنگ آلود سکّہ لیکن مجھے تو اپنی خواہشوں کی تکمیل کرنی تھی۔ میری ہمت مجھے آگے بڑھاتی رہی اور پھر دنیا تمام خوبصورتی اور لگاؤ کے ساتھ میری طرف بڑھی۔ میں ایک سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوں۔ میری نظروں میں اپنی وقعت بڑھ گئی، میری چھپی طاقتیں اور دبے جذبے کونپلوں کی طرح پھوٹ نکلے۔ لوگ میری گھسی چپلوں اور بوسیدہ کوٹ کو بھول کر میرے بڑھیا سوٹوں کو سراہتے ہیں۔ میرے مذاق کی تعریف کرتے ہیں۔ میرا اندازِ گفتگو پسند کیا جاتا۔ میں اچھے لوگوں کا دوست ہوں۔ میں اپنا ماضی بھول گیا ہوں اور جانتے ہوئے بھی لوگ بھلانے لگے ہیں۔ میں نے وہ تمام آسودگیاں حاصل کر لی ہیں جو مجھے اپنی اور دوسروں کی نظروں میں بہتر اور اونچا بنا سکتی ہیں — میری خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں۔ میرے دل کے بے چین جذبے ایک انتہا کو پا کر ہی دم لیں گے۔ میں نے گذرے وقت سے تعلق توڑ لیا ہے۔ وہ تو بے چارگی اور درد کا بہاؤ تھا، جو ہماری خوشیوں کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ میں جانتا ہوں سب خوشیاں پیسے کی محتاج ہیں۔ قناعت اور صبر بے حقیقت ہیں۔ یہ پرانی قدریں میری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گی۔ ایک زمانے کی جان لیوا جدّوجہد کے بعد اب ایک فاتح کی طرح محرومیوں کے اس انبار پر کھڑا زور زور سے قہقہے لگا رہا ہوں جن کو میں نے اپنی قسمت کی راہ سے ہٹا دیا ہے۔ میں نے اپنے گرد وقار اور دولت کی دیوار بنا لی ہے پر پھر کیوں گذرا وقت اس میں سیندھ لگا کر میرے پاس آ رہا ہے۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ میرے اور گذرے وقت کی حد پر وہی پیسہ پڑا ہے۔ پر میرا دل اس خوشی سے

محروم ہے جو مجھے زمانوں پہلے حاصل ہوئی تھی۔ اب تو میں ایک مسلسل خوشی کے سرور میں مگن ہوں۔ ایسا نشہ جو آگے نہیں بڑھتا۔ بس ایک جگہ تھم جاتا ہے اور انسان کو جمود کا احساس ہونے لگتا ہے۔

یہ پیسہ جو بیتے وقت کے ساتھ بندھا میرے خیالوں میں جھولتا رہتا ہے میں اس سے آنکھیں ملاتا شرماتا ہوں، لیکن پھر بھی اس کا میرا رشتہ اٹوٹ ہے۔ یہ مجھے کسی نئی راہ کیطرف نہیں لے جائیگا۔ میں تو ایک سنہری خلا میں جی رہا ہوں ایسا خلا جہاں زندگی کی گرمی مستعار دلوں کو گرما دیتی ہے۔ جہاں کوئی ماضی پریشان نہیں کرتا۔ کوئی مستقبل پیدا نہیں ہوتا۔ بس وہ لمحے زندہ رہتے ہیں جو آنکھوں میں سرخ ڈورے اور رگوں میں لاوا بنکر بہتے رہتے ہیں انسان لاتعلق ہو کر جیتے ہیں اور راحت کا وقتی احساس ان کی سوچوں کو منجمد کر دیتا ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے فسوں میں قید اس بڑے دروازے سے باہر آیا تھا۔ اپنے آپ سے اور اپنی کامیابیوں سے خوش بڑی اہمیت کے ساتھ قدم قدم بڑھاتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھتے ہوتے اسے کھول کر اس کے کھلے پٹ پر ہاتھ رکھے چاند کو دیکھتے ہوتے میرا کوئی ماضی میرے لیے زندہ نہیں تھا، لیکن اس سڑک کے پتھریلے سینے پر پڑے پیسے کو دیکھ کر یادیں گذرے لمحوں کی قید سے آزاد میرے گرد اکٹھی ہو گئی ہیں اور مجھے وہ تمام دُکھ یاد آرہے ہیں جن کے بھولنے ہی میں میری تکمیل ہے۔ یادوں کے شروع ہونے پر وہی پیسہ ہے جو مجھے اور آگے بڑھنے کے لیے اکساتا رہتا ہے ایک سنگِ میل کی طرح۔

آج موسم کس قدر خوشگوار اور نکھرا نکھرا سا ہے۔ مَیں اور رحیم دنوں بعد ملے ہیں اور ہم دونوں اس وقت سے لُطف اٹھانے اس مہربانی بھرے شہر کی رونق کو دیکھنے سڑکوں سڑکوں گھومتے اس باغ میں آ نکلے ہیں؛ اگرچہ ہمارے کندھوں پر سالوں کا بوجھ ہے۔

پھُولوں کے بوجھ سے لدی ننھی ننھی جھاڑیاں۔ بارش میں دُھلے لرزاں لرزاں سے پھُول۔ رنگ اور نور ..... ہریاول اور تازگی ہیں محسوس کر رہا ہوں جیسے میرے دل کے اوپر پڑی مٹی کی تہہ بھی اُتر گئی ہو اور مَیں ہلکا پھلکا ہو کر ان چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں کی طرح ہو گیا ہوں جو افق پر نیلے آسمان کے کنارے ہماری دُنیا کی خوبصورتی دیکھنے کو جمع ہو گئے ہیں۔

رحیم سیٹی میں کوئی دُھن بجا رہا ہے اور باڑ کے دُوسری طرف جوان قہقہے ہیں۔ مَیں نے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا فطرت کی اس دلآویزی کے بعد بھی کوئی خوبصورتی باقی ہے، جو ہمیں اپنی طرف کھینچ سکے۔ مَیں نے جاتے جاتے ایک پتے کو توڑ کر اپنی ہتھیلی میں ملا ہے۔ لیموں اور کھٹے کی ملی جُلی سی بو میرے دماغ میں بھر گئی ہے۔ مَیں نے زور زور سے سانس اُوپر لیا ہے۔ مختلف خوشبوؤں سے بھری ہوا میرے اندر چلی گئی ہے۔

رحیم چہروں کو تاکتا اور سیٹی بجاتا جا رہا ہے اور پھر اچانک سفیدے کے درختوں سے جھانکتی میں نے رنگوں کے تانے بانے سے بنتی قوس قزح دیکھی ہے اور مجھے ماہ رُخ یاد آ گئی ہے۔

مَیں رُک گیا ہوں ...... رحیم آگے بڑھ گیا ہے۔ مَیں اُسے آواز نہیں دُوں گا۔ اس مکمل خوبصورتی

کے تصوّر نے میرے دل کو لرزاں سا کر دیا ہے۔ خدایا تیری دنیا کتنی پیاری ہے۔ میں نے اپنے دل کہا ہے اور پھر کچھ فاصلے پر مجھے وہی جانا پہچانا چہرہ نظر آیا ہے۔ ماہِ رُخ کا چہرہ۔ اسے دیکھ کر میرا دل بوجھل ہو گیا ہے، حالانکہ میں تو خوش رہنا چاہتا تھا۔ بالکل اور مکمل خوش۔ لیکن مجھے اچانک احساس ہونے لگا کہ یہ سب کچھ ہمیشہ نہیں رہے گا..... مِٹ جائے گا۔ فنا ہو جائے گا......

.....میرے دل میں بھی کوئی غم بھر جائیگا۔ کبھی نہ مٹنے کے لیے میری زندگی کے گذرے سال بھی میری گردن میں بوجھ بنکر لٹک جائینگے۔ اس بھرپور طمانیت اور سُکھ میں۔ ماہِ رخ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس ماہِ رخ کو جس کو میں سالوں پہلے جانتا تھا، جو اُس گذرے وقت کی پرچھائیں بھی نہیں لگتی۔ پھر بھی وہ ماہِ رُخ ہی ہے۔

ماہِ رُخ جو سالوں پہلے میری شاگرد تھی۔

وہ خوبصورت تو نہیں تھی، لیکن پھر بھی اُس کا چہرہ دُوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا اور جب وہ لڑکیوں کے ساتھ کھڑی زوردار قہقہہ لگاتی تو ہر کوئی ادھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن وہ سب سے لاپرواہ باتیں کر رہی ہوتی، تیز تیز ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔ اپنی دُنیا میں جذب سب سے بے خبر۔

ایک روز لائبریری میں اس نے بڑی اُپنائیت سے مجھے ایک کتاب ڈھونڈنے کو کہا۔ اس کی بے باکی پر حیران سا کھڑا ہو گیا اور چٹ کو لے کر کیٹالاگ سے اس کتاب کا نمبر ڈھونڈنے لگا۔ اور وہ بڑے مزے سے میز پر بیٹھی میری کاپیوں اور کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہی جب میں کتاب لیکر واپس آیا، تو اس نے بغیر شکریہ ادا کیے کتاب لی اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔

اس کے بعد اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کوئی نہ کوئی پرابلم لیے میرے پاس آجاتی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے باتیں کرنے لگتا۔ اس کی مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا اور اگر وہ کچھ روز تک نہ آتی تو میں اُس کا انتظار کرتا۔ اپنے دفتر میں بیٹھا دروازہ کھلنے پر مجھے آس ہوتی کہ وہ آتی ہوگی شاید لیکن وہ نہ ہوتی اور میں کتاب کو زور سے میز پر دے مارتا جیسے میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہوں یا اپنی بے وقوفی پر خفا ہوں۔ کلاس میں بڑے انہماک سے میرا لیکچر سنتی۔ پورے نوٹس لیتی۔ لیکن میری طرف کبھی بھی پوری کھلی آنکھوں سے نہ دیکھتی۔ اور میں دل ہی میں جھنجھلا جاتا—

اپنے پر۔ ماہِ رُخ پر۔ اس کی توجہ پر جو وہ لکھنے پر لگاتی ...... اور وقت گزرتا گیا۔ میں اُس سے کوئی بات بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بڑے اعتبار سے اور وثوق سے میرے پاس آتی، بیٹھتی گپیں ہانکتی اور چلی جاتی۔ ہم دوست تھے ـــــــ لیکن میں تو کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تھا ...... کہاں۔ کس حد تک۔ اس بات کا تعین میں نہیں کر سکتا تھا۔

اور جب ماہِ رُخ ایم۔ اے فائنل کا آخری پرچہ دیکر مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اسے اگلی شام کلب میں چلنے کو کہا۔

وہ بولی ..... سر کلب میں کیا کریں گے۔ کسی کیفے کسی ریسٹورنیٹ میں چلئے۔ میں آپ کو چائے پلاؤں گی۔ اور ہم بہت سی باتیں کریں گے۔ پھر پتہ نہیں زندگی ہمیں کہاں لے جاتے۔ ہم کبھی ان لوگوں کو مل سکیں گے یا نہیں جو ان دو سالوں میں ہمیں اس قدر مہربان اور اچھے لگتے ہیں ـــ ان سہیلیوں کے ساتھ مل کر دوبارہ زمانے بھر کی اُوٹ پٹانگ باتیں کر سکیں گے یا نہیں جو لگتا تھا ہمارے اپنے ہی دل کی باتیں کرتی ہیں۔

مَیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں اس کی تمام بے باکی کے باوجود ایک کنواری پاکیزگی تھی۔ اس کی ہنسی میں جھرنوں کا ترنم تھا اور اس کی خمدار پلکیں .... وہی تو اس کے چہرے کو اتنا پرکشش بناتی تھیں۔

"ماہِ رُخ! کیا سہیلیوں کے علاوہ بھی کوئی ایسے لوگ ہیں، جو تمہیں آئندہ زندگی میں یاد آئیں گے۔" مَیں نے ہنس کر پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں سر۔ اُس نے کتابوں کو میز پر رکھتے ہوئے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ مجھے آپ کی مہربانیاں یاد آئیں گی۔ آپ نے میری بڑی مدد کی ہے ..... ورنہ مَیں آج امتحان کے بعد اتنا خوش نہ ہوتی۔"

"بس صرف اتنا ہی .... یا اور بھی کچھ؟"

"سر کیا اور کچھ بھی ہونا چاہیے تھا؟ مَیں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔" وہ عجیب اپنے پن سے ہنس رہی تھی۔

"ماہِ رُخ ہم دونوں استاد شاگرد کے علاوہ انسان بھی تو ہیں ..... اور انسان

ایک دوسرے کے لیے اور طریقے سے بھی سوچ سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے سر۔ آپ وقتی طور پر خوش ہو لیتے اور میں بھی امتحان کے بعد اپنی راہ لگتی۔ آپ کے لیے شاید اس بات کی اتنی اہمیت نہ ہوتی، لیکن میں لڑکی ہونے کی وجہ سے عجیب و غریب خواب دیکھتی اور پھر ان خوابوں کی تعبیر پر روتی ..... اور رونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور اس نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔ ویسا ہی لاپرواہ سا جیسا وہ اپنی دوستوں میں کھڑی لگاتی تھی۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ماہ رُخ۔"

"آپ اتنے ٹیڑھے تو نہیں سر۔ اور آپ کا خیال ہے دو سال لڑکوں میں پڑھ کر میں ان کو سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوئی۔"

میں چُپ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ اپنے سامنے رکھے پیپر ویٹ کو اٹھا کر ماہ رُخ کے سر پر ماروں اور دروازہ کھول کر باہر چلا جاؤں ..... میرے سامنے ماہ رخ بیٹھی بڑی لاپرواہی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں اپنی بے وقوفی پر اپنے آپ سے ناراض ہو رہا تھا۔ ناحق دو سال کے قیمتی لمحے اس لاپرواہ سی لڑکی کے بارے میں سوچتے گذار دیئے۔ اور اب وہ مجھے بے وقوف بنا کر بڑے آرام اور لاتعلقی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ماہ رُخ میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں ...... میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے بھول جاؤ یا کسی اور سے دوستی کر لو۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی دل کی بات کہہ گیا تھا۔

"اور اپنے اپنے چار عدد بچوں اور ایک عدد بیوی کا کیا کریں گے؟ اس کی آنکھوں میں طنز تھا اور ہونٹوں کے کناروں پر مبہم ہنسی۔

"مرد کی زندگی میں عورت کا صرف ایک ہی روپ نہیں ہوتا۔ وہ مختلف عورتوں کو الگ الگ روپ میں چاہتا ہے اور ان سے دوستی کرتا ہے، وہ ان کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے ان کی پرستش کرتا ہے۔" میں نے اپنی زندگی میں اس کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن عورت کی زندگی میں مرد کا صرف ایک ہی رُوپ ہوتا ہے سر۔ ہم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کوئی اور بات کریں۔" اور وہ کتابیں لیکر کھڑی ہو گئی۔

"ماہ رُخ بیٹھ جاؤ .... ناراض نہ ہو۔ اگر تمھیں میرے الفاظ بُرے لگے ہیں تو میں ان کو واپس لیتا ہوں۔"

"مطلب یہ ہوا سر کہ آپ یہ الفاظ بھی وقت گذاری کے لیے بول رہے تھے۔ ان میں کوئی مطلب نہیں تھا یہ خالی لفظ تھے بغیر کسی سچائی کے۔" اس کی آنکھوں میں سختی آ گئی تھی۔

"ماہ رُخ تم کتنی اذیت پسند ہو۔" میں نے اس کے ہاتھ سے کتابیں لے کر میز پر پٹکتے ہوئے کہا۔

"سَر میں اور آپ دوست ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ آپ کو ایک اچھے دوست کی حیثیت سے یاد کروں۔ اس کے بعد ایک سرحد آتی ہے اور اگر کوئی مرد اس سرحد کو پار کر کے عورت کی زندگی کے دائرے میں داخل ہو جائے، تو وہ اس کے لیے بڑی پاک اور اونچی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے اس کی پوجا عورت کی زندگی بن جاتی ہے اور وہ اپنے اردگرد سے غافل ہو جاتی ہے۔ بتائیے میں آپ کو وہاں بٹھا کر کیا کروں گی۔" اور وہ اپنی کتابیں اُٹھا کر چلی گئی۔ میں بند دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ کمرے کے مانند میرا دل بھی خالی اور سُونا ہو گیا تھا۔

ماہ رُخ کہاں گئی ...... وہ چلی گئی ..... میں نے اپنے دل کو ان الفاظ کی دہشت سے بچانے کی بڑی کوشش کی تھی، لیکن اس دن اور آنے والے کئی دنوں تک میرا دل خوف زدہ اور غمگین رہا تھا۔ کالج میں اِدھر اُدھر آتے جاتے مجھے اس کے قہقہے سنائی دیتے۔ ایک لمحہ کو میں رُک جاتا یہ جانتے ہوتے بھی کہ وہ اپنے شہر واپس چلی گئی ہے۔ میں اُسے یاد کرتا رہا۔ نہ جانے کیوں۔

لاہور سے میرا ٹرانسفر دوسرے شہر کو ہو گیا۔ مصروفیتوں میں، میں یہاں اور بہت سی باتیں بھول گیا تھا۔ وہاں ماہ رخ بھی مجھے یاد نہیں آتی تھی۔ زندگی کی اور چھوٹی چھوٹی وقتی مسرتوں سے گھرا میں خوش تھا۔...... ہم کتنی جلدی ان سچائیوں پر بھی یقین کرنا چھوڑ دیتے ہیں جو کبھی ہمارے لیے ایک زندہ حقیقت ہوتی ہیں۔ اور نئی حقیقتیں تلاش کر لیتے ہیں۔ نئے مفروضے گھڑتے ہیں۔ نئی راہیں اپنا لیتے ہیں۔ نئے وقت سے اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ اور وقت گذرتا جاتا ہے۔ ایک موسم گرما کی چھٹیوں میں جب میں لاہور آیا، تو ماہ رُخ مجھے ایک ڈرنک پارٹی میں ملی تھی۔ وہ ڈھیر سارے سوڈے میں تھوڑی سی وہسکی ملا کر پی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے۔

آیئے سر میرے پاس بیٹھئے۔ اس نے میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور میں جو مرد تھا۔ زندگی کی اونچی نیچی راہوں پر چلتا رہا تھا۔ اُسے اس روپ میں دیکھ کر حیران اور شرمندہ تھا۔ وہ سالوں پہلے میری شاگرد تھی۔ اور یہ ماہ رُخ وہ تو نہ تھی ..... یہ تو اس کا عجیب اور انوکھا رُوپ تھا۔

وہ کسی کالج میں پڑھاتی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب پکّا پن آگیا تھا۔ زندگی کے تجربوں کی پختگی۔

" ماہ رُخ تمہیں اس محفل میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ تو ایسی محفل ہے جو بدمست ہو سکتی ہے جو اپنے ہوش کھو سکتی ہے۔" میں نے اس کے خالی گلاس کو گھاس پر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

وہ خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر ہنس کر بولی۔

" سر یہ تو پانی تھا، کڑوا پانی ..... اور اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ محبوبانہ انداز سے لاپرواہی سے۔

" سر میں زندگی کا لُطف لینا چاہتی ہوں۔ ہم دوبارہ تو زندہ نہیں ہوں گے۔ میں زندگی کو برتنا چاہتی ہوں۔ میں اسے جی بھر کے استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ موت سے مفر نہیں۔ موت ہمارے پیچھے لگی پھرتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں اُداسی کے گہرے سائے تھے۔

وہ اتنی فرسٹریٹڈ کیوں ہو گئی ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا وہ تو لاپرواہی سے بھرپور قہقہے لگانا جانتی تھی۔ پھر اس کی باتوں میں مایوسی کا اندھیرا کیوں گھس آیا ہے۔ وہ تو دل میں زبردستی گھُس کر بیٹھ جانا چاہتی تھی۔

بَیرا ہمارے سامنے نئے گلاس رکھ گیا تھا اور مجھے گذرے دو سال یاد آرہے تھے۔

" ماہ رُخ گھر جاؤ۔" میں نے رنج سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

" سر یہ تو محض پانی ہے .... پانی ہے۔ کڑوا۔ دوائی کی طرح۔ پھر بھی اچھا ہے"..... اس نے اپنا ہاتھ گلاس کی طرف بڑھایا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو سختی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اسوقت وہ مجھے ایسی بے بس لڑکی لگی تھی جو راہ بھول کر درندوں میں گھر گئی ہو۔ اور میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔

"خدا کے لیے ماہ رُخ گھر جاؤ"...... میں نے سرگوشی میں اس کو سمجھایا تھا اور جب میں گیٹ کے باہر اُس کے پاس کھڑا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا، تو اُس نے بڑی محبت سے اپنے بازو میرے گلے میں ڈال دیتے تھے اور پوچھا تھا۔

"سر شراب کڑوی کیوں ہوتی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کی طرح تلخ۔ میں اس کے بازو اپنے سے علیحدہ کر دینا چاہتا تھا، لیکن وہ تو اپنے ہوش میں نہ تھی..... اور میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے اتنا لمبا سفر کیونکر اکیلے ہی طے کر لیا۔" سر آپ کتنے اچھے ہیں..... میں آپ سے...."

اور میں نے ایک زور کا تھپڑ اس کے مُنہ پر مارا تھا۔

"چُپ کرو ماہ رُخ"۔ مجھے لگا تھا کہ دو سالوں کا وہ جذبہ جس نے مجھے کئی دفعہ بے چین کر دیا تھا، میرے دل کے اندر اسوقت ایک چلچلاتا زخم چھوڑ گیا ہو، اور اس کی ٹیس مجھے تڑپا رہی ہو۔

اگلے روز وہ میرے گھر مجھے ملنے آئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر اُس پاکیزگی کو ڈھونڈنا چاہا تھا، جو کنوارے پن کی شبنم بنکر لڑکی کو عجیب کچا پن دیتی ہے۔ وہ اپنے گال کو سہلا رہی تھی۔

وہ ڈھیروں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔ اپنے کالج کی باتیں۔ افسروں کی گئی زیادتیاں، لڑکیوں کی بے باکی کے قصے اور اپنی زندگی کی محرومی کی کہانی۔

"سر۔ مرد کی قُربت عورت کو اپنے آپ سے کتنا آگاہ کر دیتی ہے اور پھر عورت لڑکے تک سے شرمانے لگتی ہے۔

میں حیران سا اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ شاید کل کی وہسکی نے اس کے اندر آگ بھر دی تھی، جو بھڑک رہی تھی؛ حالانکہ وہسکی بہت تھوڑی تھی۔

اس کا ذمّہ دار کون تھا۔ میں تھا جس نے شاگرد ہوتے ہوئے اُسے ایک عورت سمجھا تھا اور اس کی قیمت سے اُسے آگاہ کیا تھا؟

میں اس بات کا جواب "ہاں" میں نہیں دینا چاہتا تھا.... پھر بھی۔

"سر میں بہت اکیلی ہوں۔ ان تمام مردوں کے باوجود جو میری محبت کا دم بھرتے ہیں، جنکے ساتھ میں اکثر ہوٹلوں میں پھرتی ہوں، لیکن زندگی کے تجربے نے مجھے خوشی نہیں دی۔ میری تشنگی مٹی نہیں۔ میں ایک گھر کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہوں۔ وہ گھر مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔

میں اس کا پیچھا کرتی ہوں وہ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور سَر مرد کی فطرت بھی بڑی انوکھی ہے۔ عورت جہاں تمام طاقتوں کا اختتام کرتی ہے۔ مرد تو بات ہی وہاں سے شروع کرتا ہے۔ اس کا ساتھ کب تک دیا جا سکتا ہے، اس کا ساتھ دینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔"

اس کی آواز میں زمانوں کا دُکھ تھا اور چہرے پر سیاہ سایہ۔ وہ کتنی آسانی سے مجھے اپنی زندگی کے تلخ تجربات سُنا رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ کسی انجانی طاقت سے میں اس کی زندگی سے تمام کانٹوں بھری راہیں مٹا دوں جس پر چلتے چلتے اُس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے کے نیچے چُھپے اُس کومل چہرے کو باہر لے آؤں، جو کبھی شروع دنوں میں میں نے دیکھا تھا اور اس کی طاقت کو محسوس کیا تھا، لیکن بھاری دل لیے میں چُپ تھا۔

"ماہ رُخ تم اتنی دُور تک کیسے چلی گئیں؟" میں نے اس کے تھکے چہرے کو دیکھ کر پُوچھا تھا۔

"سَر جب قدم بھٹک ہی جائیں، تو پھر سب راہیں ٹیڑھی ہوتی جاتی ہیں۔ سیدھی راہ نہیں ملتی۔ لاکھ کوشش کرو، لاکھ سر مارو۔ ہر مرد ہمیں سنہری باتوں میں پھنسا کر اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے اور ہم روشنی کی خواہش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نتیجے میں اور زیادہ اندھیروں کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔"

وہ میرے سامنے جُھکی بیٹھی تھی۔ اِس کے بلاؤز کا گریبان نیچا تھا۔ میں نے اپنا مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ میرا دل اس کے لیے دُکھ رہا تھا۔ "سَر آپ بات کیوں نہیں کرتے۔ میں اتنے سالوں بعد تو آپ سے ملی ہوں۔ میرے دل میں ہمیشہ آپ کا خیال رہا معلوم نہیں کیوں۔ اور آج .... آج میں اپنے دل کی ساری باتیں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ کوئی بات تو کیجیے، کوئی سَرزنش ہی سہی، کوئی گالی ہی سہی۔ کوئی تو مجھے کچھ کہے، کوئی تو مجھے اس راہ پر جانے سے ٹوکے۔ مجھے تو کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ اندھیروں میں سفر کرتے کرتے انسان کے اندر روشنی کی کتنی شدید خواہش ہوتی ہے یہ صرف میں ہی جانتی ہوں.... سَر یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔"

اس نے میرے پاس بیٹھ کر اپنا سر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا تھا۔

اور میں بھی جو ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اُداس ہو گیا۔۔ میری آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ زندگی کی بے ثباتی اور تلخی کی یا ماہ رُخ کے اندرونی غم کی۔ مجھے معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ رُخ اپنے دُکھ کے ساتھ اکیلی تھی۔ میں اپنے بوجھ کے ساتھ اکیلا تھا۔ ہم سب کبھی نہ کبھی روشنی کی تلاش میں رہے ہیں اور روشنی ہم سے دُور بھاگتی جا رہی ہے۔ روشنی کو پانے کے لیے ہم کتنے ہی ظلمات طے کر جاتے ہیں، لیکن سچی خوشی کی روشنی ہمیشہ ہم سے آگے ہی رہتی ہے۔ ہماری دسترس سے دُور۔

ماہِ رُخ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ایسی بچی لگ رہی تھی جو زندگی کے گھنے جنگل میں بھٹک رہی ہو۔

میں اُسے کس روشنی کی طرف راہ دکھاتا، راہ تو مجھے بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں مرد تھا اس لیے کسی راہ پر بھی جا سکتا تھا۔

"سر اب مجھے چلنا چاہیے۔" اسنے رومال سے اپنے چہرے کو پونچھا اور آسمان کی نیلاہٹ دیکھنے لگی۔

"ماہ رخ ہم کبھی دوست رہے ہیں اور اب بھی تم مجھے اپنا دوست پاؤ گی ایسا دوست جو تمہارے بھٹکے ہوتے قدموں کو سیدھی راہ ڈال سکے۔ جب اندھیروں کی گرفت تم پر مضبوط ہونے لگے، تو تم میرے پاس آنا۔ ہم دونوں ایک دُوسرے کا دُکھ بانٹ لیں گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

میں نے اس کے بڑھے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں زور سے میرے ہاتھ دباتے مضبوطی سے۔ محبّت سے۔

"تم کتنی اکیلی ہو..... میں تمہارا دوست بنوں گا۔" میں نے اپنے دل میں اپنے سے وعدہ کیا تھا۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ کچھ مطمئن سی، کچھ خوش سی۔ خدا تمہاری راہیں روشن کر دے۔" میں نے اُسے جاتے دیکھ کر دُعا کی تھی۔

اُسے اکیلا سڑک پر جاتے دیکھ کر مجھے لگا تھا جیسے میں بھی ایک اکیلی اور اجاڑ سڑک پر اکیلا جا رہا ہوں۔ یہ اس کا وجود نہیں جا رہا تھا بلکہ میں تھا میرا وجود تھا۔

ماہ رُخ ان چھٹیوں میں اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ اُس چھوٹے سے قصبے میں اس کا دم گھٹتا تھا۔

"وہاں کیا رکھا ہے سر۔ اُجاڑ صبحیں۔ لمبی دوپہریں اور کبھی نہ ختم ہوتی راتیں۔ میں تو وہاں کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ سب گھر والے مجھے تو فضول اور عجیب ہونق سے لگتے ہیں۔ جب میرے دوستوں کے خط آتے ہیں تو میرا چھوٹا بھائی چوری چوری انہیں پڑھتا ہے اور پھر گھر میں ایک

ہنگامہ ہوتا ہے۔ اماں مجھے آوارہ ہونے کا طعنہ دیتی ہے اور میں ان باتوں کا بھی اقرار کر لیتی ہوں جو میں نے آج تک کبھی نہیں کیں۔ اور پھر مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ جب وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ اماں سر پر ہاتھ مار مار کر پیٹتی ہیں اور مجھے گھر پر بٹھا لینے کی دھمکی دیتی ہیں، لیکن میں جانتی ہوں، وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔۔۔۔ وہ چند سو روپے جو میری تنخواہ سے انہیں ملتے ہیں آجکل کے زمانے میں بڑے غنیمت ہیں۔" اور اس نے یہ سب باتیں اتنی آسانی سے بتا دی تھیں جیسے میں بھی اس کی کوئی سہیلی ہی ہوں۔ ایک مرد نہیں۔

"لیکن ماہ رُخ اس کا انجام۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کے لیے اپنے دل میں اور بھی درد محسوس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"انجام؟ ایسی باتوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اور مجھے تو اب انجام کی پرواہ بھی نہیں رہی" اس نے ایک رسالے کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اماں کہتی ہیں کوئی مرد ڈھونڈھ کر شادی کر لوں۔ میری ماں کو بھی مجبوری نے کتنا آزاد خیال کر دیا ہے، ورنہ میں جانتی ہوں وہ ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہیں۔"

"ماہِ رُخ تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"شادی"۔۔؟ اس کی آواز خالی تھی۔۔۔۔ اور اُس نے نظر مجھ پر ڈالی جیسے میں نے سرِ راہ اس کو ننگا کر دیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ الفاظ میں نے انتہائی لاپرواہی سے کہے تھے۔ اُسکو جاننے پر بھی میں نے اس کی دُکھتی رگ میں زور سے نشتر چبھو دیا تھا۔

اس نے سر نیچے کر لیا اور اس کے آنسو دامن پر گرتے رہے۔ میں آگے بڑھ کر اُسے تسلی دینا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن میں اس آگ کی تپش سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا جو اُس کے چھُونے پر مجھے بھسم کر سکتی تھی۔ میں غیر شعوری طور پر دُوسرے تمام مردوں سے اپنے آپ کو الگ کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی بے بسی سے کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

"معاف کر دو ماہِ رُخ۔ میں بھی کتنا لاپرواہ ہوں"

"کوئی بات نہیں سر میرے لیے یہ ہی بہت ہے کہ آپ دُوسروں سے مختلف ہیں۔ آپ دُوسرے مردوں کی طرح مجھے شادی کا جھانسہ نہیں دیتے۔ آپ کے پاس آکر میں اپنے آپ کو

محفوظ سمجھتی ہوں۔ اس لیے تو اکثر چلی آتی ہوں" اور اس نے روتے روتے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔
اور مجھے زمانوں پہلے سُنے اس کے تمام قہقہے یاد آرہے تھے۔

"سَر، مرد بڑی خوبصورتی سے عورت کو دھوکا دے سکتا ہے اور وہ شادی کا سہانا خواب ہے جو عورت کے سوچنے کی تمام قوتوں کو سلب کرلیتا ہے۔ پہلے پہل تو میں نے بھی یہ خواب پوری دیانت داری اور سچائی سے دیکھے تھے۔ لیکن وہ تو صرف نشہ آور دوائی تھی جو مجھے دی گئی تھی جب میں ہوش میں آئی تو سوائے چند تلخ یادوں کے میرے دامن میں کچھ نہیں تھا۔ اب تو میں خود مردوں کو دھوکا دے سکتی ہوں۔ اور اس میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے" وہ تلخ ہنسی ہنس رہی تھی۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا، لیکن میرے لیے کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔ اس کے اپنے تجربات خود ایک تازیانہ بن کر اُسے راہ بتا چکے تھے۔ میں جانتا تھا وہ تو جان کر دھوکا کھاتی ہے اور میں نصیحت کرکے اُسے کوئی نئی بات سمجھا نہیں سکتا تھا۔ میں اسے گھر نہیں دے سکتا۔ میں اس کے لیے بھرپور خوشیاں نہیں خرید سکتا تھا۔ پھر مجھے کیا حق تھا کہ میں اس کی آزادی کے حق کو چھینوں۔
ہم دونوں اکثر ایسی بے معنی اور فضول باتوں میں وقت بتا دیتے۔ اور وہ چلی جاتی۔ وہ میری بنائی دیوار کے اُس پار تھی اور میں اس کے دائرے کے اندر کیوں کر جا سکتا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں خوش تھے۔

ایک روز ماہ رُخ نے آکر کہا تھا "سَر، میں انگلینڈ جا رہی ہوں۔ پتہ ہے کس کے ساتھ اپنے منگیتر کے ساتھ" اُس کے چہرے پر دنوں کے بعد گلابوں کی تازگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے وقت کا نیاپن تھا۔

"وہاں جا کر ہم شادی کریں گے"

میں خوفزدہ سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے اسے بتانا چاہا تھا "ماہ رُخ ایک دفعہ پھر تم نے غیر یقینی کے اندھیرے میں قدم رکھ دیا ہے۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔
لیکن اس کی خوشی دیکھ کر میں چُپ رہا تھا۔ میں اس کے اس طلسم کو کیوں توڑ دوں۔
زندگی میں خوشیاں ملتی ہی کب ہیں۔ وہ خوش تھی تو اسے خوش ہی رہنا چاہیے تھا۔
"میں ریحان کو آپ سے ملواؤں گی۔ اس قدر سمارٹ ہے، اس قدر سمارٹ ہے کہ آپ بھی تعریف

کرینگے" اُس کے انگ انگ سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنی انتہائی خوشی کو لیے پارے کی طرح بے قرار تھی۔ اِدھر اُدھر چیزوں کو بے مقصد چھوتی کِسقدر اچھی لگ رہی تھی۔

"سَر، میں اتنی خوش ہوں۔ اتنی خوش" اس نے میرے پاس کھڑے ہو کر مجھے دیکھا تھا اور پھر اپنے بازو میری گردن میں ڈال کر میرے ماتھے کو زور سے چوما تھا۔

میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو اس قدر تیزی سے اپنے سے علیٰحدہ کیا تھا، جیسے وہ انتہائی پاکیزہ تھی اور میں اس کی پاکیزگی کو آلودہ ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔

"پاگل لڑکی" میں نے اپنے ماتھے کو ہاتھ سے پونچھتے ہوئے بہت غصّہ سے کہا تھا۔

"نہیں سر۔ میں نے اپنا تمام قرض چکا دیا ہے۔ اُن تمام مہربانیوں کا قرض جو آپ نے مایوسی کے دنوں میں مجھ پر کی تھیں۔ آپ نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ سَر یہ تو کچھ بھی نہیں"..... اس نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پھر ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

میں اپنے ہاتھ کو تھامے بے وقوفوں کی طرح دروازے کو دیکھتا رہا۔ ماہ رُخ بھی قوسِ قزح کی طرح کتنے رنگ رکھتی ہے۔ کتنے پیارے اور انوکھے رنگ۔ میں نے باہر دُھلے اور نکھرے آسمان کو دیکھ کر سوچا تھا۔ خُدا اسے خوش رکھے، خُدا کو اسے خوش رکھنا چاہیے۔ میں نے نیلے چمکیلے آسمان پر اُڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے خدا سے التجا کی تھی۔

چند مہینے گذر گئے اور اس کی کوئی اطلاع مجھے نہیں ملی تھی۔ اور میں دوسروں سے پُوچھتے ڈرتا تھا، مبادا کوئی غلط لفظ یا بُری خبر مجھے سُننے کو ملے۔ میں نے جو رشتہ اس سے بنا لیا تھا اُسکے ناطے میں اکثر اس کے لیے فکرمند رہتا تھا..... خدا کرے اُس کے منگیتر نے اُس کے ساتھ شادی کر لی ہو۔ خدا کرے وہ اپنے گھر میں چاہے وہ ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو خوش خوش رہ رہی ہو۔ میں اکثر اکیلے بیٹھے اس کے متعلق سوچتا تھا۔

اور پھر ایک روز اس کا ایک خط آ ہی گیا، جو اس نے انگلینڈ سے لکھا تھا۔

"سَر۔ میں نے خوشی کے چند مہینے تو دیکھ ہی لیے ہیں۔ وہ چند مہینے جن میں، میں نے خوشی کو جی بھر کر گلے لیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ آپ شاید جاننا چاہیں۔ اس کے بعد وہی ہوا جو میں اَبتک دیکھتی آئی تھی۔ مرد کی مکاری، اُس کا فریب اور دھوکا میرے لیے کوئی نئی بات تو نہیں۔

خوش رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ جب مایوسی حد سے بڑھ جاتی ہے، تو آپ کی کہی ہوئی باتیں یاد کر لیتی ہوں۔ کچھ حوصلہ مل جاتا ہے۔ چلو روشنی کہیں سے بھی ملے کبھی کبھار مل تو جاتی ہے۔

یہاں تو ہر طرف ریحان ہی ریحان ہیں۔ زندگی، تمام حدوں کو عبور کر چکی ہے۔ پھر بھی دل میں اتنے ریحانوں کی موجودگی کے باوجود ایک ریحان کی خواہش کبھی کبھار کروٹ لیتی ہے۔ اس ریحان کی تلاش میں میں کہاں کہاں پھروں گی۔ کیا کہہ سکتی ہوں۔ میرے لیے دُعا کریں۔ وطن واپس آ کر کیا کروں گی۔ وہاں کون میرا منتظر ہو گا۔ سب بہن بھائی اپنے اپنے میں مگن ہیں۔ پھر بھی دل کا ایک کونا ان کی خواہش کرتا ہے۔"

غیر یقینی کے اندھیروں نے تم کو نگل ہی لیا آخر کار۔" میں نے اُس کے خط کو پڑھ کر کہا تھا۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ ماہ رُخ ..... میری دوست .....

اور اس کے خط میں لکھی ہوئی سطریں سیاہ دائرے بنکر پھیلتی رہی تھیں۔ میرے سامنے جن میں ماہ رُخ گھومتی رہی تھی۔" اکیلی ..... دُکھی ..... غمگین .....

میں اُس خط کو لے کر کتنی ہی دیر بیٹھا رہا تھا ..... اس کے پتے پر میں نے کئی خط لکھے تھے۔ وہ سب چند مہینوں بعد واپس آ گئے تھے۔ ماہ رُخ وہاں نہیں تھی ..... ماہ رُخ گم ہو گئی مٹ گئی۔

ان خطوں کو ایک ایک کر کے پھاڑتے ہوئے میں نے دل میں ایکبار پھر اس کی بربادی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرایا تھا۔ میں اسے ریحان کے ساتھ جانے سے منع کر سکتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ کیا میں بھی دُوسرے لوگوں کی طرح اُس سے کوئی بدلہ لے رہا تھا۔ اپنے مرد ہونیکا خراج وصُول کر رہا تھا ـــــ اور پھر اُس کا کبھی کوئی خط مجھے نہیں ملا تھا..... کبھی کبھار وہ مجھے یاد آتی تو آتی ہی چلی جاتی۔ اور میں چپ چاپ بیٹھا رہ جاتا۔

اور آج سالوں کے بعد مجھے وہی چہرہ نظر آیا ہے۔ ہاں یہ وہی ہے، لیکن اب زمانوں کے بعد اسے پہچانوں گا نہیں.....

رحیم نے رُک کر مجھے آواز دی ہے اور میں اس سے ملنے آگے چل پڑا ہوں۔

بانو کو سپاہی پکڑ کر لے گئے۔

شیدا چائے والے کا نوکر بھاگتا ہوا اڈے میں داخل ہوا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ بات سمجھنے میں ایک ساعت کی دیر ہوئی اور پھر سب کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔

کس نے بتایا — کس سے پوچھا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دو سپاہی اُسے بازوؤں سے پکڑے جا رہے تھے۔ بانو نے نشہ کر رکھا تھا۔ وہ اُسے پاس کے ذخیرے سے لائے تھے ..." لڑکے کا چہرہ بھاگنے سے سُرخ ہو رہا تھا اور اس کی خوبصورت بلوریں آنکھیں تجسس سے اور بھی چمک رہی تھیں۔

"اُس کے ساتھ اور کون تھا؟" فیاض ڈاکخانے والا ..... لڑکا ذو معنی انداز سے ہنسا ...... سُنا ہے وہ دونوں شراب پی رہے تھے ..... اب بیچاری کو کوڑے لگیں گے۔ اُس نے پاس بیٹھے فیروز خاں کو آنکھ ماری۔ فیاض سب سے بازی لے گیا۔ لڑکا پھر ہنسا۔ فیروز خان نے زور سے ایک لات اس کی پشت پر ماری۔ اور اٹھ کھڑا ہُوا ..... جاؤ بھاگو ..."

لڑکا سہم کر ایک طرف ہٹ گیا۔

اُس سے بازی جیتنا مشکل ہی کب تھا۔ سالی ماری ماری تو پھرتی تھی۔" فیروز خان نے پان کی پیک زور سے زمین پر ماری اور چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

" ارے ہماری رونق ہی چلی گئی،" چائے خانے کا شیدا افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ اور

پکّوں میں چائے ڈالنے لگا۔کیوں خان چائے پیو گے ؟ رشیدے نے فیروز خان کی طرف ہمدردی سے دیکھ کر پُوچھا ..... وہ تو کسی کی بھی نہیں تھی .... پھر یہ فیّاض باؤ .... وہ ایک دم چُپ ہو گیا .... فیروز خان گہری سوچ بھری نظروں سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔سامنے دُور تک سبز کھیتوں کی خوبصورت چادر کے اُوپر نیلا آسمان تنا ہوا تھا اور اِکّا دُکّا مونگیا درختوں کی چھاؤں تلے مویشی بندھے ہوئے تھے۔سامنے کی سڑک ڈھول سے اَٹی اسے بڑی اُداس اور ویران لگی .. .. لیکن پھر بھی اپنی سی .... بانو کی طرح .... لیکن اب .... رشیدا اُس کے سامنے نہ جانے کب چائے رکھ گیا تھا۔اُس نے بے خیالی میں چائے کا کپ اُٹھا لیا اور پینے لگا۔اس کے دل کے اندر عجیب سا احساس اُٹھ رہا تھا، جیسے کوئی اس کے دل کو رسّی کی طرح بل دے رہا ہو۔اس کی آنکھوں میں دُھواں سا بھر گیا تھا۔اور کڑوا کسیلا مزہ اُس کی زبان سے رینگ کر اس کے حلق میں اُتر گیا۔اب سامنے کی سیٹ اسے ہمیشہ خالی ہی لگے گی۔

سالی، آوارہ —" اُس نے دل ہی دل میں بانو کو غلیظ سی گالی دی۔اور اُٹھ کر باہر آ گیا۔

باہر اُس کی گاڑی لائن میں لگی کھڑی تھی۔ٹکٹ والے کیبن کے باہر چند لوگ ٹکٹ لے رہے تھے اور اڈّے کی زمین پچھلے دنوں بارش کی وجہ سے سیاہ کیچڑ سے بھری پڑی تھی جس میں ٹائروں کے گہرے نشان اُترے ہوئے تھے اُسے لگا جیسے بانو بھی کوئی بھاری گاڑی ہو جس کے پہیئے اس کے دل کے اندر دُور تک نشان چھوڑتے ہوئے گذر گئے ہوں۔اُس کا دل کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔جیب سے کنگھی نکال کر بال بنائے۔کپڑے جھاڑے اور لاری کی طرف چل پڑا۔لیکن اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں اُس کے جسم سے الگ کوئی چیز ہوں جو اس کے پیٹ سے لگی بے جان طریقے سے لٹک رہی ہوں اور چل نہ پا رہا ہو۔بانو کے بغیر اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔لاہور بھئی لاہور ..... لاہور بھئی لاہور ... کنڈکٹر دروازے میں کھڑا چلّا رہا تھا۔فیروز خان نے پاس کی سیٹ کو دیکھا جس پر ایک بابو بیٹھا، سگریٹ پی رہا تھا جہاں اکثر بانو اس کے ساتھ بیٹھ کر جایا کرتی تھی۔"باؤ جی ! یہ سیٹ خالی نہیں آپ پیچھے بیٹھ جائیں" اس نے بڑی بدتمیزی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔اس کے اندر غصّے اور نفرت کا لاوا کھول رہا تھا۔

بابو نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر چھائی سختی کو دیکھ کر خاموشی سے اُٹھ کر پیچھے چلا گیا.... اس نے لاری جھٹکے سے سٹارٹ کی۔ دُھول کا گہرا بادل چھوڑتا ہوا تیزی سے چل پڑا..... اُس کا دل نہ جانے کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی لاری کو زور سے کسی چیز سے ٹکرائے اور ہر چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ ہرے بھرے کھیت.... پاس سے شاں کی آواز سے گزرتے ہوئے ٹرک اور بسیں، سڑک کے کنارے بنے کھوکھوں کے بازار... سب چیزیں تیزی سے پیچھے بھاگ رہی تھیں...... اور اس کا ذہن بھی جو نہ جانے سوچوں کی گہری کھائیاں عبور کرتا کہاں بھاگا جا رہا تھا۔ اگر فیاض سڑک پر ہوتا، تو میں گاڑی اس پر چڑھا دیتا" یار گھر سے لڑ کر آئے ہو کیا" خوفزدہ بیٹھے ایک مرد نے اُٹھ کر اُس کے کندھے کو نرمی سے دبایا۔ ذرا آہستہ یار بال بچوں والے آدمی ہیں...... ابھی مرنا نہیں چاہتے" "اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ مٹی دُھول اور بے مطلب سفر... مرنا ہی اچھا ہے... پاپ تو کٹیں.......

... جیتے جاؤ..... جیتے جاؤ..... وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"اگر جینا چاہتے ہو تو کسی دُوسری لاری میں بیٹھ جاؤ" وہ ایکسی لیٹر کو اور دباتے ہوئے زور سے بولا۔

"کیا تم نہیں جینا چاہتے" مرد مُسکرایا۔

"نہیں" اس نے زور سے جواب دیا۔

اور اُسے لگا جیسے یہ "نہیں" کا لفظ اس نے دُوسرے مرد سے نہیں کہا۔ بلکہ اپنے آپ سے کہا ہو، لیکن اگلے لمحے ہی زندگی کی محبت کا ایک کوندا سا اس کے اندر لپکا.... وہ کیوں مرنا چاہتا ہے۔ صرف اس لیے کہ بانو کو پولیس پکڑ کر لے گئی یا ڈاک خانے کا باؤ فیاض بھی اس کے ساتھ پکڑا گیا.... باؤ فیاض اور خود...... اور بانو.... بانو جو ہوا کے جھونکے کی مانند پچھلے کئی ماہ سے اُس کے ذہن اور وجود پر تیر رہی تھی..... بانو جس کو چھُونا تو بڑا آسان تھا، لیکن جس کو پکڑنا آسان نہ تھا اور فیروز خان جانتا تھا کہ وہ اُن میں سے کسی کے ہاتھ بھی تو نہیں آئی تھی؛ حالانکہ وہ اکثر اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی پان کی لالی سے رنگے ہونٹوں اور خوبصورت سیاہ آنکھوں سے مُسکراتی باتیں کرتی رہتی..... اور ہاتھ بڑھا کر اس کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال لیتی اور

پھر سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں میں دے دیتی، اور پھر ایسے لگتا جیسے وہ سب کچھ بھول چکی ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی اور وہ ہاتھوں کو گود میں رکھے سامنے دیکھتی رہتی اور اس کا سر نیچے جھک جاتا...... بانو کھو جاتی تھی.... گم ہو جاتی..... اور یہی کھوئی ہوئی بانو...... پچھلے کئی مہینوں سے اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھی۔ اور کوئی بھی تو نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کو کھوج رہی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ اور یہ فیاض باؤ.... منحوس سا مدقوق چھوکرا۔ اُس نے زور سے تھوکا...... اور آگے بڑھ کر اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ خوُن کی حدت سے تمتماتا چہرہ..... سیاہ بال اور روشن بڑی بڑی آنکھیں..... وہ اپنی قسمت تو بہت پہلے سے جانتا تھا... زندگی کے سفر نے اُسے بہت سے تجربات سے گذارا تھا...... اور یہ فیاض باؤ.....، "یہ نہیں ہو سکتا....." کہیں نہ کہیں کوئی گھپلا ضرور ہے۔ اُس نے اپنے پاؤں کا دباؤ ڈھیلا کر دیا۔ "شاید اب تم بھی جینا چاہتے ہو۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھا مرد مُسکراتے ہوئے بولا...."جینا اچھا لگتا ہے جوان.... بڑا پیارا...."

"ہاں مَیں بھی جینا چاہتا ہوں..... فیروز خان دھیرے سے بولا۔ شاید جینا اچھا لگتا ہے۔"

اور مروں کیوں..... کس کے لیے...... اُس سالی کے لیے جو مہینوں میری لاری میں لدی لدی بے مالک بکری کی طرح پھرتی رہی...... اور مَیں اُس کا غلام بنا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا اُس کا ساتھ ہمیشہ کا نہیں...... وہ تو کہیں بھی اُتر سکتی تھی۔ اور وہ اُتر ہی گئی — آخر کار — فیروز خان کو بہت سی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اُسے تیز پان کھانا۔ تیز چائے پینا اور تیز رفتاری سے لاری چلانی اچھی لگتی تھی۔ اور پھر اسے بانو بھی اچھی لگتی تھی۔ جو بقول لوگوں کے بڑی تیز تھی۔

اس روز وہ لاہور کے اڈّے سے سواریاں اُٹھا کر آ رہا تھا کہ راستے میں بانو نے اُسے اشارے سے روکا۔ بانو نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اُس کے ہونٹ پان کی لالی سے سُرخ ہو رہے تھے۔ اس کے ناک میں موتی تھے اور سفید چادر کے ہالے میں اُس کا چہرہ بڑا معصُوم اور خوبصُورت لگ رہا تھا۔

"تم پیچھے بیٹھ جاؤ صاحب"..... اُس نے اگلی سیٹ کے پاس کھڑے ہو کر کہا.... اور جب سواری چلی گئی، تو وہ بڑی لاپرواہی سے بیٹھ گئی..... وہ فیروز خان کو بہت اچھی لگی.... جیسے شفق کی گلابی شام کی سیاہی میں گھُل گئی ہو۔

"کہاں جانا ہے تمہیں ....." فیروز خان نے پوچھا تھا ..... اس نے لاتعلقی سے اس کی طرف دیکھا ــــ جیب سے پان کی پُڑیا نکالی اور ایک پان اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو ..... لو پان کھاؤ" ..... فیروز نے پان پکڑ لیا۔

"مَیں کالا شاہ کاکو جا رہا ہوں ...... کیا تمہیں بھی وہیں جانا ہے"۔ ..." مَیں بھی وہیں تک چلوں گی ....." وہ دروازے کی کھڑکی سے جُھک کر باہر کو دیکھنے لگی۔ فیروز خان کا دل چاہا کہ وہ اس سے باتیں کرے لیکن وہ بدستور وہیں جُھکی رہی۔ اور جب اڈّہ آیا تو وہ بغیر اس کی طرف دیکھے اُتر گئی۔

"تمہاری ٹکٹ کہاں ہے" کنڈیکٹر تیزی سے اُس کے پاس آکر پوچھنے لگا ..... اُس نے فیروز خان کی طرف مُسکرا کر دیکھا ..... کیا مجھ سے بھی ٹکٹ لو گے ..... اور فیروز خان کو لگا جیسے اس کی خوبصورت آنکھیں ایکدم ویران ہو گئی ہوں۔

"جانے دے اکرم" فیروز خان اُتر کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی اور پھر چائے خانے کو چل دی ..... فیروز خان بھی اُس کے ساتھ چل پڑا۔

دُوسرے ڈرائیور اُسے دیکھ کر مسکراتے۔

"دو گرم چائے اور مکھن لگے بَن" ..... فیروز خان نے بنچ پر اس کے سامنے بیٹھ کر آرڈر دیا .....

"مجھے بُھوک لگی ہے۔ روٹی کھاؤں گی" ..... اور فیروز خان چائے پیتے ہوتے اُسے کھانا کھاتے دیکھتا رہا ..... وہ دیسی عورت نہیں لگتی تھی، جیسی عورتوں کو دیکھ کر ہی وہ پہچان لیتا تھا۔ اس کے چہرے پر کھلنڈرا پن نہیں تھا، اور نہ ہی ایسی بے حیائی جو مردوں کو خواہ مخواہ چٹکیاں کاٹنے پر مجبور کرتی ہے، لیکن پھر بھی وہ ان سب کے درمیان بیٹھی گھبرا نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا ..... ایسا لگتا تھا جیسے وہ فیروز کی یا اور کسی کی موجودگی سے آگاہ ہی نہ ہو۔

واپس کب چلو گے؟ ....." وہ پان کھاتے ہوئے بولی۔

"کیا واپس جاؤ گی ....." ہاں واپس جاؤں گی" ..... کس کے پاس" ....."کسی کے پاس نہیں۔

"...... لیکن واپس جاؤں گی" وہ اُٹھتے ہوئے بولی ..... کسی کو ڈھونڈنے آئی تھی" فیروز خان نے تجسّس سے پوچھا۔

وہ خاموشی سے پھر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں پھر خالی ہوگئیں۔ جیسے کسی نے ساری زندگی ان کے اندر سے کھینچ لی ہو۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لالی لگے ہونٹ ساکت ہوگئے۔

"ہاں ڈھونڈ رہی ہوں ..... لیکن کسے ..... مَیں نہیں جانتی .... مِلتا ہی نہیں ....."

اور پھر وہ زور سے ہنس دی۔ لاتعلقی اور لاپرواہی کا قہقہہ "کیا خبر پاگل ہو ..... ایسی پاگل جو پاگل نہ لگے" فیروز خان کے دل میں شک سا اُبھرا ... لیکن اس کی آنکھوں میں چمک پھر لوٹ آئی تھی اور اس کے لالی لگے ہونٹ پھر جاگ اُٹھے تھے۔ وہ ساری زندہ ہوگئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا ..... فیروز نے پوچھا۔

"بانو" لوگ کہتے ہیں۔ میرا نام میری طرح ہی خوبصورت ہے .... ہے نا ..... اور تم سوچ رہے ہو کہ مَیں ایسی ویسی لڑکی ہوں ..... جسم بیچنے والی — آوارہ — رنڈی — مجھے ہاتھ لگاؤ تو پھر پتا چلے کہ مَیں کیسی لڑکی ہوں" اُس نے سَر کو جھٹکا اپنی سفید چادر کو بڑی ترتیب سے اوڑھا اور پڑیا سے آخری پان کو منہ میں دبا کر کاغذ کی گولی بنا کر فیروز پر اچھال دی اور ہنسنے لگی۔ .... مسکراتی آنکھوں سے ..... زندہ آنکھوں سے تم تو کہتی ہو رنڈی نہیں ہو انداز تو تمہارے ان جیسے ہی ہیں" .... فیروز کو اس کی باتیں بُری لگی تھیں اس کا اپنے پر اعتماد ...... اس نے ایسی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو غیر مردوں کے درمیان لاپرواہی سے بیٹھے۔ بغیر خوفزدہ ہوئے۔ بغیر سودا کیے ..... اپنے پر مان کرتی ہوئی ..... نڈر

"رنڈیاں سڑکوں پر نہیں پھرتیں ..... کوٹھے پہ بیٹھتی ہیں۔ اگر تم نے مجھے پھر کبھی رنڈی کہا، تو مُنہ توڑ دُوں گی تمہارا .... سمجھے .... اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی جا کر سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ اس کی سفید چادر بے داغ تھی اور وہ پان کھا رہی تھی۔

یار پاگل لگتی ہے۔ یا پھر ملنگنی .... شیدا چائے والا اُسے دیکھتے ہوئے بولا، لیکن فیروز خان خاموش بیٹھا اُسے جاتا دیکھتا رہا اور ہولے ہولے مسکرانے لگا .... جیسے اُس نے کوئی بھید پالیا ہو۔ گول چکر کے گرد کھڑی لاریوں کی لائن، سامنے بازار میں بیٹھے لوگ اور

بینک کے دروازوں میں کھڑے چوکیدار سب مُڑ مُڑ کر اُسے دیکھ رہے تھے۔ اور آپس میں باتیں کر رہے تھے، لیکن بانو وہاں یوں کھڑی تھی۔ جیسے اُس کے گرد کوئی بھی نہ ہو۔ پھر ایک انگریزی بال بناتے ہوئے چھوکرا بینک سے نکلا۔ اور بانو کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا..... وہ ہولے ہولے سیٹی پر کوئی فلمی گیت گا رہا تھا۔

"کہاں جاؤ گی" وہ بولا

"جہاں میں چاہوں گی .... ۔اور کہاں جاؤں گی"..... پان کھاؤ گے ...... اس نے لڑکے کی طرف پان بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پان کی بڑی شوقین لگتی ہو"۔ . . لڑکا مسکرایا ..... "اور پان لا دوں"..... نہیں ابھی میرے پاس پیسے بھی اور پان بھی ہیں" اور جب نہیں ہوتے، کوئی نہ کوئی لے دیتا ہے۔ ضرورت نہیں ——" اور فیروز خان نے دیکھا کہ دوپہر کے سورج کی کرنیں سیدھا اس کے وجود پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ اپنی اجلی چادر میں لپٹی غیر انسانی ہیولے کی مانند اُن کرنوں میں گھلتی جان پڑتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جا کر بانو کے پاس سے اس مسخنی سے چھوکرے کو ہٹا کر خود کھڑا ہو جائے اور اُسے زور سے پکڑ لے کہ کہیں وہ اِن کرنوں میں بالکل ہی گھل نہ جائے لیکن وہ وہیں بیٹھا بظاہر سگریٹ کے تیز تیز کش لیتا رہا ..... اور پھر کئی اور لوگ بانو کے گرد اکٹھا ہو گئے ..... وہ کھڑی باتیں کر کے سب کے ساتھ ہنس رہی تھی ..... وہ خوش تھی جیسے عرصے سے ان کے درمیان ہی رہ رہی ہو....."

فیروز خان کی گاڑی کا نمبر پکارا گیا۔ اور جب فیروز خان جانے کے لیے اُٹھا، تو اس نے بانو کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کیوں ناخوش تھا..... اس کی لاری آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی قطار میں کھڑی لاریوں کے پاس سے گذرتی سیدھی لاہور جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

"ارے رُک ..... ارے رُک" بانو تیزی سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اُس نے سامنے لگے آئینے سے اُسے دیکھا اور مُسکرا دیا۔

"ارے کیسا ڈرائیور ہے تو جو اپنی سواریوں کو بھول جاتا ہے" اُس نے اُس کے ساتھ کی خالی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تیرے بڑے گاہک، تُو تو کہیں بھی جا سکتی ہے۔" فیروز خان نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور گاڑی تیز کر دی۔

بانو کا چہرہ سفید چادر میں سُرخ ہو رہا تھا۔ اس نے پٹ کھول کر زور سے باہر کو دھکیلا اور پاؤں لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"آوارہ پھرتی ہو اور نخرے دکھاتی ہو۔" اس نے زور سے بریک لگائی۔ بریک کی تیز آواز دُور تک گونج گئی۔ مسافر چہروں پر مسکراہٹ لیے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے...... بانو نے چھلانگ لگاتے ہوئے تیز غصّے سے کہا۔

"آوارہ بے شک ہوں، بدمعاش نہیں ہوں...... اور تو نے ساری زندگی میں کیا کیا۔ بندے کی پہچان بھی نہ سیکھا...... ویسے گاڑی چلاتا ہے۔ مسافروں کی پہچان سیکھ...... انسان کی اولاد"...... بانو نے زور سے چادر کو جھاڑ کر اوڑھا اور پیچھے کو چل پڑی۔

فیروز خان کے ہاتھ زور سے سٹیرنگ پر سختی سے جم گئے۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اُتر کر لاپرواہی سے جاتی اس لڑکی کو پکڑ کر سر سے اوپر گھما کر مری ہوئی چڑیا کی طرح دُور پھینک دے۔ لیکن اس نے تیزی سے گاڑی کو سٹارٹ کیا۔ اور گہرے دُھول کے بادل چھوڑتا آگے کو چل پڑا تھا۔ لیکن اگلے ہی روز اس نے اُسے دُور جاتے دیکھا تو لاری اُس کے پاس روک کر اُسے سوار کر لیا تھا اور پھر...... آج......

اور پھر اکثر ایسا ہوتا۔ وہ آتے جاتے یونہی سڑک سے ملتی پگڈنڈیوں کو دیکھتا اور اُسے بانو نظر آ جاتی تو لاری کو بے راہ ڈال کر بھی اُس کے پاس پہنچ جاتا...... اُسے لگتا تھا جیسے بن کہے ہی وہ اُس کا محافظ ہو۔ لیکن بانو نے کبھی اس کی حفاظت قبول نہیں کی تھی۔ وہ جب چاہتی راہ میں ہی اُتر جاتی اور اس کے کہنے کے باوجود بھی اگلی سیٹ کو خالی رہنے دیتی۔ اڈے پر بہت سارے مزدوروں کے درمیان کھڑی باتیں کرتی یا پھر کونے میں بیٹھی سوچوں میں کھو جاتی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سایہ اُتر آتا۔ جس میں اس کا سارا شعور کھو جاتا۔ لوگ اس کی اس کیفیت سے خوفزدہ ہو جاتے...... اور اُسے اکیلا چھوڑ دیتے۔

ایک روز فیروز خان نے پوچھا تھا...... "بانو تیرا کوئی اپنا گھر بھی ہوگا...... کب تک

یوں ماری ماری پھرو گی ....."

بانو نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا..... اور مسلسل دیکھتی رہی .... اور پھر کہا۔

" فیروز تو مجھے اپنے گھر لے جا..... وہی میرا گھر ہو جائے گا .. اور فیروز خان نے گھبرا کر لاری کو تیز کرتے ہوئے کہا تھا۔" تو سفر کی عادی گھر میں بیٹھ نہ سکے گی۔ گھر گھر ہوتا ہے لاری نہیں۔" اور بانو نے ہنس کر کہا تھا۔ لاری اتنی تیز مت چلاؤ میں زبردستی تھوڑی جاؤں گی تیرے گھر... اور پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ جیسے اپنے اندر کی چیخ کو دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کھڑکی میں سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

فیروز کیا تمہارا گھر بڑا مضبوط ہے۔ بانو نے بند آنکھوں سے ہی پوچھا تھا اور کیا وہاں ٹھنڈی ہوا تو نہیں گھستی اور دھوپ بہت جلانے والی تو نہیں ہوتی۔ فیروز نے حیران ہو کر کہا تھا۔ تم نے گھر دیکھے تو ہیں۔ جیسے سب گھر ہوتے ہیں۔ ویسے ہی میرا گھر ہے.... چھوٹا سا کچا گھر۔

میں ایسے گھر میں کبھی نہیں رہی اور تو تو جانتا ہے ..... لاری جب چلتی رہے تو تیز ہوا بہت دھول اڑاتی ہے اور گرمیوں میں دھوپ بھی بہت چبھتی ہے...... اس کی آواز میں اداسی تھی.. ..... محرومی اور بے چارگی تھی۔ کوئی نہ کوئی تو تجھے ایسا گھر دے ہی دے گا ..... تو دل کو راضی تو کر بانو ......" ابھی میرا دل نہیں مانتا فیروز خان ..... جب میرا دل چاہے گا، میں کسی کے ساتھ بھی چلی جاؤں گی ....." اور اس نے نیا پان منہ میں ڈالتے ہوئے ہمیشہ کی طرح خالی کاغذ کی گولی فیروز خان پر اچھال دی اور ہنسنے لگی اور اڈے پر اتر کر بغیر کچھ کہے چلی گئی تھی اور فیروز خان نے سوچا .... مجھ میں اتنی سہارا اور ہمت نہیں۔

بانو آج ہمیشہ سے زیادہ اداس تھی۔ وہ زندگی کا ویرانہ جو کبھی دھول بھرا میدان بن جاتا۔ اور کبھی تیز چلتی دور دور تک لیٹی تنہا سڑک کے کنارے کھیتوں پر بہتی ہوائیں اس کی سفید چادر اس کے جسم سے لگی ہوئے ہولے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کا ذہن دھندلا رہا تھا.... شاید یہ آنکھوں میں آتے آنسو تھے۔ یا دل کا بھاری پن.....

میں کس کو کھوجتی ہوں.... مجھے کہاں جانا ہے...... مجھے کب تک چلنا ہے...

.....مَیں اکیلی کیوں ہوں۔

اور پھر ہمیشہ کی طرح ویرانی اور اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھوں اور دل کو گہری دُھول میں چھپا دیا..... سوچ کی تمام پگڈنڈیوں آپس میں اُلجھ رہی تھیں..... اُسے تلاش تو تھی..... تبھی تو وہ اَن گنت زمانوں سے یوُں بھٹک رہی تھی..... لیکن وہ کیا تلاش کرتی پھر رہی تھی کسے..... اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا..... کوئی اپنا..... جو اُس کی کھوج کرے جس کے لیے وہ جوگن ہے..... بس ایک ہجوم تھا، جس میں کوئی اس کا اپنا نہ تھا۔ زمانوں پہلے نہ جانے کب اُسے اپنے گرد پھیلی دھرتی کا احساس ہوا تھا۔ اور اس نیلے آسمان کا جو اس گدھوں کی قطار کے آگے پیچھے چھایا رہتا ہے جس پر اس کا قبیلہ لامتناہی سفر پر رواں رہتا...اور گدھوں کے پاؤں سے اُٹھتی دھول جو اس کے بالوں اور مُنہ میں گھُس جاتی اور پھر رات کو زمین میں گڑھا کھود کر بنائے گئے چولھے سے اُٹھتا دھوآں اور گرمی..... اور گندم کی روٹی سے اُٹھتی سُوندھی سی باس جو اس کے گرد پھیلی دھرتی سے بھی اٹھتی جان پڑتی..... لیکن رات کو جب مند مند بہتی ہوا کھلے میدانوں میں سرگرداں ہوتی اور بہت اوپر چمکتے تاروں تلے وہ کھلی آنکھوں سے جاگتی رہتی تو اسے اپنا آپ اکیلا لگتا..... اس کے قبیلے میں رشتوں کا واضح تصوّر نہیں تھا..... وہ سب ایک دُوسرے سے منسلک لیکن علیحدہ علیحدہ لگتے یا شاید وہ ہی سمجھ نہیں سکتی تھی اور پھر اس کا دل خوف سے بھر جاتا۔ اور وہ چاہتی کہ ان چیتھڑوں سے بنی چھت کی بجائے کوئی اس کے چاروں طرف مضبوط سی دیوار بنا دے اور وہ اس کے اندر چھپ جائے..... اس وسیع سیاہ آسمان سے جس کا کوئی کنارا نہ لگتا اُسے ڈر لگتا اور اس دھرتی سے بھی جو اس کے پہلو سے نکل کر بڑھتی ہی جاتی کسی چھلاوے کی طرح..... وہ مضبوطی سے آنکھیں بند کر لیتی اور بند آنکھوں میں مضبوط دیواریں اُبھر آتیں اور پھر وہ سو جاتی۔ جیسے کسی نے اپنے حصار میں لے لیا ہو..... بچا لیا ہو..... وہ سب سے الگ ہو جاتی۔ اونچی اور ان کی دسترس سے دُور۔ جاگنے پر ان دیواروں کی موجودگی کا احساس نامعلوم طریقے سے اُسے ہوتا رہتا جیسے وہ دیواریں سرد ہو گئی ہوں اور وہ ان میں اُتر کر چُپ چاپ لیٹ گئی ہو.... ....یا پھر لُو کے تیز جھونکے اس کو جھلس رہے ہوں اور وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہانپ

رہی ہو..... وحشت کا احساس اس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ اور وہ خواہش کرتی کہ کسی سچ مچ کی دیوار کو چھو کر دیکھے..... چاہے وہ کسی کے گھر کی ہی دیوار ہو۔ اُسے پختہ دیواریں اچھی لگتی تھیں اور ویرانہ اُسے ڈراتا تھا..... خوفزدہ کرتا تھا..... شہروں کی گہما گہمی سے بھری سڑکوں سے گذرتے اس کا دل چاہتا۔ وہ وہیں رُک جاتے۔ ان کے درمیان چھُپ جائے۔ اُسے کھُلی جگہوں میں سردی اور خوف دونوں تنگ کرتے تھے۔ ایک روز اس نے ماں سے کہا تھا" ماں ہم گھر بنا کر کیوں نہیں رہتے۔ ایسا گھر جس کی دیواریں ہوں۔ جس میں ہوا سائیں سائیں کرتی نہ گزرے۔ ماں نے جواب دیا تھا" دیواریں بندے کو قید کر دیتی ہیں۔ اور قید میں انسان گھُٹ جاتا ہے... ..... اور تو کیوں پوچھتی ہے ..... کیا تجھے دیواریں اچھی لگتی ہیں"..... "ہاں ماں مجھے کھُلے میں ڈر لگتا ہے"..... ماں بس ہنس دی تھی اور وہ گدھے کے اُوپر بیٹھی ہچکولے لیتی ماں کی ہنسی سے بھی ڈر گئی تھی جیسے ماں ہوا کے جھکڑوں میں پھنسی چڑیل ہو جو ویرانوں میں بستی ہیں۔ وہ آبادی کے پاس سے گذرتی گھروں کو دیکھتی اور پھر اُس کا جی چاہتا کہ وہ بھاگتی ہوئی ان تک جائے، لیکن جب وہ اپنے خواب سے چونکتی تو دیکھتی کہ وسیع ویرانے میں سوائے گدھوں کی گردنوں میں گھنٹیوں کی آواز کے اور کوئی بھی آواز نہ ہوتی اور وہ ڈر کر اپنی گردن ہاتھوں میں چھپا لیتی ..... جیسے ان جانے ہاتھوں سے اپنے آپ کو بچا رہی ہو۔

اور پھر ایک دن جب ان کا پڑاؤ ایک شہر کے نزدیک ہوا تو روشنیاں اسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی لگیں۔ اور دیواریں جیسے اُسے بلا رہی ہوں۔ اپنے میں چھپا رہی ہوں۔ وہ سب سے چھپ کر شہر کی گلیوں میں گم ہو گئی..... یہ دیواریں تو اس کے خوابوں کی تخلیق تھیں..... بالکل اپنی..... وہ خاموشی سے ان دیواروں کے درمیان چلتی رہی۔ ان کو چھوتی ہوئی..... اور وہاں چلتے چلتے اسے ہوا کی آواز بھی سنائی نہ دی...... اسے چھکڑوں کی بے نام دیواریں ایک دم بھول سی گئی تھیں۔ اور ان لوگوں کا پیار بھی جو برسوں اُس کے ساتھ ساتھ چلے تھے..... گدھوں کی گردنوں میں پڑی گھنٹیاں، چولھوں سے اُٹھتا دُھواں جو خاموشیوں اور ویرانیوں میں زندگی کی علامت بن جاتا تھا۔ اور دُھول میں اَٹا اس کا اپنا وجود۔ اسے اس دھول سے نفرت تھی۔ اُسے اس مسلسل سفر سے نفرت تھی...... اس نے پیار سے دیواروں کو دیکھا اور آگے ہی

بڑھتی رہی ...... اور تب اسے اپنی گندگی کا احساس ہوا ....” میری چادر گندی ہے۔ میرے پاؤں گردآلود ہیں “..... اسے ان دیواروں کے اوپر تنا آسمان بھی اچھا لگ رہا تھا..... چھوٹا سا گرفت میں آنے کے قابل ..... اور ہوا جو صاف ستھری تھی۔

وہ خاموشی سے چلتی ایک دوکان کے سامنے کھڑی ہوگئی ...” صابن گندگی دھو دیتا ہے“.. .... میری چادر گندی ہے، مجھے صابن دو “... اُس نے دوکاندار کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اور دوکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا ” صابن پیسوں سے آتا ہے۔ پیسے ہیں تمہارے پاس ... “ اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور اُسے بھوک بھی تو لگی تھی۔ شاید روٹی بھی پیسوں کی آتی ہے ۔ اُس کے ذہن میں کوئی چیز بھی واضح نہیں تھی ..... گندی باتیں ..... بھوک .. صاف چادر .... پاؤں کی گرد .... پھیلا ہاتھ ..... اور یہ دیواریں بھی تو پیسوں سے بنتی ہوں گی .... وہ شہر کے چوک میں ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگئی ...... وہ مسکرانا چاہتی تھی .... اپنے خواب کے اتنا نزدیک ..... لیکن اسے لگا جیسے وہ ایک بار پھر... گدھوں کی پاؤں سے اُٹھتی دُھول میں سرتاپا بھر گئی ہو ...... اس نے اپنی ہتھیلی پر پڑے پیسوں کو گِنا اور صابن لینے چل پڑی ..... دوکاندار مُسکرا رہا تھا۔ ذومعنی انداز سے ..... تو نے بُرا منایا ... صابن کا کیا ہے .... تو ایک کی بجائے دو لے جا .....

” مجھے صرف ایک ہی چاہیے “... اس نے غصّے سے کہا ..... اسے لگا جیسے بھیک کے لیے پھیلا ہوا ہاتھ۔ اُس کے کندھے کے ساتھ بوجھ کی طرح لٹک رہا ہو۔ اُس نے جلدی سے اپنی ہتھیلی پر رکھے پیسے دکاندار کے سامنے گرا دیئے ..... اور صابن لے کر شہر سے باہر چل پڑی ..... اُس کے ذہن پر پھر گہری غنودگی چھا رہی تھی ..... گلیاں ..... لوگ .... روشنیاں ... . باتیں ...... مردوں کے قہقہے ..... سب کچھ اُس کے ذہن کے کہیں اندر دفن ہوگیا تھا ..... صرف اُجلی چادر اس کو نظر آرہی تھی، جو اس کے چاروں طرف مضبوط دیوار کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

شاید میں نیا جنم لے رہی ہوں .... کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ کہانیاں جو قبیلے کا اندھا بابا سُنایا کرتا تھا ...... دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں ..... وہ ہولے سے مسکرائی

چاند کی روشنی میں اس کے ناک میں پڑا موتی۔ اس کے دامن سے بندھے چاندی کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو اور پٹلے سے بندھی ننھی ننھی گھنٹیاں ایک سحر بنکر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ بڑی نہر کے پُل سے اُتر کر اُس نے اپنی گندی چادر کو خوب مَل مَل کر دھویا..... اپنے وجود کو بھی .... اُوپر چاند سرکنڈوں کے اُوپر جھول رہا تھا۔ اور دُور شہر کی اِکّا دُکّا روشنیاں اُسے اُمّید کے دیوں کی مانند بڑی اپنی اپنی لگ رہی تھیں.... اور آج نہ جانے اس ویرانے میں اُسے ڈر کیوں نہیں لگ رہا تھا۔ یہ ویرانہ اس کا اپنا تخلیق کیا ہوا تھا..... اُس نے نہر کے کنارے چھوٹے سے کٹاؤ میں ٹھہرے پانی میں جُھک کر اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اور اسے وہ ساری کہانیاں سچ لگیں، جن میں پرانے وقتوں کی پُراسرار رُوحیں بار بار پیدا ہوتی ہیں..... اُسے اپنا اُجڑا وجود بڑا اچھا لگ رہا تھا.... نیا نیا اور نکھرا ہوا.... حالانکہ اس کے سائے میں چاند کی جھلملاہٹ کے علاوہ سیاہی بھی گھلی ہوئی تھی..... نیا نیا اور نکھرا ہوا اُس نے وہ سب کچھ دُھو ڈالا تھا۔ جس کا دھونا اُس کے اپنے بس میں تھا... لیکن وہ مردوں کی آنکھوں کے گندے اشاروں، گندی باتوں کو دُھونے کی طاقت نہیں رکھتی تھی..... وہ اتنی ہی دیر ہاتھ پھیلاتی جتنی دیر میں اس کی زندگی کی چند ضروریات کے لیے پیسے اکٹھے ہو جاتے ..... اور پھر وہ چپ چاپ چلتی کھیتوں کی ہریالی یا گھنے درختوں میں اپنے آپ کو چُھپا لیتی ..... اور ہمیشہ کی طرح چار دیواریں خود بخود اُس کے گرد تن جاتیں .... لیکن زندگی کے اس نئے سفر نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا..... وہ اس ویرانی کے اکیلے پن میں بھی محفوظ نہیں تھی ..... تب وہ خاموشی سے آبادی سے بچ کر چلنا شروع کر دیتی .... لیکن وہ کب تک یوں چل سکتی تھی اور اس نے پھر ایک نیا طریقہ نکالا..... وہ بہت سارے مردوں کے بیچ بیٹھ جاتی .... اور اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ..... وہ سب اس سے باتیں کرتے لیکن کوئی بھی آگے نہ بڑھ سکتا۔ کیونکہ کوئی دوسرا ہمیشہ اس کی عزّت کا محافظ بن جاتا.... اور ..... لیکن وہ پختہ چار دیواریں .... کون مجھے دے گا یہ گھر..... وہ باتیں کرتے کرتے سوچنے لگتی ..... کہاں ہیں یہ دیواریں جو میرے نام سے کھڑی ہیں..... اور وہ سردیوں میں لاریوں کے اڈے پر بہت سارے لوگوں کے ساتھ بیٹھی الاؤ کے گرد ہاتھ سینکتی سوچوں

کی راہ میں کھڑی ہو جائیں۔ اس کی شدید خواہش کی دیواریں۔

شاید میں نے یہ دوسرا جنم اس لیے ہی لیا ہے کہ یونہی پھرتی رہوں .... پھر وہ راہ جاتی کسی لاری کو اشارہ کرتی اور بیٹھ جاتی ..... ہاں اگر کبھی اس کی سفید چادر پر کوئی دھبہ لگ جاتا، تو وہ کسی نہر کے پاس اُتر جاتی اور چادر کو دُھونے لگ جاتی ..... اسے دُھول اور گندگی سے نفرت تھی ..... گہری نفرت ..... لیکن وہ اپنے پاؤں پر پڑی دُھول کو کیا کرتی ...

..... وہ لوگوں کے کردار کی گندگی بھی کیونکر دھوتی ..... لیکن اُس نے اپنے آپ کو بچانا سیکھ لیا تھا ..... اور لاریاں تو آتی جاتی رہتی تھیں ..... اسے تلاش جاری رکھنی تھی۔

" میں تھک گئی ہوں "..... اس نے قصبے کے بینک کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے کہا...

.... اسے یہ بینک کی عمارت ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی .... پختہ اور مضبوط جیسے .... تحفظ دیتی ہوتی .... زندگی کی بے یقینی سے ..... زندگی کے گرد و غبار سے ..... اس نے سر اوپر اٹھا کر سامنے دیکھا ..... سامنے فیاض کھڑا تھا ..... اپنی چھوٹی سی آنکھوں سے ہمیشہ کی طرح اسے دیکھتا ہوا .....

" بانو تھک گئی ہو کیا "... اس کی آواز نہ جانے کیوں لرز رہی تھی۔

" ہاں میں تھک گئی ہوں .... بہت چلی ہوں نا آج "

" کیا کوئی لاری نہیں ملی "...؟ اس کی آنکھوں میں نہ جانے بانو کو دیکھ کر کونسی روشنی اُتر آتی تھی .... اور بانو ہمیشہ کی طرح آنکھیں جھکا کر زمین پر کوئی نہ کوئی لکیر کھینچنے لگتی تھی...

.... لیکن آج اس نے سر نہ جھکایا ..... اُسے فیاض کی آنکھوں کی روشنی اچھی لگ رہی تھی ...

.... یہ مجھ سے نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے۔

لیکن آج اس کے وجود کے ساتھ اس کا دل بھی تھک گیا تھا .... کیا پان کھاؤ گی...

... فیاض نے جیب سے پان کی پُڑیا نکالتے ہوئے پان اس کے سامنے رکھ دیا۔

" بیٹھ جاؤ ..... وہ پان کو مُنہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

" نہیں مجھے کام ہے "

" کیا کام کرتے ہو "؟... بانو اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔

"ڈاک خانے کا..... لوگوں کے خط، تاریں.... اور .... منی آرڈر.... سارا کام میں اکیلا کرتا ہوں.....

اور بانو کا دل چاہا کہ وہ اپنے قبیلے والوں کو خط لکھوائے.....

"لیکن کیا فائدہ اب.... بہت دن گزر گئے۔ بہت سے دن.... کتنا عرصہ ہوا ہوگا... لیکن یاد کرتے پر بھی چہرے اور گڈمڈ ہو گئے تھے.... اور اب کیا فائدہ.... وہ کوشش کے باوجود یاد نہیں کر پائی تھی ــــ چلو گے میرے ساتھ.... بانو نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟...." فیاض حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

"کہیں نا کہیں تو جانا ہی ہے" اُس نے چادر کو زور سے جھاڑ کر اُوڑھ لیا۔

"ٹھہرو.... میں ابھی آیا۔ دروازہ بند کر لوں۔ میرے گھر چلو گی؟ وہ مڑا اور بھاگتا ہوا ڈاک خانے کو چل پڑا..... گھر اور دیوار..... سے بھی بن سکتا ہے۔ میرے پاؤں پر کتنی دھول ہے..... میرے کپڑوں پر کتنی دھول ہے.... اُس نے اپنے دامن کو زور سے جھٹکا.... ننھے ننھے گھنگھرو بج اُٹھے..... سامنے سورج کی کرنیں اس کے زیوروں میں گھس کر منعکس ہو رہی تھیں اور اس کا سانولا خوبصورت چہرہ کرنوں میں کھلتا جان پڑتا تھا، لیکن مایوسی کا سیاہ سایہ اس کے دل کے گرد اُمڈ رہا تھا.... مجھے کہاں جانا ہے..... میں کہاں جاؤں..... اُسے زمانوں بعد آج وہ چھیتڑوں کی بنی چھت یاد آ رہی تھی . . . .

اُسے گذرے زمانوں کی باتیں لگ رہی تھیں .... گدھوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں اور تیز ہواؤں کی سرسر جو ویرانوں میں اُگے سرکنڈوں سے گذرتی اور وسیع نیلا آسمان .... ساری باتیں تیز نوکیلے کانٹے کی طرح اُس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں.....اور وہ جو آنسوؤں کی سیلن سے واقف ہی نہ تھی، یوں رو رہی تھی۔ جیسے اُس کے اندر کا بند ٹوٹ گیا ہو اور وہ اس کے تُندی میں بہتی چلی جا رہی ہو۔

"کہاں جانا ہے بانو...." فیاض نے آکر پوچھا...." ارے تم رو رہی ہو.... مت رو... .... وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا..... لیکن وہ رو رہی تھی.... فیاض نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے آؤ چلیں .... وہ پریشان ہو رہا تھا....

وہ خاموشی سے کھڑی ہوگئی ..... اُس کی گالیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں ..... اُس نے اپنا ہاتھ فیاض کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔ وہ تھک چکی تھی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اُس بازار سے باہر نکل گئے۔ لوگ خاموشی سے انھیں جاتا دیکھتے رہے۔ وہ بانو کو جانتے تھے اور بانو کو پکڑنا آسان نہ تھا ....

ذخیرے کے گھنے درختوں کے راستوں پر جاتے ہوئے سوکھے پتّوں سے اَٹی پگڈنڈیوں پر بانو کے پاؤں گردآلود ہوگئے اور اُس کی سفید چادر کا کونا اُس کے پیچھے گھسیٹ رہا تھا.. .... بانو کو لگ رہا تھا، جیسے اُس کے دل کی ساری طاقت کسی انجانے ہاتھ نے نچوڑ لی ہو۔ اور بے اَنت ویرانی اور تنہائی۔ اسے لپٹنے کے لیے بڑھ رہی ہو .... وہ دونوں ایک دُوسرے کی طرف دیکھے بغیر بڑھ رہے تھے۔ فیاض کا دل اَن ہونی سوچوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوچیں جن میں خوشی اور خوف دونوں شامل تھے ..... بانو اس کے ساتھ تھی۔ بانو جو سب کی تھی اور کسی کی بھی نہیں تھی .... بانو جس کے لیے بینک کے بابو ..... لاریوں کے ڈرائیور ..... چھابڑیوں والے چھوکرے اور آتے جاتے مسافر سبھی بڑے فراخدل بن جاتے تھے۔ لیکن بانو کو ان کی سخاوت کی ضرورت ہی نہیں تھی .... وہ تو بس پان کی پڑیا اور روٹی کھا کر بغیر شکریہ ادا کیے آگے کو چل پڑتی تھی .... اور لوگ اُس کے خوبصورت چہرے کی جھلک اور اس کے لالی بھرے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو غنیمت سمجھ کر کھسیانے ہو کر ہنس پڑتے تھے ..... اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بانو ضرورت سے زائد پیسے پاس کھڑے فقیر کی جھولی میں ڈال دیتی اور اپنا آخری پان بھی زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیتی ..... اور خالی ہاتھوں سے آسمان کو دیکھنے لگتی اور لوگ سمجھنے لگتے کہ بانو جیسے کبھی ہوشمند نہ تھی۔ ایسے وقت میں بھی اسے اپنی اُجلی چادر کا خیال رہتا ..... اور وہ بڑے دھیان سے اُسے سمیٹ کر اپنے گرد کس لیتی۔ دیوار بنا لیتی اور اب یہی بانو ایک معصوم بچی کی طرح روتی ہوئی فیاض کا ہاتھ پکڑے جا رہی تھی۔

تکیہ بھولا شاہ کے حجرے میں نم آلود اندھیرا تھا۔ سبز اور بوسیدہ جھنڈوں پر لگا سنہرا گوٹا ماند پڑ چکا تھا .... سوکھے ہوئے پھولوں کے ہار کونے میں لٹکے ہوئے تھے جن کو گرد نے بدرنگ کر رکھا تھا .... بانو چپ چاپ اندر جا کر بیٹھ گئی۔ اور باہر درختوں کے درمیان سے بہتی ہوا

میں تازہ بنی ہوئی شراب کی تیز بُو بھی۔ شیشم کے پتّے کبھی کبھار گرتے اور پرندوں کی تیز آوازیں فضا کو شور سے بھر دیتیں۔

"مجھے پیاس لگی ہے بابا"..... اس نے اندھیرے کونے میں بیٹھے بابا سے کہا..... بانو کی آنکھیں ابھی تک نمی سے دھندلی ہو رہی تھیں۔

"تو ازل کی پیاسی ہے بانو..... اور اپنی پیاس کو جانتی بھی نہیں"..... بابا ذومعنی انداز سے بولا۔

"نہیں بابا..... میں نے کبھی پیاس محسوس نہیں کی..... بس میرا کوئی بھی نہیں..... میرا کوئی گھر نہیں..... بانو نے آج پہلی بار پوری سچائی کے ساتھ اپنی کمی کو محسوس کیا تھا۔ اور اسے اپنے اِردگرد سے خوف آ رہا تھا۔

"فیاض اندر آ جاؤ"..... اُس نے ڈر کر فیاض کو پکارا، لیکن فیاض حجرے سے باہر بنچ پر بیٹھا سلور کے گندے گلاس میں شراب پی رہا تھا..... بانو کی خوب صورتی کی سوچ میں ڈوبا ہوا..... خوشیوں سے تپا ہوا۔

"بچّہ اسے بھی دو"..... بابا مُسکرا کر بولا۔

بانو کے اندر کا خوف سردی کی لہر بنکر اس پر کپکپی طاری کر رہا تھا۔ اور اسے لگ رہا تھا اور جیسے حجرے کا اندھیرا آسمان کی لامتناہی نیلاہٹ اور زمین پھیلاوا بنکر اُسے ڈرا رہی ہو۔ اُس نے تو زندگی بڑی چوکس ہو کر گزاری تھی۔ لو پی لو بانو..... تمہیں سردی نہیں لگے گی۔ فیاض نے ایک چھوٹا سا گلاس زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیا ہے یہ..... کیا ہے یہ....." بانو خوفزدہ ہو کر بولی..... اُسے فیاض سے بھی ڈر آ رہا تھا..... لیکن فیاض کا ہاتھ گلاس کو اُس کے کھُلے مُنہ میں انڈیل رہا تھا..... اور بانو کو لگا جیسے اندھیرے کا سیاہ بھوت اپنے پنجے ڈھیلے کر رہا ہو۔ جیسے اس کی اندر کی مضبوطی بھی ڈھیرے ڈھیرے اس کی جان سے نکل رہی ہو۔ جیسے اس کے پاؤں زمین سے اُکھڑ گئے ہوں۔ اور وہ کٹھ پتلی کی طرح فضا میں جھول رہی ہو..... اور پھر اُسے لگا وہ ایک دم کانٹوں پر گر پڑی ہو..... درد کی تیز ٹیسیں اس کے وجود سے اُٹھ رہی ہوں..... وہ رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں

مار رہی تھی..... خوفزدہ..... فیاض اور بابا کے قہقہے اس کی چیخوں میں گھلتے جارہے تھے.....
..... باہر پرندے چیخ رہے تھے..... ہوا چیخ رہی تھی..... اور اُسے فیروز خان کی آواز سنائی
دی..... جو کہہ رہی تھی..... رنڈی..... رنڈی..... اور بانو چیخ رہی تھی..... "نہیں میں رنڈی
نہیں ہوں..... چھوڑ دو..... چھوڑ دو..." لیکن پولیس ناجائز شراب کشید کرنے والی بھٹی پر چھاپہ
مارتے ہوتے اسے بھی پکڑ کر لے گئی تھی..... بابا سائیں نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا.....
..... اور بانو کا نشے میں جھولتا ہوا وجود دیواروں کی تلاش میں اپنے چاروں طرف بازو
پھیلا رہا تھا..... پناہ کی تلاش.....!

دُوسری عورت

میری رُوح کے اندھیرے میں اُس دستک کی آواز صدائے بازگشت کی مانند گونج رہی ہے۔ اور مَیں ڈری ہوئی بیٹھی ہوں۔ وہ دستک لہر در لہر بڑھ کر مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے میرے سب طرف محیط ہوتی جا رہی ہے۔

"کھول دو، کھول دو .... سرگوشی ہوا کے ساتھ اندر آ رہی ہے۔ کھول دو ..... کھول ....
.... مجھے اندر آنے دو ...... مجھے ایک روز اندر آنا ہی ہے تو پھر اور رات کیوں .... آج کی رات ہی وہ رات کیوں نہ بنے، تم ہمیشہ سے میری منتظر تھیں، اور آج جب میں آ گیا ہوں تو پھر یہ سوچ کیوں؟ زندگی کو سمجھو ..... زندگی کے نئے رُخ کو پہچانو، تمہاری روح تشنہ ہے۔"

میرے دل میں یہ کونسی آواز گونج رہی ہے؟

کیا مَیں اپنے گھر کے بند کواڑ کھول دوں؟

کیا مَیں اپنے دل کے بند کواڑ کھول دوں؟

مجھے یہ فیصلہ خود ہی کرنا ہے، اذیّت کے ان جان لیوا لمحوں میں مَیں اکیلی ہی ہوں، میرے چاروں طرف سیاہی ہے۔ میرے اندر، میرے باہر، میری رُوح میں، میری سوچوں پر......
.... گھور اندھیرا اور جسم کا جاگتا جہنّم۔

دستک کی گونج بڑھ کر ایک شور بنتی جا رہی ہے۔

وہ ہاتھ مجھے میری طرف بلا رہے ہیں، میرا اپنا آپ جس کو قدیر نے بے اعتنائی کے ساتھ قدموں

تلے روند ڈالا ہے اور خود دوسری عورتوں کے جسم میں لذتوں کی اندھی کھائیاں عبور کرتا مجھ سے بہت دُور چلا گیا ہے ——— مَیں اگر اسے آواز بھی دُوں تو میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی ، کیونکہ اس کے کان دوسری عورت کے مترنّم قہقہوں سے بند ہیں ، وہ مجھے مُڑ کر نہیں دیکھے گا.....

یہ دُوسری عورت ..... یہ دوسری عورت ہمیشہ میری زندگی کے سویروں میں اندھیرے کا وجود بنکر موجود رہی ہے۔ مَیں نے ہمیشہ اس سے مات کھائی ہے۔

دستک کی دھمک اب میرے اندر پیدا ہو رہی ہے اور اگر بڑھ کر مَیں نے آنے والے کو راہ دے دی ، تو مَیں خود ایک عمیق غار میں گر پڑوں گی —— شاید اس غار میں گرنا میرا مقدّر رہے۔

مجھے دروازہ کھول ہی دینا چاہیے۔ قدیر کا انتظار عبث ہے ، لیکن یہ میری آواز تو نہیں .....

..... میرے اندر ایک دوسری عورت چھپی بیٹھی ہے ، اور مجھے اس دوسری عورت سے شدید نفرت ہے۔ لیکن اب وہ طنز بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لی ہیں ، پردہ میرے اندر سے نکل کر میرے مقابل کھڑی ہو گئی ہے۔ میں اُس کے وجود کے اندر ایک موہوم نقطہ بن گئی ہوں۔

"ٹھہرو مجھے سوچنے دو ، مجھے کچھ تو مہلت دو" مَیں چیخ رہی ہوں۔ دُوسری عورت میری بات نہیں سُن رہی ..... وہ کہہ رہی ہے " وہ چلا جائے گا۔ وہ جو میرے جہنّم سے پیدا ہوا ایک فرشتہ ہے ، وہ جو میرے سُوکھے لبوں کو آبِ حیات سے تر کر دے گا ..... مَیں اکیلی ان ظلمات کو پار نہیں کر سکتی ..... مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے " دُوسری عورت تن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ میں اُسے نظر نہیں آ رہی ہوں۔

قدیر کہاں ہے ، مَیں نقطہ بنی موہوم آس لیے ایک مانوس آہٹ کو سُننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ..... کس قدر سنّاٹا ہے —— ویرانی —— تنہائی —— مَیں عورت ہوں ..... سچی محبّت کی تلاش میں سرگرداں ..... محوِ سفر —— ایک پاک خزانے کی گراں بار امانت لیے۔ اور قدیر نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اب مَیں کس قدر تھک گئی ہوں ..... یہ بوجھ میری گردن سے لٹکا ایک مہیب پتھر ہے۔ قدیر نے کہا تھا " زمانے کی رفتار نے فرسودہ رسموں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ چھوڑ دو یہ آنسو بہانے ، مَیں تمہارا قیدی نہیں بن سکتا اور پھر میرا کاروبار بھی تو ہے۔ مجھے باہر کے ملکوں کے

دورے کرنے پڑتے ہیں۔ کاروبار کے لیے یہ ضروری ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ باندھے پھروں گا، تو میرا کاروبار متاثر ہوگا، باہر کے ملکوں میں زندگی کی اقدار یہاں سے بہت مختلف ہیں ...... یہ فضول سا ملک اور یہاں کی بیہودہ عورتیں ..... پر تم ان سب باتوں کو پسند نہیں کروں گی۔
میں نے اُس کے غصّے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔
"قدیر ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے تم ایسا جذبہ ہو ہر آن ایک نیا روپ بدلے۔ تم میرے لیے بہت ہی پرکشش ہو، اِس لیے کہ تم میرے ہو، میرا دل تم سے بھرا نہیں۔ میں تو ہمیشہ ہمیشہ تمہاری پرستش کرسکتی ہوں ..... میں درد کے باوجود مسکرا رہی تھی۔ اس لیے کہ میں مسکرانا چاہتی تھی۔ سب کچھ کھو دینے کا خوف بہت جان لیوا ہے۔ وہ سب کچھ جو ہماری تمام ہستی کی تکمیل کی بنیاد ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا .....
بھئی میں کب کہتا ہوں کہ تم مجھے نہ دیکھو، لیکن میں عام مردوں کی طرح یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم کو فضول بندشوں میں جکڑ دوں۔ میں تمہیں وہ آزادی دیتا ہوں، جو انسان کا بنیادی حق ہے۔ تم اپنی اس آزادی کو استعمال کرسکتی ہو۔ دیکھو نا میں فطرت کی کمزوریوں کو سمجھتا ہوں۔ خود تو میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں، میں تم پر وہ پابندیاں کیوں لگاؤں جن کی میں حفاظت نہیں کرسکتا" وہ ہنس پڑا تھا ...
شاید یہ سچ ہو، شاید یہ سچ ہو کہ قدیر مجھے بھی آزادی کی اس راہ پر چلنے کا کہہ رہا ہو جس پر وہ خود جا رہا ہے ..... "قدیر کیا یہ سب باتیں تم سچائی اور دیانت داری سے کہہ رہے ہو؟" میں نے حیران ہوکر اُس سے پوچھا تھا ...... "کیا تم ایک عورت کی فطرت اور اس کی پاکیزگی نہیں جانتے ؟ .....
... کیا تمہیں یقین ہے کہ میں آسانی سے اُس راہ پر چل پڑوں گی۔
قدیر نے کندھے اُچکائے تھے اور بے یقینی اور شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
"میں کیا کہہ سکتا ہوں ؟ .... مجھے تمہارے متعلق کیا پتہ ؟ آخر تم کسی طور تو اپنا وقت گزارتی ہوگی .... کسی طور بھی" اور وہ لاپرواہی سے کھانا کھاتا رہا تھا۔
"کیا عورت کا جسم ایک ایسا ڈھیر ہے جہاں مرد اپنی پسندیدہ چیزوں کو تلاش کرسکتا ہے، اُسے بکھرا سکتا ہے، اُسے روند سکتا ہے" میں بےبسی سے سوچتی رہی تھی۔ میں قدیر کو کسی بات پر بھی یقین نہیں دلا سکتی تھی، لیکن میں جانتی تھی قدیر کو معلوم ہے کہ میں اُس راہ پر جو وہ بظاہر بڑی

فراخدلی سے میرے لیے کھلی چھوڑ رہا تھا، نہیں چلوں گی .... میں آج تک اُس کے واپس آنے کی منتظر رہی تھی، لیکن آج قدیر نے انتہائی بے حسی اور بے رحمی سے میرے پندار کو مجروح کیا تھا.. .... میں نے بظاہر اپنے اندر کرچی کرچی ہوتے دل کو مضبوطی سے تھام لیا تھا .... اور پھر میرے اندر قدیر کے اعتماد کو ٹھوکر دل سے اُڑا دینے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی۔ میں اس کو وہ چرکا لگانا چاہتی تھی جس کو دیکھ کر وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھے اور میں مُسکرا دوں .... مجھے اپنے اندر ایک نئی عورت کی موجودگی کا احساس ہوا تھا ... یہ دُوسری عورت میرے اندر نہ جانے کب سے چھُپی بیٹھی تھی۔ لیکن میں ڈر گئی تھی ...... کیا میں ماں کی طرح قدیر کو بھی اپنے دِل سے دُور رکھنے کی کوشش کرونگی۔ اور ناکام رہوں گی ..... مجھے قدیر کی خوشبو سے بھی جُدا ہونا پڑیگا۔ کیا میری حیات کے شگوفے مُرجھا کر بکھر جائیں گے ...... اور میرا دل ایک دفعہ پھر گذرے وقت کی پگڈنڈی پر چلتا چلتا اُس دروازے پر رُک گیا تھا جس کے اندر ماں رہتی تھی، میرا دل چاہا تھا کہ میں چلی چلتی ماں کی گود میں چھُپ جاؤں .... میں قدیر کو نہیں بتا سکتی تھی کہ میرے اندر موجود دوسری عورت مجھے ڈرا رہی ہے ...... میں اِس دُوسری عورت کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی .... میں قدیر سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اُس کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی تھی، لیکن ہمیشہ مجھے وہی کرنا پڑا ہے جس پر میرا یقین نہیں ہوتا ..... مجھے ہمیشہ اُن لوگوں سے بچھڑنا پڑا ہے جو مجھے رگِ جاں سے بھی قریب تر لگتے تھے۔

قدیر ایک لمبے دورے پر جا رہا تھا پر اُس نے مجھ سے کوئی محبت بھری بات نہیں کی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا اور میں جو اپنے جسم کی امانت کو سمیٹے اُس کی راہ تک رہی تھی، مایوس ہو گئی تھی، مایوس ہو گئی تھی، قدیر دُوسرے لوگوں سے اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں ایسی کوئی جوت نہیں تھی جس کی روشنی میں میں آنے والی تنہا راتوں کو جگمگا سکوں، میں ان لمحوں کے خوف سے سفید ہو رہی تھی جو مجھے اپنے کمرے میں اکیلے گذارنے تھے۔ اِس اُمید کے بغیر کہ رات کے کسی وقت بھی قدیر آ سکتا تھا۔ اور مجھے اُس کا انتظار کرنا ہے، پھر وہ چلا گیا اور میں اپنے دُکھ کے ساتھ تنہا رہ سکتی ..... میں نے اپنے اندر اُمنڈتے بے عزتی اور نفرت کے لاوے کو بڑی مشکل سے دبا دیا تھا۔ قدیر کتنی آسانی سے میری ذات کی نفی کر گیا تھا۔ اُس نے مجھے جاتے ہوئے خدا حافظ

بھی تو نہ کہا تھا۔ اُس کے نزدیک میری حیثیت صرف گھر میں رکھے صوفے یا کرسی سے زیادہ نہیں تھی۔
میں نے زبردستی اپنے آپ کو تسلّی دی تھی ...... ایک نہ ایک روز وہ میری طرف لوٹ آئے گا۔
لیکن اُس کے خط کے انتظار میں مہینے ہی تو گذر گئے تھے اور میں اکیلے گھر میں چپکے چپکے روتی رہتی۔
اور ماں کی بڑی حویلی میں بھی میرا دل نہ لگتا۔ میرے لیے دُنیا قدیر کے بغیر اجنبی سی ہو جاتی.... میں چند
دنوں کے بعد اپنے گھر آجاتی ..... اور ـــ پھر راتوں کو سیاہ آسمانوں کے اندر چمکتے اَن گنت تارے
میرے سامنے ایک ایک کر بجھ جاتے۔

ماں کہتی "لڑکی تم تو بولائی گئی ہو، بھلا میاں سے اتنی چاہت بھی کس کام کی۔ تم تو عجیب
پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی ہو۔ جب تمہارا میاں گھر نہیں، تو پھر اس اکیلے گھر میں جاکر کیا کرو گی ..."
... میں نے ماں سے نہیں کہا تھا .... ماں مجھے تو یہ ساری دُنیا ہی اجنبی سی لگتی ہے۔ مجھے تو تم بھی
اجنبی لگتی ہو جس کی مدھ بھری باس نے ہمیشہ میرا پیچھا کیا ہے۔ میں نے تو اُن بندھنوں سے آزاد
ہونے کی بڑی کوشش کی ہے جو نامعلوم ہاتھوں سے مجھے جکڑ رکھتے ہیں۔ میں قدیر کی اَن دیکھی گرفت
سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کرتی ہوں، لیکن پھر نہ جانے کیسے میرے اندر کا سارا زہر مٹ
جاتا ہے اور بس اُس کی شدید چاہت دبے قدموں میرے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے
میں نے ماں سے صرف یہ کہا تھا "ماں میرا دل اپنے کمرے میں زیادہ لگتا ہے، دوسری جگہ اب
مجھے نیند نہیں آتی ....." اور پھر میں آجاتی اور پھر رات کو جب پورے چاند کے سامنے سے پپیہا پی
پی کی دُکھ بھری آواز بھرتا اَن دیکھے وجود سے غائب ہو جاتا، تو میں اپنے بستر میں اور سُکڑ جاتی......
میرے اندر کوئی چیز تیز تیز دہکتی، غصّے اور دُکھ سے میں اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو روکنے
کی کوشش کرتی ...... اور اجنبی فاصلوں کو پار کرتی قدیر سے لگ جاتی، مجھے اس کے وجود کی تیز
مہک سب طرف پھیلتی لگتی..... شاید مجھے اس سے بھی بچھڑنا ہے، جس طرح میں ماں کے
سفید میدے جیسے مہک والے جسم سے بچھڑ گئی تھی۔

میری ماں اُس حویلی کے بڑے سے صحن میں چارپائی پر لیٹی ہے اور میں ماں کے سفید مہک والے
وجود کے ساتھ لگی بیٹھی ہوں "ماں تمہاری باس کتنی اچھی ہے، کتنی پیاری ہے" میں اپنی گڑیا کو دبائے
ماں کے گریبان میں مُنہ گھسیٹرے اُس انوکھی سی باس کو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہوں جو صرف

ماں کے وجود سے آتی تھی۔

میری ماں ابھی ابھی خوشبودار صابن سے مُنہ دُھوکر آئی ہے، اُس نے اپنے سفید موتیوں جیسے دانتوں پر دنداسہ ملا ہے۔ اُس کے سُرخ ہونٹ کس قدر اچھے لگ رہے ہیں۔ میری ماں مجھے دائی امّاں کی سنائی ہوئی کہانیوں کی رانی لگ رہی ہے۔ ماں مجھے اپنی سنہری بالوں والی گڑیا کی طرح اچھی لگ رہی ہے۔" ماں تم مجھے بڑی ہی پیاری لگتی ہو" میرا دل چاہتا ہے۔ مَیں اور ماں ہمیشہ ساتھ ساتھ بیٹھیں، ساتھ سوئیں، لیکن میری دائی امّاں سختی سے مجھے اُس سے الگ کرکے کھٹولی پر سُلانے کو لے جاتی ہے، مَیں روتی ہوں، مَیں اپنی سنہری بالوں والی گڑیا کو دُور پھینک دیتی ہوں۔ مَیں کس قدر دُکھی ہوں، لیکن ماں ریڈیو پر گیت سُن رہی ہے۔ مَیں سوچتی ہوں، کتنا اچھا ہوتا جو دائی امّاں نہ ہوتی۔ تب میں اور ماں ایک ہی بستر پر سو سکتے ہیں ..... پر دائی امّاں مجھے ہمیشہ ماں سے علیٰحدہ کرکے لے جاتی۔ مَیں سوچتی ہوں، کتنا اچھا ہو جو دائی امّاں مر جائے، لیکن وہ تو نہیں مرتی اور پھر رات کو مجھے اکیلی کھٹولی پر لٹا کر خود گہری نیند سو جاتی ... اور مَیں جاگتی ہوئی باہر سے آتی ڈراؤنی آوازوں کو سُنتی ہوئی سہم کر سُکڑ جاتی ہوں۔

مَیں آج بھی تو سُکڑ گئی ہوں ..... پر اب تو ماں بھی پاس نہیں ہے، جس کے پاس جانے کی شدید خواہش مجھے اُس کھٹولی پر اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیتی تھی۔

باہر کس قدر اندھیرا ہے، میرے اندر کس قدر اندھیرا ہے، اور یہ دستک .... کتنا اچھا ہوتا، جو قدیر دُور نہ ہوتا اور آج کی رات مجھے اُس کا انتظار ہوتا۔

ایک روز ماں نے چڑ کر کہا تھا" بے بے دُنیا پڑھ رہی ہے، تم بھی پڑھو، تمہارے تاؤ ابّا کی لڑکیاں ہوسٹلوں میں رہتی ہیں اور انگریزی بولتی ہیں۔ وہ تو مہینوں بعد گھر آتی ہیں، لیکن تم مجھ سے جُڑ کر بیٹھی رہتی ہو۔ کبھی مجھے بھی اکیلا چھوڑ دیا کرو۔ تمہارے بابا کو کہوں گی تمہارا بھی انتظام کروا دیں۔

تب میرا چھوٹا سا دل زخمی فاختہ کی طرح پھڑ پھڑایا تھا۔ مَیں اُس بڑے سے صحن میں ماں کی موجودگی کے باوجود کتنی ویرانی محسوس کر رہی تھی۔ ماں نے رانی کی طرح مجھے اپنے محل سے نکال کر اندھیرے جنگل میں بھیجنے کا سوچ ہی لیا تھا نا آخر! مَیں نے بھرے دل سے سوچا تھا۔ اور اپنی سنہری بالوں

والی گڑیا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور جب دائی اماں مجھے لینے کے لیے آئی تھی تو میں نے اپنے بازو اُس کی طرف اُٹھا دیئے تھے، لیکن اُس نے سختی سے کہا تھا: "بی بی اب تم مجھ سے نہیں اُٹھائی جاتی ہو۔ بڑی ہو گئی ہو، اپنے پاؤں چلا کرو ..." اور مجھے لگا جیسے سب طرف سے درندے مجھے کھانے کے لیے بڑھ رہے ہوں، پھر میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اور خوف نے میری گردن پر اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے ...... لیکن آج میں کس کو پکاروں، زندگی کے اس لق و دق صحرا میں میری آواز کون سُنے گا .....

..... میں آج روح کے اس جہنم میں کھڑی سوچ رہی ہوں کہ میں نے تو ہمیشہ دُوسروں کی پُوجا کی ہے۔ میرا اپنا آپ تو اُن کی خواہشوں کے درمیان بھٹکتا ہوا کھو گیا ہے۔ میرا اپنا آپ تھا ہی کہاں۔ میں نے تو ہمیشہ دُوسروں کے وجود میں اپنا آپ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ دُوسروں کے سایوں میں آرام کرنا چاہا ہے۔ میں نے اپنی تکمیل کو دوسروں کی ذات سے وابستہ کر لیا — اور پھر یہ ہوا کہ دوسرے مجھ سے بچھڑ گئے اور میں خوفزدہ اکیلی کھڑی رہ گئی۔

"تم ان محرومیوں کا بدلہ کیوں نہیں لیتی ہو؟" میرے اندر کی دوسری عورت بڑی خوفناک ہنسی ہنستے ہوئے مجھے کہہ رہی ہے "تم کب تک اپنی خواہشوں کی لاش کو اپنے کندھوں پر لیے پھرو گی ....

.... قدیر کا وجود کوئی اتنی بڑی حقیقت تو نہیں جس کو تم عبور نہیں کر سکتی ..... قدیر حقیقت نہیں، اگر کوئی حقیقت ہے، تو وہ تم خود ہو۔"

میں نے اُس روز بھی جب ماں نے مجھے ہوسٹل بھیجنے کے لیے تیار کیا تھا، اپنے آپ سے کہا تھا۔ میں ماں کے متعلق بالکل نہیں سوچوں گی۔ میں اُس خوشبو کا ذکر کبھی بھی اس سے نہیں کروں گی جو مجھے اس کے سارے وجود سے اچھی لگتی ہے۔" میں نے جاتے ہوئے حویلی کی مٹیالی دیواروں پر نظر ڈالی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ اُونچے درختوں پر کوّے سر نیہوڑائے اُونگھ رہے تھے۔ دور آسمان کی اونچائی پر ایک چیل ساکت پروں کے ساتھ اُڑ رہی تھی اور زیز سُورج حویلی کے باہر میدان کی گرد پر پوری تابانی سے چمک رہا تھا۔ میں نے حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر کی طرف دیکھا تھا جہاں میری ماں کھڑی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ماں مجھے جانے سے روک لے تو میں بھاگ کر ہمیشہ کے لیے اس کے وجود میں چھُپ جاؤں، لیکن ماں خاموش کھڑی رہی تھی۔ میں نے اپنی ناک بابا کے ساتھ لگا دی، اس خوشبو کو سونگھنے کے لیے جو مجھ سے بچھڑ رہی تھی۔ پر میری آنکھوں میں دُھند

کی وجہ سے بابا مجھے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں چوکھٹ سے نیچے اتر آئی تھی۔ مجھے ماں سے بچھڑنے
کا غم تھا، لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا تھا:
"میں ماں کو یاد نہیں کروں گی۔ میں اس باس کو یاد نہیں کروں گی۔" میں نے اپنے آنسو روک لیے
تھے۔ میرے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ میں زندگی کے سیاہ جنگل میں اکیلی جانے کے لیے تیار تھی —
آخر ماں نے مجھے جنگل میں بھیج ہی دیا۔ میں نے بابا کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے دائی اماں کی
سنائی ہوئی کہانی یاد آ رہی تھی۔

آج بھی میں ایک خوفناک سفر کے آغاز پر کھڑی ہوں۔ اندھیرے میں اکیلی — قدیر بھی نہیں....
....اور فیصلے کا ہر لمحہ میرے ہاتھوں میں میخیں ٹھونک رہا ہے اور میں اپنے جسم کی صلیب پر لٹک
رہی ہوں، شاید میں چیخ رہی ہوں.... پر میرے اندر کی دوسری عورت ہنس رہی ہے۔

ہمیشہ قدیر کے جانے پر میں رنجیدہ اور اداس ہو جاتی اور میرے اکیلے کمرے کی کھڑکی سے لگا چاند
مجھے جھانکتا رہتا، قدیر کا چہرہ میری یادوں میں ابھر آتا تب میں چپ چاپ چاند کو تکتی رہتی اور
اس کے وجود کی خوشبو مجھے اپنے چاروں طرف پھیلتی لگتی، قدیر کے بغیر مجھے اپنا آپ ادھورا لگتا —
سارا گذرا ہوا وقت درد کی ایک ٹیس بنکر ابھرتا اور مجھے غمگین کر جاتا، اپنے آپ پر میرا بھروسہ اٹھ جاتا۔
میں نے ساری زندگی مکمل پن کی خواہش میں گذار دی تھی وہ دھول بن کر فضا میں اڑ جاتی اور میں
وہی چھوٹی سی لڑکی بن جاتی جس نے اپنی مٹیالی حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑے ہو کر زندگی کے
جنگل میں قدم رکھا تھا..... مجھے آج بھی ایک قدم اٹھانا ہے..... اور سوچوں کا کڑوا دھواں
میرے سامنے پھیلا ہوا ہے۔

اس رات کے بعد شاید میں قدیر کا انتظار نہ کر سکوں، مجھے اپنی راہ خود متعین کرنی ہے۔
مجھے زندہ رہنا ہے، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے اندر سے ایک نئی خوشبو پیدا کرنی ہے۔
.... قدیر کے رویے نے میرے اندر کی دوسری عورت کو خود ہی تخلیق کیا ہے، مجھے مٹا کر، مجھے
جو ہمیشہ دوسروں کی ذات میں پناہ کی خاطر بھٹکتی رہی ہوں..... اور اب یہ دستک میری روح
کی ویرانی میں گونج رہی ہے.... وہ دستک ایک اندھیری غار کے دہانے پر رکی مجھے اندر بلا
رہی ہے.... اور اس غار کی سیاہی میں میرے اندر قدیر سے انتقام لینے کا جذبہ جنم لے رہا ہے

..... میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اس دستک میں میری اَن کہی کہانیوں کی تکمیل مضمر ہے .... میں جو ایک اَن کہی کہانی بن گئی ہوں، ایسی کہانی جس کے وَرق کسی نے پلٹ کر نہ دیکھے ...... ایسی داستان جو اپنے اندر خود ایک قیدی بن گئی ہے اور میں نے اس کی تکمیل کے لیے قدیر کی آنکھوں میں جھانکا ہے، پر وہ آنکھیں مجھ سے کچھ نہیں کہتیں اور میں اپنے شاندار ڈرائینگ روم میں فوم ربڑ کے صوفوں پر بڑھیا ساڑھیاں پہنے اُس کے انتظار میں ایک مبہم خلش بن گئی ہوں ......" قدیر مجھے دیکھو ..... میرے دل میں جھانکو .... میری سچّائی کو پہچانو ....." لیکن قدیر میری ایک نہیں سُنتا، اُس نے میری کسی سچّائی پر یقین نہیں کیا۔ وہ اپنے سجے ہوئے آفس میں بیٹھا اپنی سیکرٹری سے باتوں میں مگن ہے اور میں اُس کے گھر میں قید اُس کا انتظار کر رہی ہوں ..... کیا ہو سکتا ہے ... ... کوئی چارہ نہیں ..... کوئی راہ نہیں۔ رات میری کھڑکیوں سے لگی میرا تمسخر اُڑا رہی ہے اور میں فون کے چونگے کو ہاتھ میں پکڑے کھڑی ہوں ..... قدیر کہاں ہوگا؟ آفس میں یا کسی ہوٹل میں ... ... اُسے تو میرے پاس ہونا چاہیے، اُسے تو اس گھر میں ہونا چاہیے، اُسے تو اس گھر میں ہونا چاہیے جہاں میں دُلہن بنکر اُتری تھی، جو میرے بابا نے میری خواہشوں کے مطابق سجایا تھا، جہاں میں نے اپنے اندر کے سارے رنگ بکھیر دیئے تھے، جہاں میں نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ایک نئی دُنیا بسائی تھی۔

اور قدیر نے جواب دیا ہے:" میں ایک میٹنگ میں ہوں، بہت ضروری میٹنگ ہے۔ رات گئے گھر آسکتا ہوں، تم میرا انتظار نہ کرو، کھانا کھالو۔" اور اس نے جلدی سے فون بند کر دیا تھا۔
اور میں اُس بڑے سیاہ آبنوسی ڈائننگ ٹیبل کے ایک سِرے پر بیٹھے بیٹھے خالی ذہن باہر کی سیاہی کو دیکھتی رہی تھی۔ میں نے بہت کچھ سوچنا چاہا تھا .... میرا اندر ایک تیز ٹیس بن گیا تھا جس نے میرے ذہن کو سُن کر دیا تھا۔ رات اتنی سیاہ کیوں ہے؟ تارے کہاں ہیں؟ ... آسمان کی سیاہی نے سب کو نگل لیا ہے ..... قدیر نہیں آئے گا ..... یہ دوسری عورت زندگی کے ہر موڑ پر میرے تعاقب میں کیوں چلی آتی ہے؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے دائی اماں یاد آرہی ہے، مجھے گیت گاتی عورت کی آواز آرہی ہے، مجھے ماں کا چہرہ یاد آرہا ہے ... میں ٹیبل کی سیاہ سطح پر سر رکھے رو رہی ہے .... میرے اندر درد کی ایک دُنیا آباد ہے اور اس میں اکیلی ہوں۔

ایک روز قدیر کے اسسٹنٹ نے مجھے دیکھ کر کہا تھا ۔۔۔ "بیگم صاحبہ، آپ تو ناحق اپنے آپ کو گنوا رہی ہیں ..... قدیر صاحب کا آپ کب تک انتظار کریں گی؟" اور اس نے بڑے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا تھا ۔۔۔ اور میں اُس کی نظروں کو دیکھ کر اپنے اندر سمٹ گئی تھی ۔۔۔ "صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ آپ کو بازار جانا ہے نا ..... " وہ میرے سامنے کھڑا تھا اور میں جو اتنے سالوں ہوسٹلوں کے خالی کمروں میں اکیلی رہتی آئی تھی، اس کی موجودگی میں ڈر سی گئی تھی .....

" بیگم صاحبہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے ..... قدیر صاحب میرے باس ہیں۔ میں ان کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ نہ جانے مس زاہدہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؛ حالانکہ وہ آپ کے پاسنگ بھی نہیں ..... " اُس کی آنکھوں میں چمک تھی ..... " وہ تو ایک سٹینو ہے۔ ایک ماڈرن لڑکی "

" سلیم صاحب، میں یہ سب جانتی ہوں " اور میرے دل کی ساری ویرانی اُس وقت میرے سامنے مجسم ہو گئی تھی، مجھے لگا تھا میں اپنی حویلی کے تپتے گرد آلود آسمان کے بیچوں بیچ اُڑتی اُس چیل کی مانند ہوں جو ساکن ہو گئی ہو ..... اکیلی اور ساکن ....

سچائی بڑی تلخ ہوتی ہے بیگم صاحبہ .... لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اس کڑوی حقیقت سے واقف ہوں جس کا ایک نہ ایک روز آپ کو سامنا کرنا ہی ہے۔ قدیر صاحب کا واپس لوٹنا مشکل ہے " اُس کی آواز میں ہمدردی تھی اور ایک اور چیز بھی جو میری زندگی سے کوسوں دُور تھی۔

" سلیم صاحب، میں بہت دُکھی ہوں ..... میں بہت اکیلی ہوں سلیم صاحب ..... میں کیا کروں " میں کھڑے کھڑے رو رہی تھی۔

" چلیے بیگم صاحبہ، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ تو گھر کی چار دیواری میں قید ہو گئی ہیں۔ زندگی بڑی وسیع ہے اور آپ کوئی قدیر صاحب کی محتاج تو نہیں ہیں۔ چلئے گاڑی میں چلئے ذرا گھوم آئیے " اُس نے گاڑی کا پٹ کھول دیا تھا اور منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔

" سلیم صاحب میں اس وقت نہ جا سکوں گی " اور میں دروازہ بند کر کے اندر آ گئی تھی۔ پھر وہ گاڑی لے کر واپس چلا گیا تھا ۔۔۔ میں سارا دن برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی بیٹھی رہی تھی .... میرا گھر کونسا تھا؟ .... مجھے کہاں جانا ہے؟ ۔۔۔ اور پھر مجھے اپنی ماں کے خوبصورت وجود کے ساتھ لگا اپنا وہ چھوٹا سا وجود یاد آ گیا تھا اور مجھے ماں کی باس یاد آ گئی تھی .... پر زندگی کی ساری

مسرتیں مجھ سے کس قدر دُور تھیں ۔ زندگی کا اندھیرا تھا اور میرا شدّت سے دل چاہا تھا کہ میں دائی اماں کے ساتھ اپنی اُسی کھٹولی پر جا کر سو جاؤں اور اپنے اندر سمٹ جاؤں ۔۔۔ پر دائی اماں، کھٹولی اور وہ بے رنگ کمرہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور میں اپنے تخلیق کردہ گھر کے ملبے اور نیچی چھت والے برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی رہی تھی ۔۔۔ اور باہر مارچ کی ہوا چلتی رہی تھیں ۔ پودوں پر نئے کومل پتے جھانک رہے تھے ۔ چڑیاں اپنے گھونسلے بناتے کے لیے گھاس پھونس کے تنکوں کو چونچ میں دبائے میرے ارد گرد اڑتی پھر رہی تھیں ۔ اور میرے سامنے زندگی کی لامتناہی ویرانی تھی ..... اور میرے اندر کی عورت دُکھ کی پوری شدّت سے رو رہی تھی ..... میں کہاں جاؤں؟ ..... میں کہاں جا سکتی ہوں؟"

اور سلیم نے ایک روز فون کرتے ہوئے کہا تھا "بیگم صاحبہ، قدیر صاحب کو اچانک دو روز کے لیے کسی دُوسرے شہر میں جانا پڑ گیا ہے ۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ آپ ان کی ضروری چیزیں اٹیچی میں رکھ دیں ۔ میں آدھ گھنٹے تک آ کر لے جاؤں گا ۔" اُس کی آواز میں طنز آمیز مسکراہٹ تھی ۔

"مجھے اس خلش کا عادی ہو جانا چاہیے، پر یہ ہر بار ایک نئی اور جان لیوا شدّت سے میرے حواس پر کیوں چھا جاتی ہے ۔ میں اپنے اندر اس قدر کیوں قید ہوں، مجھے اس قید سے نکل جانا ہوگا ...... میں کیوں اپنے اوپر لذّتوں اور خوشیوں کے اُن نخلستانوں کو حرام کر لیتی ہوں جن کی تکمیل کی شدید خواہش میرے دل کو زخمی کر دیتی ہے ۔" میں نے پہلی بار قدیر کی چیزوں کو اُس کے اٹیچی میں رکھتے ہوئے سچائی سے سوچا اور اپنی سوچ سے حیران اور شرمندہ سی ہو گئی تھی ..... پر مجھے اتنے عرصہ بعد پھر اپنے اندر ایک اور عورت کا چہرہ نظر آیا تھا جو میرا چہرہ نہیں تھا ..... یہ عورت کون ہے؟ یہ میرے اندر کس طرح گھس گئی ہے؟ میں نے ساکت ہو کر اور سہم کر سوچا پر وہ عورت وہاں موجود رہی تھی اور میری بند آنکھوں کے باوجود کھڑی مجھے گھورتی رہی تھی ۔ ایک نئی عورت ...... ایک دوسری عورت ۔

اور جب سلیم نے اٹیچی میرے ہاتھ سے لیا، تو اُس نے ہنس کر کہا تھا "بیگم صاحبہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے، پر آپ تو اپنے آپ سے انتقام لینے پر تُلی ہوتی ہیں ..... قدیر صاحب زندگی کی لذّتوں سے لطف اندوز ہونا جانتے ہیں اور آپ میں طاقت نہیں کہ آپ اُن سے انتقام ہی لیں ۔ آپ تو بس گھل گھل کر مٹنا جانتی ہیں ۔" اور میرے اندر کی دُوسری عورت پوری طرح بیدار ہو کر اُبھر آئی تھی ...

..... اور اُس نے میری ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ اُس نے سلیم کی آنکھوں میں سیدھا دیکھا تھا۔ اور سلیم ہنس دیا تھا..... ایک دل کو گرفت میں لینے والی ہنسی، ایسی ہنسی جو کبھی قدیر کے لبوں پر نہیں آئی تھی، جس کی خواہش میں مَیں نے ہزاروں بار ہی اُسے دیکھا تھا ــــ لیکن پھر میرا دل بہت اندر ہی بھاری ہو کر ڈوب جاتا ــــ "میرا جسم اس قدر کیوں جاگ رہا ہے، اسے سو جانا چاہیے۔ سو جانا چاہیے ــــ بیگم صاحبہ اگر آپ کو شام کو کہیں جانا ہو تو مَیں آجاؤں تاکہ آپ کو گاڑی کے لیے دقت نہ ہو.....؟"

میرے اندر کی دُوسری عورت نے بس اُسے دیکھا اور مسکرا دی تھی،..... وہ ہنسی میری نہیں تھی، مَیں تو اتنی خود پرست نہیں تھی ــــ سلیم کے جانے کے بعد میں کھڑی کھُلے گیٹ سے باہر رواں سڑک پر چلتے لوگوں کو دیکھتی رہی تھی، مَیں گاڑیوں کے تیز ہارن سُنتی رہی تھی..... جب مالی گیٹ بند کرنے کے لیے گیا، تو مَیں نے اُسے منع کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر گھُٹتی ہوا میں پہلے جیسی سختی نہیں ہے..... زندہ رہا جا سکتا ہے ــــ اور جب شام کو سلیم نے برآمدے میں کھڑے ہو کر دروازے پر دستک دی تھی تو مَیں یوں اُچھل کر کھڑی ہو گئی تھی، جیسے کسی نے مجھے زبردستی پکڑ کر ہوا میں معلق کر دیا ہو..... میرے اندر کی دُوسری عورت مسخر بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور میری ساری طاقت سَن سَن کرتی میرے جسم سے نکل رہی تھی..... میرے اندر اُٹھتے شعلے مجھے چاٹتے جا رہے ہیں۔ مجھے جلا رہے ہیں۔ یہ جلن کتنی جان لیوا ہے مجھے اس دوسری عورت سے نفرت ہے۔ مَیں نے اپنے بھینچے لبوں کو کھولنا چاہا تھا..... مَیں نے کہنا چاہا تھا "سلیم صاحب مَیں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ مَیں نے اپنی ماں کو کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ جاتے نہیں دیکھا۔ مَیں نے کبھی اُسے حویلی کے بڑے گیٹ سے باہر جھانکتے نہیں دیکھا۔ مَیں بھی باہر نہیں جا سکتی..... مَیں قدیر کا انتظار کروں گی" لیکن میرے اندر کی دُوسری عورت اب بھی ہنس رہی تھی.....

وہ دستک میرے اندر گونج رہی تھی..... اور مَیں نے آدھ کھلے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا تھا "سلیم صاحب میری طبیعت اچھی نہیں..... مَیں باہر نہیں جاؤں گی.....!" اور اُس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا "بیگم صاحبہ، مَیں جانتا تھا آپ یہی کہیں گی۔ مَیں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا، تاکہ آپ اپنے اُس حق کو قدیر صاحب سے چھین سکیں جس سے آپ کو انہوں نے

محروم کر رکھا ہے۔ آپ بھی تو آخر انسان ہیں اور آپ کو دیکھ کر میرا دل دُکھتا ہے۔ ہمت کیجئے بیگم صاحبہ ..... آپ اپنے گرد کھینچے ہوئے اس بوسیدہ حصار کو توڑ کیوں نہیں دیتیں ..... آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ اور دیکھئے تو زمانہ کہاں جا رہا ہے ـــــ اور میں آپ کے ساتھ ساتھ ہوں ..... اگرچہ میں اجنبی ہوں ـــــ" اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میں اس دُوسری عورت کے سامنے سمٹ کر ایک موہوم نقطہ بن گئی ہو ـــــ اور پھر میں زندگی میں پہلی بار اس دُوسری عورت کی معیت میں ایک نقطہ بنی سلیم کے ساتھ گھومتی رہی تھی۔ اُس نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں ـــــ ایسی خوبصورت باتیں جو صرف میں نے کہانیوں میں پڑھی تھیں۔ ایسے خوبصورت الفاظ جو دُھند بن کر دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں سنڈریلا تھی اور مجھے بلوریں سینڈل پورا آ گیا تھا ـــــ اور سلیم ایسی جادوگرنی تھا جس نے مجھے یہ خواب محل دیا تھا ..... پردہ تو دُوسری عورت تھی جو ان ساری باتوں سے خوش ہو رہی تھی اور میں رات گئے آ کر خوب روئی تھی ..... میں نے اپنے دل کے اندر سے اس وجود کو نکال دینا چاہا تھا پردہ ہٹ دھرمی سے موجود تھا اور میں بے بس تھی۔ قدیر کے وجود کی خوشبو کہاں ہے، کہاں ہے۔ دُوسرے روز سلیم نے کہا تھا "بیگم صاحبہ عورت کی زندگی تو ایک مکمل فتح ہے اور میں تو حیران ہوں آپ اس طاقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ آپ نے اپنے اندر چھپی ہوئی اس طاقت کو ضائع کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے" اس کی آنکھوں کی جوت مجھے بھی روشن کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا "کون سی طاقت سلیم صاحب؟ میں تو ایسی کسی طاقت کو محسوس نہیں کر سکتی"۔ میں اس کی باتوں سے خوش تھی، بے حد خوش ـــــ اور یہی تو ساری تکلیف کی بات ہے۔ آپ اس بات کو نہیں جانتیں جو آپ کی ساری شخصیت ہے، جو قدیر صاحب سے بہتر مردوں کو اپنے سامنے بے بس بنا سکتی ہے ـــــ" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا "سلیم صاحب شادی ایک بندھن ہے ـــــ اور اس کو توڑنا آسان نہیں ـــــ" میں اپنے خوابوں کے رنگ محل میں کھو سی گئی تھی۔

"پر بیگم صاحبہ یہ دونوں فریقوں کی ذمہ داری ہے۔ آپ نے شاید قدیر صاحب کے متعلق جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ اپنا وقت کہاں اور کس طرح گذارتے ہیں۔ وہ کتنی عورتوں سے ملتے ہیں، وہ کتنی شراب پیتے ہیں اور ان کو بھی کوئی حق نہیں کہ آپ پر پابندی لگائیں۔ آپ بھی ان کی لاپرواہی کا انتقام اُن سے لے سکتی ہیں اور ایک عورت جب انتقام لینے پر تل

جائے، تو پھر کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا ...... آپ قدیر صاحب کے بیکار انتظار بیں اپنی زندگی کیوں گنوائیں .... وہ مجھے ٹھہر ٹھہر کر ہر بات سمجھا رہا تھا — اور اس لمحے گذرے وقت کی محرومیوں اور چاہے جانے کی شدید خواہش نے میرے اندر کے عورت پن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔" ہاں قدیر کو کیا حق ہے کہ میرے دل کے اندر گھس کر بیٹھ جائے اور مجھے راتوں کی تنہائیوں اور دن کی ویرانیوں میں مِٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ دے ..... محض تڑپنے کے لیے، محض اپنی خواہش کرنے کے لیے — میرے سارے خوابوں کو مٹا کر — میرے بھی تو خواب ہیں، میرے سپنے، قدیر کو حق نہیں کہ میرے لبوں سے تمام سچے قہقہے نوچ کر صرف زخمی مسکراہٹ دے۔"
میرے اندر کی دُوسری عورت میرے سامنے کھڑی تھی اور میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جھجھک محسوس نہیں کر رہی تھی .... پر مجھے اُس سے نفرت تھی — اور پھر مَیں نے اپنا خواہش سے گرم ہاتھ سلیم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا تھا — اور قدیر ایک دُھند بنکر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اُس کی دی ہوئی اذیتیں کہیں چھپ گئی تھیں، صرف مَیں اور سلیم تھے ..... مَیں کہاں تھی۔ .... مَیں کہاں تھی۔ کہیں بھی نہیں، کہیں بھی نہیں۔

اور اب یہ دستک .... میرے سب طرف اندھیرا کس قدر ہے — اور دُوسری عورت آتشِ انتقام سے جل رہی ہے۔ دُوسری عورت کے چہرے پر خواہشوں کی لَو ہے جو اُسے جلا رہی ہے... وہ مجسم جسم ہے۔

مَیں چیخ رہی ہوں .... مجھے قدیر کا انتظار ہے ...." پر دُوسری عورت تک میری چیخ نہیں پہنچ رہی .... دستک کائنات پر محیط ہوتی جا رہی ہے اور کھُلے دروازے سے اندھیرا، سیاہ اور دبیز اندھیرا، اندھیرا گھس آیا ہے۔ اور مَیں چیختے ہوئے کہنا چاہتی ہوں۔" مجھے تم سے شدید نفرت ہے، لیکن دُوسری عورت اندھیرے میں کھڑی مجھے نظر نہیں آ رہی۔ شاید میں ایک نقطہ بن کر مِٹتی جا رہی ہوں .... دُوسری عورت ہنس رہی ہے ...... ہنستی ہی جا رہی ہے۔ قدیر کے وجود کی باس اس بند دروازے سے باہر ہے۔ اُسے اندر نہیں آنا چاہیے اور سلیم نے آکر باہر کی دُنیا کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

روشنی کا سفر

دل کے اُجالوں میں جب اندھیرا دَر آتا ہے، تو پھر کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ میں اندھیرے کے اس لامتناہی سمندر کے کنارے کھڑی یادوں کی ناؤ کھیتی، اُمیدوں کے جزیرے میں واپس جانا چاہتی ہوں، لیکن وہ خوابناک جزیرے وقت اور نفرت کے تُند اور سرکش دھارے میں ڈوب گئے ہیں اور میں کھڑی سوچ رہی ہوں۔ کیوں زندہ ہوں، کس لیے زندہ ہوں؟

میری بوڑھی ماں اپنے گلے میں پڑے "ہیرنگ ایڈ" کی بیٹری آن کر کے، آلہ کانوں میں لگا کر میری طرف غور سے دیکھتی ہے، تو میں مُسکرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مَیں تو مسکرانا چاہتی ہوں، لیکن میرے دِل کی ہنسی میرے لبوں سے نوچ کر خون کے اُس سمندر میں ڈبو دی گئی جس کے سیاہ بھنور میں مَیں چھلانگ نہ لگا سکی۔ مَیں تو بس آواز ہی دیتی رہ گئی اور ڈوبا تو صرف تجمّل حسین، صرف تجمّل حسین۔

ماں جی، ہیرنگ ایڈ آلے کی مدد سے میرے دل کے اندر اُٹھتے طوفان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہیں بھولی ماں ــــــ اور میں جھک کر برآمدے میں رکھے منی پلانٹ کے پتّوں پر سے گرد جھاڑنے میں مصروف ہوں۔

ماں کا دِل تو بہت گہرا ہوتا ہے ـــــ میں دِل ہی دِل میں کہہ رہی ہوں۔ گرد ـــ گرد پھولوں پر گرد ـــــ پتّوں پہ گرد ــــــ لیکن میرے دِل پہ جمی گرد کون جھاڑے گا۔

سوچ کا بھاری پتھر زمانوں سے میرے سینے پر دھرا ہے۔

ماں جی نے آلہ کانوں سے ہٹایا اور تسبیح پر درود کا وِرد کر رہی ہیں۔ میں چپ چاپ برآمدے میں کھڑی، سامنے کے گھر میں کھِلے کچنار کے سفید پھول دیکھ رہی ہوں اور دور سڑک پر چنار کے پھولوں کی آگ ہے۔ سرخ سرخ پھول، چنار کی ٹہنیوں پر پروتے ہوئے لگ رہے ہیں۔ میرے مَن میں، میری زندگی میں، میرے ذہن میں بھی ایک آگ دہک رہی ہے۔

بہار کی خوشبوؤں سے بھری بوجھل باس بھی میرے اندر کے الاؤ کو مدّھم نہیں کر سکتی۔ مَیں کب تک یونہی جلتی رہوں گی؟

سمعیہ، اکثر پریشانی سے میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ ”حمی آپا، کوئی بات کرو نا کیوں چپ چاپ بیٹھی ہو؟“ —— میں جانتی ہوں وہ میرے دُکھ سے آگاہ ہے اور اپنے طور سے اُسے بانٹنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن میں اُس زخم کا ماتم کس طرح نہ کروں جو میرے دِل کی تنہائی میں بغیر چپو کی کشتی کی طرح، یادوں کے رُخ پر بہتا رہتا ہے، بہتا ہی رہتا ہے ماں کے چہرے پر دُکھ کا سایہ ہے اور سمعیہ اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالے گملوں سے سوکھے پتے چُننے لگی ہے اُسے پودوں سے پیار ہے اُسے بہار سے لگاؤ ہے۔ وہ انسانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جو اُسے اس قدر اچھے اور پیارے لگتے ہیں وہ یہ بھی تو جانتی ہے کہ انسان درندے بھی ہیں، لیکن وہ پھر بھی پُر امید ہے۔ جب اپنی ڈیوٹی سے واپس آتی ہے، تو اُس کے پاس باتوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ نئے نئے لوگوں سے ملنے میں اُسے بہت ہی لذّت ملتی ہے اور گلے میں سٹیتھوسکوپ ڈالے لوگوں سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ سیاست کی باتیں —— مغربی پاکستان کے مسائل —— مشرقی پاکستان کا غم۔ لوگوں کے دُکھ ——

غم —— غم کے اِس سمندر میں ہم سب اپنے اپنے دائروں میں گھومتے رہتے ہیں —— ایک دوسرے کی رفاقت سے آگاہ، لیکن پھر بھی الگ الگ سے ——

حمی آپا، آج مسٹر رفیع نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا —— ہم اِس اتوار کو اُن کے

ہاں جائیں گے ـــــ بڑا پیارا انسان ہے اور میری تو بے حد عزت کرتا ہے ـــــ کیوں حمی آپا اچھا ہے
گانا؟ سمیعہ، لان میں درخت کے پیچھے گھاس میں بیٹھ گئی اور اُس کی پیلی ساڑھی اُس کے سانولے چہرے
پر بہت پچ رہی ہے۔

سمیعہ، جینا جانتی ہے۔ وہ لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے، اسی لئے خوش رہتی ہے
لیکن میں اپنے اندر کی اس محدود دنیا کا کیا کروں جس میں صرف چند لوگوں کی گنجائش ہے؟ میں
اُسے جواب نہیں دوں گی ـــــ اور میں جانتی ہوں وہ ٹمارزن کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے
ہوئے میرے بارے میں سوچ رہی ہو گی۔

حمی آپا، بہار آ رہی ہے ـــــ دیکھو نا میرے منی پلانٹ پر نئے پتے آ رہے ہیں اور دیکھو
عقیق دل پودے، کے ڈنٹھل بھی پھوٹ رہے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ جب بڑے بڑے عقیق کے
سُرخ پھول ہوا میں جھومتے ہیں!

سمیعہ پھر اُٹھ کر گملوں کے پاس آ گئی ہے۔ چٹاگانگ سے آنے کے بعد اُس نے کتنے چاؤ سے
یہ چند گملے اکٹھے کئے ـــــ اور میں دل میں سوچتی ہوں کیا سمیعہ کو اُس ہریالی بھری دھرتی کے
چھٹنے کا غم نہیں، کیا اُسے اپنے گھر کی وہ ہریاول یاد نہیں آتی جو ہمارے دروازے سے شروع
ہو کر ٹیلے کے دامن تک چلی جاتی تھی؟ وہ کتنے چاؤ سے اِن چند گملوں کو پانی دیتی ہے اور پھر ہر روز
کلینک سے آ کر اُن کے نئے پتوں کو دیکھتی ہے۔

ہاں اُسے جینا آتا ہے اور میں جی کر بھی لحظہ لحظہ مَرتی رہتی ہوں۔

ماں جی اُٹھ کر اندر چلی گئی ہیں ـــــ اذان کی پُر وقار آواز ہوا کے ساتھ اُڑتی، گلبرگ کی
ہری بھری فضاؤں میں سب طرف پھیل گئی ہے، لیکن ہمارے ہمسایہ کی پانچوں جوان خوبصورت
لڑکیاں، کھلے بالوں کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ آن کئے۔ ڈرائنگ رُوم میں ٹوسٹ کر رہی ہیں
اور خوشی سے چیخ چیخ کر کہتی ہیں عبادت فرسودہ رواج ہے۔

سمیعہ کہتی ہے کتنی خوش مزاج اور زندہ دل لڑکیاں ہیں! ـــــ میں اپنے

اسسٹنٹ ڈاکٹر سے کہوں گی اِن میں سے کسی سے شادی کرلے۔ وہ میری بات بالکل نہیں ٹالے گا۔ آؤ حمی آپا، اندر چلیں —— چائے کا وقت ہوگیا ہے نا۔

سمیعہ نے ٹارزن کو ڈانٹ دیا، اس لیے وہ چپ چاپ ٹانگوں میں دُم دبا کر بیٹھ گیا ہے۔

ماں جی اور سمیعہ اندر چلی گئیں اور میں چنار کے درختوں کے سُرخ شعلوں جیسے پھُول دیکھ رہی ہوں ——

تجمّل حسین! تجمّل حسین! تم کیوں مر گئے؟ تم کیوں اُس آگ میں کُود گئے؟ اگر تم زندہ ہوتے تو شاید میں تمہاری دُوری کے باوجود مُسکرا سکتی، اُسی انداز میں جس روز تم نے میرے ہاتھ میں منگنی کی اُنگوٹھی پہنائی اور تمہاری بہنوں نے میرے ماتھے پر سُرخ بندیا لگائی اور میں نئی خوبصورت ساڑھی میں لجا کر سمٹ گئی تھی، حالانکہ برسوں پہلے سے ہی تمہاری واقف تھی —— دِل کے رشتے بڑے گہرے ہوتے ہیں نا؟ تجمّل حسین!

لیکن اب میرا اِن ساری باتوں سے یقین اُٹھ گیا ہے۔ دیکھو تو میں اُس دیس سے کتنی دور بیٹھی ہوں! اُس دیس سے جس کی ٹھنڈی مٹّی میں تمہارے خون کے سُرخ پھول، دُھول میں مل گئے اور ہم سب اپنی جانیں بچا کر لاہور بھاگ آئے۔ تم ہی کہو کیا میرا یقین نہ اُٹھے گا بھلا۔ مجھے تو اُس مٹّی کو اُٹھا کر اپنی مانگ میں بھر لینا چاہیئے تھا اور اپنی آنکھوں کی جوت سے دیا جلا کر اُس تودے پر جلانا چاہیئے تھا جس کا کہیں بھی نام و نشان نہیں —— اور جس کے کھوج میں بار بار میں نے اپنے گھر کی دہلیز سے باہر جانا چاہا تھا، لیکن ماں اور سمیعہ نے کہا تھا۔

پگلی نہ بنو —— نہ جانے مکتی باہنی والے اُسے کہاں لے گئے ہیں۔ وہ ظالم لوگ! وہ بے درد بنگالی! اُس نے دُور سے آتی گولیوں کی آواز بھی سُن لی تھی شاید۔

"ماں مجھے اِس بنگال سے نفرت ہے۔ مجھے یہاں کے لوگوں سے نفرت ہے —— نفرت ہے"

"آہستہ بولو حمی آپا، کہیں کوئی سُن لے گا" —— سمیعہ نے کمرے کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے مجھے کہا تھا —— کیسی پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو! —— ہوسکتا ہے تجمّل کا کا زندہ ہی ہوں۔

سن لے گا۔ ـــــ کون سن لے گا ـــــ سُننے دو ـــــ سُننے دو ـــــ مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں رو رہی تھی

"ارے حمیرہ آپا! ـــــ کیا کرتی ہو؟" سمیعہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔

مَیں نہ کہتی تھی یہ بنگالی، ہم بہاریوں سے پیار نہیں کر سکتے۔

حمیرہ آپا، تم انسانوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں، اسی لئے زیادہ رنجیدہ رہتی ہو ـــــ کوئی بھی تو بُرا نہیں ہوتا ـــــ تم محبت تو کر کے دیکھو، انسان محبت سے جیت لیا جاتا ہے

سمیعہ چپ رہو ـــــ ماں جی نے اپنی تسبیح تیزی سے گھماتے ہوئے اُسے ڈانٹا تھا۔

ماں جی، اِس میں اِنسانوں کا کوئی قصور نہیں ـــــ یہ سب سیاسی چالیں ہیں اور بے وقوف اِنسان اِن چالوں میں آجاتے ہیں ـــــ ہم سب پاکستانی ہیں ـــــ سمیعہ پوری شدت سے اپنے دلائل پہ اڑی رہی۔

بچی کو دلائل نہیں، ہمدردی کی ضرورت ہے ـــــ ماں جی نے فکرمندی سے مجھے دیکھ کر کہا تھا

تجمل حسین کتنا پیارا بچہ تھا! ـــــ مکتی باہنی والوں نے مار دیا اور لاش بھی اُٹھا کر لے گئے ـــــ ماں جی نے موم بتی کی روشنی سیاہ کاغذ سے ڈھانپ دی تھی۔

وہ کچھ دنوں سے اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتیں۔ اور سُنو تجمل حسین، میں اُن دِنوں اتنا روئی تھی ـــــ اتنا روئی تھی ـــــ اتنا روئی تھی کہ مجھے لگتا تھا آکاش کے سارے کالے میگھا میری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں ـــــ مجھے تو اپنے آپ سے بھی ڈر لگتا اور آس پاس کے لوگوں سے بھی خوف آتا ـــــ کس قدر بے یقینی تھی! ہم سب اُمید و بیم کے درمیان معلق تھے۔ نئے سویرے، دھندلکوں میں چھُپے ہم سب کو ڈراتے تھے۔ نیا سورج کب طلوع ہوگا اور وہ نیا سویرا ہوگا کیسا؟ سوالوں کے گھور اندھیارے میں ہم سب کی

سوچوں کے بسرے گم ہو جاتے اور ہم خوفزدہ ، اُمید کی روشنی تلاش کرتے رہتے۔

برسوں پہلے ، ایک روز تم نے آکر کہا تھا ــــ میں رضا کار کور میں بھرتی ہونے لگا ہوں
اُس روز تم کس قدر جوش میں تھے ! تمہارے کمزور سے چہرے پر صرف تمہاری دو آنکھیں
ہی روشن تھیں جیسے دو اُمید کے دیے روشن ہوں اور مجھے صرف وہی دکھائی دے رہی
تھیں . تم جانتے تھے میری ذات کا سارا اُجالا تمہاری اِن دو زندہ آنکھوں ہی سے طلوع ہوتا
تھا .

اور سمیعہ نے اُس روز تمہیں مختلف اخباروں کی سُرخیاں سُنائی تھیں ــــ ہاں
سمیعہ دیدی ، حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں . کچھ بھی ہو سکتا ہے . کچھ بھی
ہمیں سب باتوں کے لئے اپنے ذہن تیار رکھنے چاہئیں ــــ تم بہت پُر اُمید تھے . روشنی
کی تلاش جان جوکھوں کا کام ہے ــــ تم نے کہا تھا کیوں کاکا ، ہمارے فوجی کیسے جا رہے
ہیں ــــ ماں جی نے اُمید بھری آواز میں پوچھا تھا .
ماں جی وہ بہادر ، دلیر ، نڈر اور رجیالے ہیں . اُن کے دمکتے روشن چہرے دیکھ کر لگتا
ہے . جیسے یہ دھرتی بڑی مہان ہے ــــ اور ماں جی ، میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ
مل کر محاذ کی طرف گیا تھا ، لیکن ہمیں بہت آگے نہیں جانے دیا گیا . وہ سب پُر اُمید ہیں
اپنی فتح کا مکمل یقین ــــ اور ماں جی نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے تھے . باہر بادلوں
کی سیاہی رات میں مِل گئی ، ہمارے گھر کی ڈھلوان پہ درختوں کی ننھی ننھی جھاڑیاں ہوا
میں جُھک جُھک گئیں اور بارش ، تند بھوار کی مانند کھڑکیوں کے شیشوں پہ پڑتی ہوئی ڈھلوان
پر بہہ رہی تھی .
" ماں جی ، فوجی زندگی میں تو یہ بارش کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اب تو میں بھی
رضا کار ہو گیا ہوں "
تمہیں اگلے محاذ پر تو نہیں جانا پڑے گا ؟ میں نے تمہاری زندگی کی دُعا کرتے ہوئے

پوچھا تھا"

ارے تجمل دادا، حمیرہ آپا ڈر رہی ہیں نا ـــــ سمیعہ کی ہنسی اُس اندھیرے میں گونج اُٹھی

تم اب انہیں زیادہ پیارے ہوگئے ہونا ـــــ

سمیعہ دیدی، دیکھو وہ اتنے پیارے پیارے اِنسان اپنے گھروں سے دُور اس وقت بھی خندقوں کے اندھیروں میں بیٹھے ہیں۔ پھر ہم میں سے کسی کو نہیں ڈرنا چاہیئے ـــ"

اور تم نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور ہم سب جو وہاں بیٹھے تھے، اتنے خوش نہ تھے۔ جتنی مَیں، کیونکہ تمہارا خلوص اور محبّت سے گرم ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا ـــ خیالوں کا ایک جہان بسائے اُس اندھیرے میں روشن روشن سی بیٹھی تھی۔ دِل کی دنیا میں مگن ـــــ

اور جب تم دروازہ کھول کر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میرا بھی دِل چاہا۔ تمہارے ساتھ اس سیاہی اور بارش میں چلتی چلوں ـــــ چلتی ہی چلوں ـــــ تمہارے قدم پر قدم رکھتے ہوئے ـــــ بھلا اِس اندھیرے میں تمہیں میرے بغیر کون راہ دکھائے گا؟ مَیں نے سوچا تھا۔

کاکا۔ بھلا یہ بھی کوئی جانے کا وقت ہے؟ ماں جی نے تمہیں روکنا چاہا، لیکن تم نے کہا تھا۔ ماں جی، اب تو میں رضاکار ہوں ـــ بھلا ڈر کاہے کا ـــ تمہاری آواز میں مسکراہٹ تھی۔ تجمل دادا کل آکر پوری رپورٹ مجھے دینا نہ بھولنا ـــ سمیعہ نے بارش کی تیز آواز میں چلّا کر کہا اور پھر ہمارے گھر کی ڈھلوان سڑک پہ چلتے ہی گئے اور میں دروازے کے اندھیرے میں کھڑی اپنے اندر کی روشنی کے باوجود، اندھیری ہوگئی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دِل بے طرح دھڑکا تھا۔

مون سون کی تند ہوائیں۔ سارا دِن چلتی رہیں اور دریا کا بہاؤ بہت تیز ہوگیا۔ بھیگی بھیگی ہوا نے جسم میں تھکاوٹ سی پیدا کر دی۔ میں اپنے اسکول بھی پڑھانے نہ جاتی اور دن کا اکثر وقت اپنے گھر کے لان میں املتاس کے درخت کے نیچے بیٹھی کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتی

رہتی۔ سمیعہ اپنے کلینک سے رات گئے واپس آتی۔ اُسے بہت سے ہسپتالوں میں جانا پڑتا جہاں زخمی فوجی آتے یا کوئی شہری، —— جسے کوئی اَن دیکھا چہرہ زخمی کر دیتا۔ وہ شہری زندگی کی تڑپ میں زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتے جیسے موت کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتے ہوں اور پھر زندگی کی آخری کرن دیکھ کر اور بھی بے چین ہو جاتے۔ سمیعہ اپنی باتوں سے اُن کو اُمید دلاتی، لیکن کبھی کبھار کوئی خوبصورت اِنسان چُپکے سے دم توڑ دیتا اور سمیعہ کہتی۔

"حمیرہ آپا،" وہ اتنا خوبصورت تھا کہ میرا جی چاہتا کہ اُسے کسی جادو سے موت کے پنجوں سے نکال لاؤں، لیکن پھر وہ مر گیا —— حمیرہ آپا، اِس وقت موت بڑی خوفناک حقیقت لگتی ہے، لیکن کیا ہو سکتا ہے؟" —— اور سمیعہ اپنا بیگ میز پر پٹک کر تھکی تھکی سی، کرسی پر بیٹھ جاتی —— اُس کے چہرے کی جوت بُجھ جاتی۔ وہ جو صرف اِنسانوں سے محبت کرتی تھی، سب کچھ جانتے ہوئے بھی غمگین ہو جاتی اور رات گئے تک ڈھیروں اخباروں اور طرح طرح کے رسالوں میں گھری ملکی حالات سمجھنے کی کوشش میں اُلجھتی رہتی۔

کمال ہے بھئی! —— وہ یکایک چلاتی —— دیکھو تو حمیرہ آپا، ہندوستان نے کیسا بیان دیا ہے۔ کوئی اِن سر پھیروں کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ بھئی یہ تو ہمارا اندرونی جھگڑا ہے۔ خود ہی طے ہو جائے گا —— ارے! ہم کوئی اتنے بے وقوف تھوڑے ہیں جو اِن کی باتوں میں آجائیں گے، پھر وہ ناپسندیدہ بیان پر پیچ و تاب کھاتی، اخبار میز پہ زور سے پٹخ کر اُٹھ کھڑی ہوتی اور مجھے لگتا جیسے دور، بہت دُور توپوں کی شدید گولہ باری میں کراہوں اور چیخوں کا سیاہ دبیز دھواں آسمان کی طرف اُٹھ رہا ہو اور آکاش کی نیلاہٹ لالہ گوں ہو گئی ہو تب مجھے تمہارا خیال آجاتا اور میں لیٹے لیٹے انگوٹھی اپنے ہونٹوں تک لے جاتی —— اور پھر بے یقینی اور شک کا سیاہ ناگ کہیں سے آکر مجھے بے چین کر جاتا۔

اُس روز مون سون کی تیز ہوائیں، سائیں سائیں کرتی ہمارے بڑے سے گھر کے چاروں طرف اُڑتی پھر رہی تھیں —— املتاس، کرشنا چوڑا اور یو کلپٹز کے درختوں سے پرے، دریا

کے تیز پانی کی آواز بھی آ رہی تھی ـــــ سارا جہان ایک تیز و تُند آواز میں بدل گیا تھا۔
جیسے ایک جابر طاقت، کوڑے برسا کر پوری کائنات کو ایک عمیق غار کی طرف ہانک رہی ہو کچل دینے کے لیے۔

اُس روز صبح، چچا سمیع الدّین نے آکر کہا۔ بہن جی، حالات سُدھرتے نظر نہیں آتے۔ اندر ہی اندر ایک لاوا ہے جو پک رہا ہے۔ نفرت اور انتقام کا دہکتا الاؤ جو کسی بھی لمحے بھڑک اُٹھے گا ـــــ خدا جانے کیا ہو ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ "

اور ماں جی نے اپنی تسبیح میز پر رکھ کر ساڑی کا پلّو سر پر کھینچ لیا، بے چینی سے کُرسی پہ پہلو بدلا اور بولیں ـــــ بھیّا، کیا ایک اور ہجرت ہمارے مقدر میں لکھی ہے۔ ابھی تو پہلی بربادی کا زخم کبھی کبھار رِستا رہتا ہے لیکن پھر بھی ایک تسلّی تو تھی کہ اب ہمیں دوبارہ ایسی ہجرت نہ کرنی پڑے گی، "پچھلی باتیں بس ایک تلخ یاد تھیں جو دِل کو بے چین کر گئیں ـــــ ماں جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

چچا سمیع الدین نے بے چارگی سے چاروں طرف دیکھا جیسے اُس وقت اُنہیں اپنے وجود کا بھی یقین نہ ہو ـــــ اُن کے چہرے پر لکھا تھا۔ کوئی چیز حقیقت نہیں ـــــ سب فریب ہے ـــــ ان کی آنکھوں میں موت کا خوف تھا ـــــ موت کا خوف ـــــ

اور سمیعہ نے کہا تھا۔ چاچا، بھلا یہ تو بتائیں ہم لوگ جو مغربی پاکستان سے اپنے آپ کو الگ کرنا چاہتے ہیں، الگ سے زندہ بھی رہ سکیں گے یا نہیں۔ آپ دیکھیں پچھلے چند برسوں میں کس قدر تبدیلی آئی ہے۔ کارخانے، ملیں اور پھر وہ شیشے کا گھومنے والا ریستوران۔ ایسا ریستوران تو صرف یورپ ہی میں ہے نا ـــــ یہاں یہ سب چیزیں پہلے کہاں تھیں؟

چاچا، آپ اندازہ تو کریں، سوچیں تو ـــــ

"میری بیٹی، لیکن تم غربت بھی تو دیکھ رہی ہو ـــــ"

پر چچا، اس میں مغربی پاکستان والوں کا کیا قصور؟ یہ طوفان جو آتے ہیں اور سب کچھ

اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں اور پھر یہاں کے لوگ محنت بھی تو نہیں کرتے ـــ وہ اپنی تمام بے چارگی کا الزام قدرت پر دھر کر چُپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں. جیسے قدرت کوئی ظالم حکمران ہے اور وہ مظلوم "ـــ میں نے اپنے اندر کی سوچ، چچا کے سامنے ظاہر کر دی، حالانکہ میں جانتی تھی وہ کس قدر پکے مجیب کے حامی ہیں ـــ ایک متعصب بنگالی لیکن ہم تو بچپن سے اُن کو چچا کہتے آئے تھے اور ہمارے ذہن انہیں کسی اور رُوپ میں قبول نہیں کر سکتے تھے.

چاچا سمیع، آپ تو حقیقت نہ چھپایئے ـــ بتایئے اِس حکومت نے کیا نہیں کیا؟ سات کروڑ انسانوں کو گندم دی ـــ" سمیعہ، اُن کے چہرے پر آئی سختی دیکھ کر چُپ ہو گئی تھی.

تم ان پنجابیوں کو نہیں جانتیں. میری بیٹی، یہ ہمارا حق غصب کرتے آئے ہیں ـــ مغربی پاکستان میں دولت کے دریا بہتے ہیں اور اب یہ ٹکا خان ہم پہ سوچ کی ساری راہیں بھی بند کرنا چاہتا ہے. بھلا سوچ پہ بھی کوئی پہرہ بٹھا سکا ہے،" چاچا زیرِ لب مُسکرائے تھے اور میں نے کہا تھا.

"چاچا، سوچ غلط راہ پر بھی تو جا سکتی ہے. دوسروں کے غلط مشوروں پہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنا بھلا کہاں کی عقل مندی ہے"؟

چاچا نے غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: سوچ کی کھڑکی کھول کر رکھو، دوست دشمن کو پہچانو ـــ اُن لاکھوں افراد کو تم کس طرح غلط کہہ سکتی ہو جو نئی راہ پہ چل پڑے ہیں. اب انہیں کوئی بندوق نہیں روک سکتی ـــ بظاہر سکون کا یہ لمحہ بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے ـــ وہ پھر مسکرائے اور مجھے ان کی مسکراہٹ اُس مکار لومڑی کی طرح لگی جو اپنے شکار کو گھات لگا کر پکڑنے والی ہو ـــ میرا دل کانپ گیا اور چاچا چلے گئے. سب طرف اندھیرا سا لگ رہا تھا. ناامیدی کا، مایوسی کا، بے چارگی کا ـــ ڈھلوان سے

پرے، ناریل کے درختوں کی چوٹیوں پر گہرے سیاہ بادل جھک آتے تھے اور دریائے کرنافلی کا شوریدہ سر پانی ہوا کی تیزی کے ساتھ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔

ہاں، اِس دریا کے بہت آگے، گھنے درختوں کے درمیان، خندقوں میں ایک چہرہ پُرسکون انداز سے بادلوں میں سے آسمان کو تک رہا ہوگا۔ خدا کرے وہ ہمیشہ سلامت رہے۔ میں نے دِل ہی دِل میں دُعا مانگی تھی۔ ہو سکتا ہے بہت ساری گمبھیر اور گھبرا دینے والی باتوں کے درمیان اُسے میری بھی یاد آتی ہو، ہو سکتا ہے مجھے یاد کر کے مسکرا دیا ہو —— میں نے ناریل کے اونچے درخت دیکھ کر بوجھل دِل ہلکا کرنے کے لئے سوچا تھا۔

دریا کے اُوپر سے بہتی نمی سے بوجھل ہوا میرے بال بکھیر رہی تھی اور میرے گھر کے لان میں املتاس کا درخت کسی بیوہ کی طرح اُجڑ گیا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں سفید بادلوں کے اندر سے، فضا کو چیرتی، زمین کی گیلی سطح روشن کر رہی تھیں۔ دُھلی دُھلی اور چمکیلی کرنیں جو سبزے کے اندر میں اُتر رہی تھیں، میرے دِل میں سوچوں کی ہزاروں راہیں بنا رہی تھیں۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے، تھوڑی ہی دور فوجیوں کی بیرک سے ریڈیو پہ تیز تیز گیتوں کی لے ہوا کے ہلکوروں پہ اڑتی ڈول رہی تھی اور مردانہ قہقہوں کا جاندار جلترنگ سب طرف بکھر رہا تھا۔

دنیا میں مرد نہ ہوتے تو —— مجھے اُس وقت سب کچھ اس قدر اچھا لگ رہا تھا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی تجمّل ہمارے گھر سے گیا تھا اور اِن مردانہ قہقہوں کا جلترنگ مجھے اس کے وجود کا احساس دلا رہا تھا اور میں ڈھلوان پہ بہتی ہوا میں کھڑی اپنے آپ کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ پھر سمیعہ نے ستار پہ ایک دُھن چھیڑ دی۔ ستار کے تاروں کا مرتعش سُریلا جھونکا میرے دل کو چھونے لگا اور میں جو کتھک ناچ کے تمام توڑے جانتی تھی اپنے پاؤں کی تال پہ قابو نہ پا سکی۔ میں تو بس ٹھنڈی ہوا اپنے اندر اُترتی محسوس کرنا اور تمہارے متعلق سوچنا چاہتی تھی۔ تجمّل حسین جو ایک پاکستان کے وجود پہ یقین رکھتے، اپنے

یقیناً میں بے پناہ پختہ اور جواں مرد تھے، لیکن سمیعہ ستار کے سُر بڑھاتی جا رہی تھی اور میری سوچیں اٹک اٹک گئیں۔ حالانکہ میں اپنے گرد پھیلی نفرتوں اور محبتوں کی دھوپ چھاؤں کی اصل حقیقت جاننے کی تگ و دو کر رہی تھی۔

تمہیں نے تو کہا تھا "قوموں کو قربانیوں سے نہیں ڈرنا چاہیئے اور وہ فرد کی کوششوں سے کامیاب ہوتی ہیں۔ انفرادی قربانیاں ہی آسمانوں سے تجلیوں کی بارشیں کرتی ہیں اور پھر یہی کوششیں سورج کی طرح اُبھر کر پوری کائنات روشن کر دیتی ہیں"۔

اور میں نے سوچا تم یقیناً مجھ سے زیادہ عقلمند ہو — ہم سب نے تو اسی سرزمین پر آنکھیں کھولیں، اسی سرزمین پر رینگ رینگ کر چلنا سیکھا۔ اسی دھرتی کے گیت گائے، اِس کے طوفانوں نے ہمارے دل دہلائے اور اس کی مدھر ہواؤں نے ہمیں گیت گانے سکھائے میں نے جب بھی کسی پروگرام میں حصہ لیا اور میرا وجود میرے پاؤں کی تال پر ناچا تو مجھے یوں لگا جیسے سمندر کی گمبھیر خوبصورتی اور ہواؤں کی نرمی مجھ میں مجسم ہو گئی ہو — اور میں ہی تو یہ دھرتی ہوں۔ میرے اندر ہی آکاش بڑھ کر، پھیل کر پوری کائنات پر چھا گیا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ ویسا نہ تھا جیسا میں سوچتی آئی تھی۔ یہاں بھی نفرت کے کانٹے تھے۔

ماں نے ایک روز کہا تھا "کھوکی، دو بہن بھائی بھی تو آپس میں لڑتے ہیں۔ لیکن یہ معمولی لڑائیاں کبھی کسی کو جُدا بھی کر سکی ہیں؟ تم تو پگلی ہو اور انتہا پسند بھی یہ دھرتی ہمارا دیس ہے ہم نے اسے خون دے کر شاداب کیا ہے"۔

"پر ماں"، لڑکیاں مجھے بہاری ہونے کا طعنہ دیتی ہیں۔ کیا بہاری ہونا بہت ہی بُرا ہے۔ ماں؟ —— اور تم تو کہتی تھیں ہمارے بابا نے پاکستان کے لئے جان دی تھی —— تم نے اس وطن کے لئے اپنا بھرا پُرا گھر لُٹایا تھا۔ پھر یہ اجنبی پن کا احساس کیوں ہے؟ ماں —

اور ماں نے بڑے اعتماد سے کہا تھا: بیٹا، زمین کی محبت بڑی انوکھی ہوتی ہے یہ خون کے ساتھ رگوں میں گردش کرتی ہے۔ یہاں کے لوگ اس پر اپنا زیادہ حق سمجھتے ہیں، تو پھر

گیا ہے؟ ہم بھی تو اُس سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے تو کیا ہوا؟" —— اور ماں جو برسوں پہلے آزادی کے پُل صراط کو پار کر کے آئی تھی، سوچ میں گُم، کسی کام کو اُٹھ گئی اور میں جو اس روز کالج میں ایک جھگڑے میں، نہ چاہنے کے باوجود اُلجھ گئی تھی۔ انتہائی غمگینی سے لان میں بیٹھی اپنا خوبصورت گھر دیکھتی رہی۔ اُس روز پہلی بار احساس ہوا کبھی کبھی بڑی بڑی قربانیاں بھی رائیگاں جاتی ہیں۔ ماں اور بابا نے جو سفر کیا تھا۔ اُس کی منزل ابھی نہیں آئی۔ منزلیں بھی شاید سفر کرتی ہیں۔

اور سمیعہ نے کہا تھا "حمی آپا، ناحق جذباتی نہ بنا کرو —— ہم سب پاکستانی ہیں کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہو —— لڑائی میں ہمیشہ طعنے ہی دیئے جاتے ہیں۔ کون ایسی باتیں دل کو لگائے"

سمیعہ —— یہ دھرتی جس کے لئے ماں وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئیں۔ اب بھی ہماری نہیں۔ میں نے یہی محسوس کیا میری اجنبی وطنیت کا طعنہ مجھے مضمحل کر گیا تھا۔

"آپا، دل میں وُسعت پیدا کرو، کیسی معمولی بات جی کو لگا بیٹھی ہو" سمیعہ غصّے سے بولی ——

اور یہ معمولی بات اُس روز بہت ہی معمولی لگی جب تجمّل حسین نے رضاکار کور میں اپنا نام لکھوا دیا اور ٹریننگ کے لئے چلا گیا تھا —— زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور میں آج خوش ہوں اِس بے پناہ گھُور اندھیارے میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ ہوں جو روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں" تجمّل حسین نے بڑے یقین اور وثوق کے ساتھ اپنی بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کہا تھا —— حمیرہ، روشنی بھی تو سفر کرتی ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ"

دریائے کرنافلی کا شور دور سے سنائی دے رہا تھا اور میں تجمّل حسین کے ساتھ دور تک چلی آئی۔ انجانے وسوسوں اور اندیشوں میں گھری، مجھے اُس کے ساتھ چلنا کس قدر بھلا لگ رہا تھا۔

تجمّل حسین، میں اور تم دونوں بہاری ہیں اور یہ مُلک بنگالیوں کا ہے۔ کیا تم غلط مقصد کے لئے لڑنے تو نہیں جا رہے؟" میں ایک بار پھر شک میں گھر گئی تھی۔

تم سے یہ کس نے کہا ہے یہ وطن ہمارا نہیں؟" تجمّل حسین ایک دم رُک گیا "تم ایسی غلط بات سوچتی ہی کیوں ہو؟" اُس کی آواز میں غصّہ اور دُکھ تھا۔

بہت سے بنگالی ایسا سوچتے ہیں ــــ اور تم جانتے ہو میں چپ رہ کر لوگوں کے چہرے پڑھتی ہوں، اس لیے بہت کچھ جان جاتی ہوں ــــ میں اپنی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

دریائے کرنافلی کے کنارے، گھنے درختوں کی چوٹیوں پر بادل جُھکے ہوئے تھے اور میرے سامنے دریا بہہ رہا تھا اور میں جو تجمّل حسین کی رفاقت میں خوش تھی، ایک دم اُداس ہو گئی۔ وقت کی کوکھ سے نہ جانے واقعات کے کون سے عفریت جنم لیں جو ہمیں نگل جائیں ــــ اور تجمّل حسین کی تلاش ادھوری نہ رہ جائے۔

ایسی باتیں کرنے والے بنگالی تو ہو سکتے ہیں پاکستانی نہیں ــــ اور ہم ایسے لوگوں کی تلاش میں ہی تو ہیں جو یہ زہر پھیلا رہے ہیں" تجمّل حسین ہمیشہ کی طرح یقین سے بات کر رہا تھا اور پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، کچھ فاصلے پر کھدی خندق میں غائب ہو گیا اور میں نمی سے بوجھل ہوا میں جُھکتے ناریل کے طویل قامت درخت دیکھتی رہی۔ دریا، زندگی کی علامت بنا، بہہ رہا تھا بہتا ہی جا رہا تھا۔

مجھے کسی بات پر بھی یقین نہ آئے، تو کوئی بات نہیں، لیکن مجھے تجمّل حسین اور اُس کی باتوں پر تو اندھا وشواس ہے،، میں نے دریا کے کنارے، گھاس پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ گھاس جو ٹھنڈی تھی، زندگی کے خوبصورت تصوّر کی مانند۔

بھاری قدموں کی آواز، رات کے سناٹے میں گونجتی جا رہی تھی اور اِن بھاری قدموں کا ارتعاشں، زمین کے ذرّوں سے مربوط ہو کر ہمارے گھر کے دروازے پہ رُک گیا ــــ کون ہو سکتا ہے؟ ہم سب دِن کے ہنگاموں سے تھکے ہوئے تھے اور ہمارے گھر کا

اکلوتا مرد، میرا بھانجا مُراد بھی اپنی بیمار ماں کی خبر لینے ہسپتال چلا گیا تھا۔

کون ہو سکتا ہے؟ ہم تین عورتیں ہیں، ماں اور سمیعہ، رات کی سیاہی میں لرزاں، بند دروازے کے پاس کھڑے تھے ـــــ دروازے کی دستک کہیں دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی، کھڑکیوں پر سیاہ کاغذوں کی سیاہی تھی۔

موسی، دروازہ کھولو ـــــ ارے! یہ آواز تو تجمّل حسین کی ہے۔ میں نے دوسرے لمحے دروازہ کھول دیا۔ باہر رات کا قہرماں سناٹا تھا اور سیاہی کے عظیم سمندر میں وہ چپ چاپ ایک جسم، اپنے بازوؤں میں اُٹھائے کھڑے تھے۔ پھر اُن کے قدموں کی آواز ہمارے گھر کے بڑے کمرے میں آکر رُک گئی۔

"سمیعہ دیدی، دیکھو شاید اس میں ابھی جان باقی ہے" تجمّل حسین کی آواز آنسوؤں سے رُندھی ہوئی تھی۔

ماں نے اپنی سفید ساڑی کے پلّو میں چھپا کر ننھی سی ٹارچ جلائی اور سمیعہ نے ڈاکٹری کا بکس کھول کر ٹیکہ سرنج میں بھر لیا تھا ـــــ شاید زندگی کی چھوٹی سی چنگاری ابھی باقی ہو۔ شاید ان روشن چہرے والوں کی ہمّت، موت سے بھی مات نہ کھائے ـــــ شاید ـــــ

تجمّل حسین نے میری طرف دیکھا تک نہیں اس کے چہرے پر گرد اور نمی کی تہہ جمی تھی اور وردی گرد سے اَٹی ہوئی اور اُس کے بوٹوں پر کیچڑ تھا ـــــ وہ سب ایسے ہی تھے اور وہ جسم جو موت اور زندگی سے لڑ رہا تھا۔ سرنج کی دوائی اُس کے بازوؤں پہ بہہ کر باہر گر رہی تھی ـــــ میں نے اُس ننھی سی زرد روشنی میں وہ چہرہ دیکھ لیا۔ وہ خوبصورت، روشن اور ساکت تھا اور ابدی زندگی لیے نئے سفر پر چل پڑا تھا ـــــ تلاش ـــــ تلاش ـــــ ابدی خوشی کی، ابدی زندگی کی۔

سمیعہ کھڑی ہو گئی اور اس نے تجمّل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "کاکا شاید یہاں پہنچنے میں تمہیں دیر ہو گئی!

"ہاں، سمیعہ دیدی، وقت جب کھو جاتا ہے، تو اُسے حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے، ہمیں اپنوں کے گھاؤ بھی کھانے پڑتے ہیں۔ ماں نے ٹارچ کا ننھا سا شعلہ ساڑی کے پلّو میں چھپا کر وہ چہرہ روشن کیا۔ لیکن اُس کے لب، نامعلوم مسکراہٹ اپنے اندر سمیٹے چُپ چُپ تھے — ماں نے ٹارچ بجھادی اور جُھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ہم سب چُپ تھے اور رات کا سناٹا، سیاہی کے ساتھ مل کر ہمارے چاروں طرف بہہ رہا تھا۔ ماں کی ہچکیاں سائیں سائیں کرتی ہوا میں ڈوب رہی تھیں۔ ہماری آس کی طرح "موسی، روشنی کی تلاش کا سفر بڑا لمبا اور کٹھن ہوتا ہے،" تجمّل حسین، مدھم آواز میں کہہ رہا تھا — لیکن ہمیں یہ سفر طے کرنا ہی پڑے گا،" انہوں نے اُس ساکت وجود کو اٹھانے سے پہلے سلیوٹ کیا اور پھر اُسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے سائیں سائیں کرتی ہوا میں باہر نکل گئے۔ بڑے دروازے پر ہم تینوں عورتیں کھڑی اُنہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ وہ اندھیرے میں غائب ہوتے جارہے تھے اور پھر صرف سائیں — سائیں کی آواز کے باوجود ایک گہرا اور ڈراؤنا سناٹا، آسمان سے زمین تک چھا گیا تھا۔

تجمّل حسین، روشنی کا سفر کتنا کٹھن ہوتا ہے، خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے!" میں نے اندھیرے میں کھڑے کھڑے، بہتے آنسو اپنے پلّو میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

تب زور کی بجلی چمکی اور سیاہ بادلوں کے نیچے ہمارے گھر کی ڈھلوان اداس اور اُجڑی اُجڑی سی لگ رہی تھی — بہاروں کو کیا ہوا؟ بہاریں کب آئیں گی؟ نہ جانے مجھے کتنے زمانوں انتظار کرنا پڑے۔

میں بہاروں کا انتظار کروں گی — میں اُس وقت کا انتظار کروں گی۔ جب تجمّل حسین تم ایک روز مجھے لینے آؤ گے اور میں اپنے ماتھے پر کُم کُم کی بندیا لگائے رنگین ساڑی کا پلّو سر پر سجائے، تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلی جاؤں گی۔

گولوں کی گرج اور گولیوں کی تڑ تڑ — ایک ساتھ اُٹھتے قدموں کی گونج اور ڈراؤنا

سناٹا ـــ ہمارے گھر کے پچھواڑے فوجیوں کی بیرکیں خاموش رہنے لگیں۔ وہ سب مستعدی سے دُشمن کی گھات میں تھے۔ ایک عظیم مقصد نے انہیں فولادی قوت عطا کر دی تھی۔ ماں ان کے ادھڑے کپڑوں کی مرمت کرتی رہتی اور اُن کی زندگی کی ہر وقت دُعا مانگتی اور تحمل حسین کے دوست آکر پوچھتے ـــ

ماں جی، کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں کہیے۔ ہم آپ کی خدمت کے لئے ہی تو یہاں آئے ہیں" ـــ

اور ماں اُن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی "نہیں بیٹے، مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی؟ مجھ بوڑھی عورت کو تمہاری زندگیوں کے سوا اور چیز کی بھلا کیوں خواہش ہونے لگی؟"

ماں کے بوڑھے چہرے پر روشنی سی چھا جاتی ـــ

پھر ہم سب باہر لان میں بیٹھ جاتے اور ماں ہَولے ہَولے قدموں چلتی اُن کی خاطر کرنے کے لئے کبھی چائے لاتی اور کبھی پانی ـــ وہ اپنے کمزور سے وجود میں کس قدر طاقت ور لگتی تھی ـــ تجمل حسین اُس تھوڑے سے وقت میں ڈھیروں باتیں کرتا ـــ اور سمیعہ اُن سب کو سیاست میں اُلجھاتے رکھتی ـــ اور پھر وہ چلے جاتے ـــ اور اُن کے جانے کے بعد ماں، ہیرنگ ایڈ آلہ کانوں سے اُتار کر گود میں رکھتے ہوئے کہتی۔

"ارے، اتنے جیالے اور بہادر انسانوں کو شکست نہیں دی جا سکتی"،

اور سمیعہ کہتی "کون سی شکست کی بات کر رہی ہو؟ ماں۔ بھلا ہمارے فوجی شکست کیوں مانیں گے ـــ شکست کا لفظ میرے ذہن میں کبھی آیا ہی نہیں"۔

لیکن اُس روز ہم نے جانا شکست کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ جب چچا سمیع کے بیٹے حارث نے ماں سے آکر کہا ـــ

" موسی، ہم نے سُنا ہے پاکستانی فوجی تم لوگوں کے گھر آتے ہیں۔ یہ کچھ اچھا نہیں۔

وہ ہمارے دشمن ہیں ـــــ کتنی باہمنی والے تم لوگوں پر شک کرتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت وہ کیا کر گزریں، میں تو بس اطلاع دینے آیا ہوں ـــــ اُس کی آنکھوں میں عجیب روکھا پن اور بیگانگی تھی۔ بے یقینی کا یہ سیاہ ناگ ہماری جنّت میں کیوں گھس آیا"، میں نے حارث کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا ـــــ

ماں نے اضطراری طور پر اپنا آلہ کانوں سے ہٹا دیا تھا۔ شاید وہ بھی بدلتے وقت کی یہ آواز سُننا نہیں تھی ـــــ حارث کمرے کے درمیان کھڑا کھوجتی کھوجتی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھو حارث بیٹے، بیٹھو ـــــ"، ماں نڈھال سی ہو کر کرسی میں ڈھیر ہو گئی۔ بیٹے، وہ لوگ تو ہماری حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ وہ کوئی غیر تو نہیں ـــــ ماں کی آواز میں لرزش تھی۔ شاید وہ بات کرتے ڈر رہی تھی ـــــ

"پر موسی، ہماری اِن کی جنگ ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں، یہ بنگال ہے اور وہ مغربی پاکستان سے آئے ہیں"، حارث کی آواز میں طنز اور دھمکی تھی۔

"پر بیٹے ـــــ"، ماں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن تجمّل حسین کے قدموں کی تیز آواز ہمارے پیچھے آ کر رُک گئی ـــــ

حارث نے ٹیڑھی نظروں سے اُسے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "تجمّل دادا، آپ بھی رضا کار بن گئے ـــ بہت خوب ـــــ تجمّل حسین کے چہرے پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی تھی اور اُس کا چہرہ تیز تیز چلنے سے سُرخ ہو رہا تھا

"حارث سمیع، اِنسان کو اپنے اندر سے اُٹھتی آوازوں پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟ میں تمہیں بھی کہوں گا سچائی کو پہچانو ـــــ ہو سکتا ہے بعد میں جب سچائی کا عرفان حاصل ہو، تو تمہارے پاس وقت ہو نہ زندگی"،

حارث نے طنز آمیز لہجے میں کہا ـــــ تمہاری سچائی سے ہماری سچائی نیا وہ ہوں! ـــــ

طاقت ور ہے۔ تم دھارے کا رُخ موڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایسے میں کون پار لگا ہے بھلا، تجمّل دادا ——

"حارث سمیع، سوچ لو —— سچائی کو پہچاننا بظاہر آسان لگتا ہے، لیکن اتنا آسان ہے نہیں"

دیکھا جائے گا دادا —— تمہاری سوچوں اور ہماری سوچوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ دھرتی ہماری ہے۔ ہم اِس سے جس طور محبت کرتے ہیں، تم نہیں کر سکتے" اور حارث ایک دم دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ہم سب وہاں کتنی دیر چُپ چاپ بیٹھے رہے —تجمّل حسین نے کرُسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے بُوٹوں کی گرد جھاڑی اور آنکھیں بند کر کے پُشت سے سر ٹکا دیا۔

ماں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو آزادی کے پُل صراط پر کھڑا پایا ہوگا۔ میں نے بھی اپنا دِل ڈوبتا ہوا محسوس کیا، لیکن اِس بار ماں اکیلی نہ تھی۔ مَیں اور بہت سے لوگ اُس کے ساتھ کھڑے تھے "تجمّل حسین، تم بھی تو ایک سچائی پر یقین رکھتے ہو، پھر اتنے مضمحل کیوں ہو؟" میں نے اُس کی بند آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

نہیں، میں مضمحل نہیں —— صرف اُن لوگوں کی عقل پر ماتم کُناں ہوں جو پہچان کی صلاحیت نہیں رکھتے ——" اُس نے ماتھے پر آئے ہوئے بال پیچھے ہٹا کر بند آنکھوں ہی سے کہا تھا۔

شاید وہ حالات کی تلخیوں سے آنکھیں چُرا رہا تھا —— شاید اُسے اپنے مقصد کی سچائی چھوٹی نظر آتی ہے —— ایسا تو نہیں ہو سکتا —— میرے سامنے پھیلی زمین سرسبز تھی اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر درختوں کی چھاؤں تلے سبزہ سویا سویا لگ رہا تھا —— اور ہمارے دِلوں میں زندگی کی تیز دھڑکن رُکتی محسوس ہوئی۔

موسی، حالات کا بہاؤ بظاہر ساکن ہے —— ہمارے سپاہی چوکنّے اور بہادر ہیں،

پر موسی، جب پُشت پر اپنوں ہی کی گولی لگے، تو دِل کا گھاؤ اور جسم کا گھاؤ بہت تکلیف دہ اور گہرا ہو جاتا ہے،،

تجمّل کاکا، خدا تم سب کو اپنی پناہ اور امان میں رکھے ــ،، ماں نے جُھک کر تجمّل کا سر پیار سے چوم لیا اور صحن کی طرف مڑ گئی۔ اُسے ابھی میجر امان کی پھٹی وردی کو ٹانکا لگانا تھا ــــ

تم اتنے چُپ کیوں ہو؟ تجمّل حُسین ــــ،، میں اُس کے روشن چہرے پر کچھ تلاش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ــــ

سُنو حمیرہ، میں تم سے بہت خوبصورت باتیں نہیں کر سکتا ــــ ہو سکتا ہے وقت کی کوئی ان دیکھی گھڑی، حیات کا کوئی آنے والا لمحہ مجھے تم سے الگ کر دے، تو رونا نہیں، کیونکہ ہم اُن بہت سارے لوگوں کی قسمت سے کیونکر بچ سکتے ہیں جو ہمارے اردگرد ہیں"

تجمّل حُسین، رونا کس بات کا؟ بہاؤ سے الگ ہونے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ پھر کیوں نہ سب کے ساتھ مل کر بہا جائے،، میں تسلّی بھرے لہجے میں بولی۔ پھر آسمان پر جھیر جھیر بادلوں کی اوٹ سے ایک مدقوق اور غمزدہ چاند، جھانکنے لگا ــــ اور میرے دِل کے اندر کی کوئی چیز ٹوٹنے پھوٹنے لگی ــــ پھر بھی اُمید کی جا سکتی ہے ــــ پھر بھی آنے والے وقت کے اندھیرے میں جھانکا جا سکتا ہے ــــ میں سوچنا چاہتی تھی، لیکن دور کہیں گولیاں چلنے کی آواز ہَوا کے دوش پر ہم تک پہنچ رہی تھی۔

تجمّل حسین ایک دَم کھڑا ہو گیا ــــ سمیعہ دیدی، کیا تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے؟" اُس نے دروازے میں کھڑی سمیعہ کو دیکھ کر پُوچھا ــــ اب مجھے چلنا چاہیئے "

اور وہ موہوم دھبّے کی مانند پگڈنڈیوں کے سُونے پَن میں تحلیل ہو گیا ــــ اور میں ہمیشہ کی طرح اُس سبز ڈھلوان کی سیاہی کو دیر تک گھورتی رہی ــــ

زندگی اس قدر بوجھل اور ویران نہیں ہو سکتی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں مجھے اُن جھیر جھیر بادلوں کی اوٹ سے چاند بھی نظر نہ آسکا۔

میں نے اپنا بوجھل سر دونوں ہاتھوں میں زور سے دبالیا ـــــ تیز درد کی لہریں ایک کے بعد ایک اُٹھ رہی تھیں ـــــ نہیں، یہ درد میرے سارے وجود کو پیس رہا ہے ـــــ میرے دِل میں اور میرے پُورے وجود میں ہے۔ میں نے کھڑکی کے کھُلے پٹ سے باہر دیکھا۔ آسمان کے پیالے کے درمیان بادل گھنے اور سیاہ تھے اور سورج کی کرنیں اُن بادلوں کے کناروں سے نکل کر زمین کو منوّر کر رہی تھیں ـــــ روشن اور جاندار کرنیں ـــــ زندگی بخش، زندگی کہاں تھی؟ زندگی کدھر تھی؟ ـــــ مجھے تجمّل حسین کی آنکھوں کی مجروح سی کیفیت یاد آرہی تھی۔ وہ سب کچھ مِٹ گیا جس پر یقین کیا جاسکتا تھا ـــــ تجمّل حسین نے مکتی باہنی کے غنڈوں کے ساتھ جاتے ہوئے کہا تھا: "سمیعہ دیدی، جسم زخمی ہو تو اُس پر صرف مرہم لگایا جاسکتا ہے لیکن جب رُوح زخمی ہو جائے تو خون مانگتی ہے ـــــ" اور وہ ہنس دیا تھا ـــــ ہوسکتا ہے وہ خوفزدہ ہو ـــــ ہوسکتا ہے چلتے ہوئے اُس کے قدم ڈگمگا جائیں ـــــ ہوسکتا ہے وہ اِن ظالم اِنسانوں کے پنجے سے رہائی پالے ـــــ میں دِل کے ویرانے میں تنہا اور یخ بستہ کھڑی تھی۔ اُس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ جب دل دُکھتا ہے، تو درد کتنا جان لیوا ہوتا ہے ـــــ ہماری طاقت اور برداشت سے باہر۔

حارث سمیع نے اپنے ساتھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "ہمیں نہ جانے کتنے دشمن ڈھونڈنے پڑیں گے، لیکن شکار بُرا نہیں" ـــــ ماں سفید ساڑی کا پلو پکڑے دروازے میں کھڑی تھی ـــــ ہیرنگ ایڈ آلہ اُس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ خوف کے اِس مرحلے پر وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی، بس کھڑی کھڑی کانپ رہی تھی۔ حارث نے جاتے جاتے کہا تھا "موسی، بُرا نہ ماننا ـــــ میں مجبور ہُوں ـــــ زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور یہ جنگ ہماری بقا کی جنگ ہے ـــــ وہ خوشی سے ہنس رہا تھا۔

ماں کچھ نہ بولی ـــــ اس نے تجمّل حسین کے کندھوں پر اپنے بوڑھے ہاتھ رکھ دیئے اور

اُس کے ہونٹ کپکپا کر ساکت ہو گئے تھے ۔ اُس نے اس کا سر جھکا کر اس کی پیشانی پہ ٹھنڈا سا بوسہ دیا ــــ اور راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی ــــ

مکتی باہنی والے ہمارے گھر کی تلاشی لے رہے تھے ــــ اندر چیزوں کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں ــــ مُراد، میں اور ماں چُپ چاپ کھڑے تھے ۔ باہر ہوا شور مچاتی رہی ــــ اور لان میں املتاس کے پیلے پھُول، زمین پہ ڈھیر ہوتے رہے ۔ شاید خزاں دبے قدموں بڑھ رہی تھی

تجمّل حسین کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر رہے تھے ۔ اُس نے اپنے ہونٹ تر کرنے کے لئے اُن پر زبان پھیری اور دُور خلا میں دیکھنے لگا ــــ

اچھا حمیرہ آپا، خدا حافظ! ہم تھوڑا سا پوچھ تاچھ کر تجمّل حسین کو بھیج دیں گے ــــ "، اُس کی آنکھوں کی مکّاری اور طنز یہ ہنسی ٹھنڈک کی لہر بن کر میرا اُوپرا جسم سُن کر گئی ــــ مراد بولنے لگا، تو ماں نے اُس کو اپنی طرف کھینچ لیا ۔ اُس کے سانولے چہرے کی رگیں تن گئی تھیں ۔

مُراد میاں، زندگی میں کسی ایک سچائی کے لئے بعض اوقات انسان کو بھاری قربانی دینی پڑتی ہے ۔ تجمّل حسین نے اُسے دیکھ کر کہا تھا " جب ہم زندگی کسی مقصد سے وابستہ کر دیتے ہیں تو موت کا خوف بے ضرر سا لگتا ہے ۔ روشنی کا یہ سفر ہماری سچائی اور واضح کر دے گا میری بات سمجھتے ہو مُراد ؟"

تجمّل دادا، میں سمجھتا ہوں ــــ " مراد نے بمشکل اپنے خشک ہونٹوں سے فقرہ ادا کیا تھا اور جب تجمّل حسین اُن لوگوں کے نرغے میں گھرا، دروازے سے باہر نکل رہا تھا، تو اُس نے مُڑ کر مجھے دیکھا اور مُسکرا دیا ۔

تجمّل حسین، ہم شاید ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ چکے ہیں ــــ میں نے دِل ہی دل میں کہا ــــ تمہارے دِل کی ساری باتیں مجھ تک پہنچ گئی ہیں " میں بے جان قدموں سے کھڑی تھی اور پھر اُس ڈھلوان پر اُن کے قدموں کی چاپ دُور ہوتی چلی گئی ــــ

کچھ لمحوں بعد گولی کی تیز آواز ہوا کے دوش پہ اُڑتی میرے کانوں سے ٹکرائی ۔ اور میں

سوچ رہی تھی زندگی کے سب سے بڑے المیے پر بڑی ہمت کا مظاہرہ کروں گی اور اپنے دِل میں اُٹھتے درد کو اَن سُنا کر دُوں گی، لیکن گولی کی آواز سُنتے ہی میں بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مُراد میرے پیچھے دوڑا ـــــ وہ تجمل حُسین کے جسم کو گھسیٹتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے ـــ پھر مُراد نے میرا گرتا ہوا جسم اپنے بازوؤں میں تھام لیا ـــ میں جو ایک روشن دِن کی آس لگائے بیٹھی تھی، اندھیروں کے درمیان گم ہو گئی ـــــ اور اُس کے بعد خوشیوں کے تمام راستے مِٹ گئے ـــــ میں کون سی راہ تلاش کروں؟ راہ کہیں بھی تو نہیں ـــــ

سنگِ زیست

مصنّفہ کی دیگر کتب

۱۔ درد کی رُت (۱۹۷۵ء) ناول

۲۔ ریت کی دیوار (۱۹۷۸ء) افسانے

۳۔ سنگِ زیست (پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء) افسانے

۴۔ اور وہ کالی ہوگئی (۱۹۸۷ء) افسانے

۵۔ کیمرج او کیمرج (۱۹۹۰ء) سفرنامہ

۶۔ ردّی کاغذ کا ٹکڑا (۱۹۹۰ء) افسانے

۷۔ سیّاہ برف (۱۹۹۰ء) ناول

۸۔ سائے کی دھوپ (۱۹۹۵ء) ناول

۹۔ زندگی کی بند گلی (۱۹۹۵ء) افسانے

۱۰۔ ایک تاثر دو شخصیتیں (تاریخِ پاکستان کے حوالے سے)

Office # 6, Block # 7
Mian Chamber,
3 Temple Road Lahore
+92 333 4344716
+92 423 6280034